اردو کے مختصر افسانے

پروفیسر صغیر افراہیم

اردو کے مختصر افسانے

پروفیسر صغیر افراہیم

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ
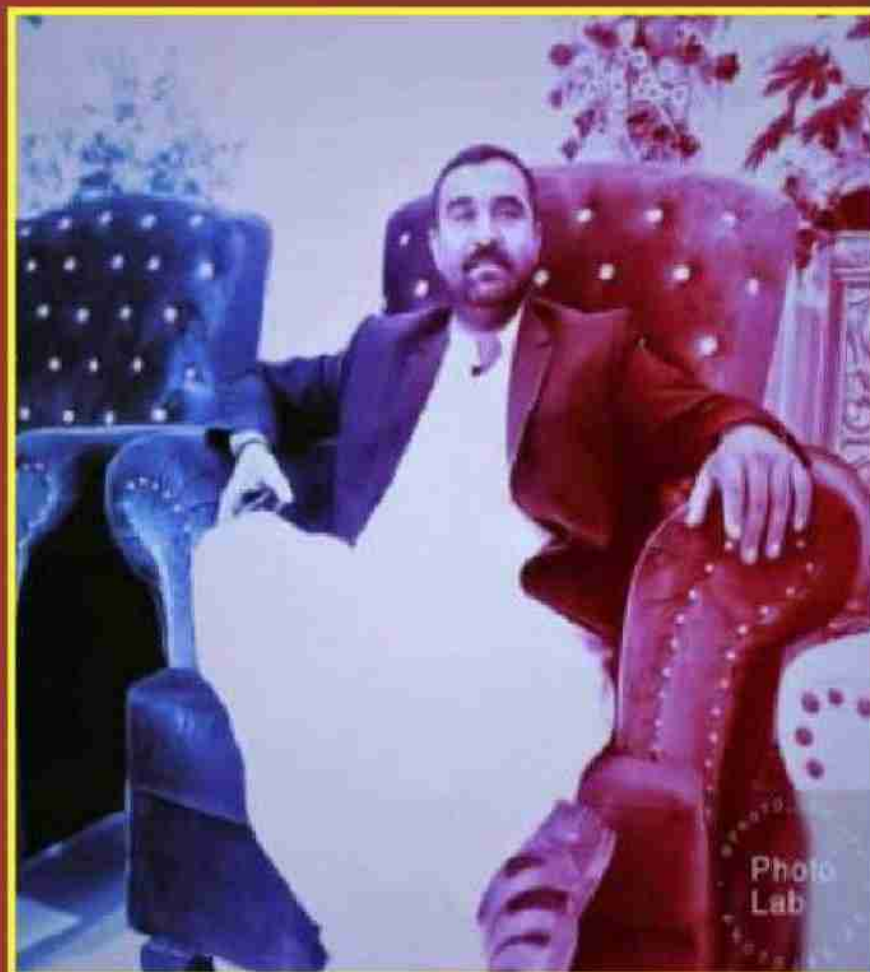
URDU KE MUKHTASAR AFSANEY

Edited By

Prof. Saghir Afraheim

Published By

Educational Book House

Muslim University Market

ALIGARH.202002 (INDIA)

FIRST EDITION -------------------2014

PRICE --------------------------Rs.150/-

پہلا ایڈیشن.................................2014

قیمت..150/-

مطبع..............ایم۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

ISBN-978-93-83549-51-1

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002

انتساب

اُن معمارانِ فکشن کے نام

جن کے افسانے

اس

انتخاب

میں شامل ہیں

طویل افسانوں کا انتخاب بھی جلد ہی قارئین کے روبرو ہوگا۔

فہرست

مقدمہ

ادب فکر و اظہار کے تحریری ادغام کی عملی صورت کا نام ہے، مگر چونکہ فکر و اظہار کا انضمام غیر ادبی تحریروں میں بھی نمایاں رہتا ہے، اس لیے یہ اضافہ ضروری ہے کہ یہاں فکر و اظہار کا تخلیقی ہونا لازمی شرط ہے۔ فی الوقت نہ اس کا موقع ہے نہ ضرورت کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی جہات پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ لہٰذا بطور حرفِ ربط عرض ہے کہ افسانہ اسی فکر و اظہار کا ایک اہم ترین تخلیقی پیرایہ ہے جس کی جڑیں اردو اور دیگر زبانوں کے ادبیات میں زمانۂ قدیم سے موجود ہیں، بالخصوص اردو زبان کے ابتدائی افسانوی سرمایہ کو اگر ذہن میں تازہ کیا جائے، تو احساس ہوگا کہ صرف داستانیں ہی نہیں بلکہ ہمارے پورے جنوب مشرقی ایشیا کے افسانوی ورثے میں حکایت، کتھا اور جاتک کتھاؤں و دیومالاؤں کا جو طویل سلسلہ موجود ہے، وہ اسی مضبوط بنیاد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اردو افسانہ اسی لازوال ادبی سرمایہ کا وارث ہے اور عہد کی تبدیلی کے ساتھ اس کے رنگ و روپ میں جتنا بھی بدلاؤ آیا ہو مگر اس کی بنیاد میں وہی قصہ کہانی (Story) موجود ہے جو آج بھی تخلیقی بیان کا سب سے طاقتور میڈیم تسلیم کیا جا رہا ہے۔

اردو فکشن میں افسانہ شارٹ اسٹوری (Short Story) کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کے آغاز میں مغرب کے زیرِ اثر، انگریزی کے وسیلے سے ہمارے ادب میں داخل ہوا ہے، لیکن روزِ اول سے ہندوستانی رنگ و روپ میں رچ بس کر مقامی مزاج سے اس طرح ہم آہنگ ہوگیا ہے کہ اسے درآمد شدہ ادبی صنف نہیں کہا جا سکتا ہے تاہم افسانے کی ہیئت مغربی ہے اور فن کا اکتساب بھی مغرب سے کیا گیا ہے مگر اس کی دیگر صفات کا سلسلہ ہمارے قدیم ادبی سرمائے تک دراز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ادب سے متاثر ہونے کے

باوجود اردو افسانے کی اپنی ایک شناخت اور پہچان ہے۔ اس نے ہندوستان میں پروان چڑھنے والی کہانیوں کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ملکی معاشرت، تہذیب اور قومی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

ادب کی دیگر اصناف کی مانند افسانہ بھی مختلف اجزا یا عناصر سے مل کر وجود میں آیا ہے۔ اس کے عناصر زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی طرح تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ تشکیلی عناصر میں پلاٹ، کردار، ماحول اور فضا کے علاوہ وحدتِ تاثر، موضوع اور اسلوب کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ سب بالترتیب افسانوں میں موجود ہوں ایسا نہیں ہے۔ بیان کو جس طرح بھی منظم کیا گیا اس کا خاتمہ بالعموم کسی انکشاف پر ہوتا ہے جس سے اس حیرت میں اضافہ ہوتا ہے جو زندگی کے کسی ایک پہلو کے قریبی مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے۔

فکشن کے بیشتر ناقدین نے اسے تسلیم کیا ہے کہ افسانے میں واقعہ اور کردار کی تشکیل و تعمیر میں تخیل کی رنگ آمیزی کا عمل ہونا ضروری ہے لیکن اس کی کہانی جو کہ واقعہ اور کردار کے باہمی ردِعمل کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کی بنیاد کسی حقیقت پر ہی ہوسکتی ہے لیکن صرف کسی واقعہ کی ہو بہو منظر کشی یا کردار کی حقیقی تصویر سے ضروری نہیں ہے کہ افسانہ بن جائے۔ ایسی بیانیہ تحریر انشائیہ، واقعہ نگاری، رپورتاژ، شخصی خاکہ، روز نامچہ غرض کچھ بھی ہوسکتی ہے لیکن ممکن ہے کہ افسانے کے زمرے میں نہ آپائے۔ واقعات، تجربات، مشاہدات، کرداروں کو افسانہ میں پوری غیر جانب داری سے پیش کرکے اور اپنے ذاتی تاثر یا رائے کو منعکس نہ کرکے، افسانہ نگار اپنا کام ختم کر دیتا ہے۔ افسانہ کے توسط سے قاری کے سامنے کوئی بھی مسئلہ رکھنا ممکن ہے مگر اس کا حل بتانا ضروری نہیں ہے۔ حل کی تلاش قاری کو کرنی ہے۔ نتیجہ بھی قاری کو اخذ کرنا ہے۔ افسانہ کی طوالت کے بارے میں ناقدینِ فن کی مختلف آراء ہیں مگر اس پر بھی متفق ہیں کہ طوالت اتنی ہو کہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو پائے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ افسانہ وہ تحریر ہے جو پندرہ بیس منٹ میں پڑھی جاسکے۔ اس طرح زیادہ واقعات اور کرداروں کے لیے عموماً مختصر افسانہ میں جگہ نہیں نکالی جاسکتی۔

مذکورۂ بالا سطور میں تشکیلی عناصر کے حوالے سے پلاٹ، کردار، ماحول اور فضا کا ذکر ہوا ہے۔ اس صنفِ ادب میں واقعات اور مشاہدات و حادثات کی فنی ترتیب دراصل پلاٹ کی تشکیل کی وساطت سے ہوتی ہے جو افسانے کے دیگر اجزا کو آپس میں مربوط رکھ کر آغاز سے انجام تک تجسس اور تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ پلاٹ جس قدر مربوط، تجسس خیز اور متناسب ہوگا، افسانہ اُتنا ہی دلچسپ اور معیاری ہوگا اور قاری اُسی قدر منہمک ہوکر بیان کا تاثر قبول کرے گا۔

سپاٹ یا غیر منظم پلاٹ افسانویت سے عاری کہلاتے ہیں اور ان میں وہ متجسسانہ دلکشی برقرار نہیں رہ پاتی جو قاری کو بے چین کر دیا کرتی ہے اس لیے پلاٹ کے صیغے میں افسانہ نگار کو واقعات اس ترتیب کے ساتھ بیان کرنے ہوتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جائے اور وہ انجام جاننے کے لیے مضطرب ہو جائے۔ ایک عرصے تک پلاٹ کو افسانہ کا سب سے اہم جزو مانا گیا لیکن بغیر پلاٹ کے افسانے بھی لکھے جاتے ہیں اور پلاٹ کا تصور افسانے کے واقعات کے منطقی ربط تک محدود نہیں رہ گیا ہے۔

اشخاص قصہ کے حرکات و سکنات کی عکاسی کو عموماً کردار سازی قرار دیا جاتا ہے۔ کردار کو افسانے کا مضبوط ترین ستون بھی کہا جاتا ہے۔ ناقدین نے اسے افسانے میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور کردار کو پلاٹ پر مقدم بتایا ہے جبکہ کہانی کے ڈھانچے کا انحصار پلاٹ پر ہوتا ہے بغیر اشخاص کے افسانے کی تکمیل مشکل ہوتی ہے۔ جن تمثیلی افسانوں میں حیوانات یا نباتات ہیرو کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں ان میں بھی ان کو انسانوں کی طرح بولتے، سوچتے، سمجھتے اور عمل کرتے دکھایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ماحول اور فضا افسانے کے ضروری عناصر قرار دیے جاتے تھے۔ یہ پلاٹ اور کردار کی ایسی درمیانی کڑیاں ہوتی تھیں، جو واقعات کے تمام تانوں بانوں کو یکجا کرتی تھیں۔ ماحول کے تحت کہانی کے گرد و پیش کے مناظر اور مقام کی جغرافیائی خصوصیات کو پیش کیا جاتا تھا۔ 'فضا' اس تاثر کو کہا گیا جو ماحول کی تصویر کشی سے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے جیسے قبرستان کی ویران اور تاریک رات کا منظر ماحول میں شمار ہوتا لیکن اس کے تصور سے دل و دماغ پر جو خوف اور اداسی طاری ہوتی اسے فضا سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ موضوع کا تعین، عنوان کی تلاش، مکالمہ نگاری اور آرائش بیان کو بھی افسانے کے اجزائے ترکیبی میں شمار کیا گیا۔ اس دور میں افسانے کے تکنیکی لوازم میں راوی، بیانیہ، کردار، واقعہ، منظر، فضا اور کسی حد تک منشائے مصنف کو اہمیت حاصل رہی، لیکن بعد کے دور میں افسانے کے رنگ و روپ اور ہیئتی ڈھانچے میں نمایاں فرق آیا اور وہ اپنے ماضی سے مختلف ہو کر نت نئے تجربوں سے دوچار ہوا۔

ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے پہلے افسانہ نگاروں کے پاس نوآبادیاتی نظام سے نبرد آزما ہونے والا ایک واضح نصب العین تھا۔ آزادی ملنے کے آس پاس کے زمانے میں بھی جب آگ اور خون کے آتش فشاں منظر میں صدیوں کے تعلقات ٹوٹ رہے تھے، رشتے منقطع ہو رہے تھے تب

اُس پر آشوب دور میں بھی افسانہ نگاروں کے سامنے اپنا ایک مطمحِ نظر تھا جو رفتہ رفتہ ماند پڑتا گیا، تاہم ہجرت اور غریب الوطنی کے مسائل نے جس طرح ذہنوں کو جھنجھوڑا، اس سے فنکارانہ شعور گہرے طور پر متاثر ہوا اور پھر بدلتے ہوئے تہذیبی تناظر میں افسانہ نگاروں کو نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جغرافیائی تبدیلی نے غور وفکر میں تلاطم پیدا کیا تو اردو افسانے نے بھی نیا رُخ اور نیا انداز اختیار کیا۔ نئے سانچے مرتب کیے گئے اور اسے نئے تناظر اور نئی وسعت سے روشناس کرایا گیا۔

تقسیم ہند نے جو گہرے زخم دیے تھے، وہ رفتہ رفتہ مندمل ہوئے۔ ان سے وابستہ موضوعات کے اثرات بھی کم ہوئے۔ مارکسیت کی گرفت بھی کمزور ہونے لگی جس کی وجہ سے حقیقت نگاری کی روایت جو سماجی اور نفسیاتی زاویوں سے معاشرے کو دیکھ رہی تھی، اپنا اثر کھونے لگی۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اردو میں ۱۹۵۸ء کے آس پاس جدیدیت کا رجحان فروغ پانے لگا۔ اجتماعیت کے مقابلے میں فردیت اور خارجیت کے مقابلے میں داخلیت زور پکڑنے لگی اور منجھی ہوئی مانوس اور مربوط زبان کے بجائے قدرے ناہموار بلکہ کبھی کبھی نامانوس زبان کا استعمال شروع ہوا، اور یہ تصور پنپنے لگا کہ پلاٹ، کردار، واقعہ، فضا اور ماحول کے بغیر بھی افسانہ بن سکتا ہے۔ اس تصور کے تحت شعور کی رَو اور آزاد تلازمۂ خیال طاقت ور پیرایۂ اظہار کی صورت اختیار کرنے لگے۔ علامتی اور تمثیلی افسانوں کے ساتھ تجریدی افسانے منظرِ عام پر آئے جن میں نئی حسیت اور فن کے نئے راستوں کا انتخاب نظر آتا ہے۔ ادبی حلقے میں اس نئے نظریے کی پذیرائی ہوئی۔ براہِ راست انداز میں پیش کیے ہوئے افسانے یک سطحی اور سپاٹ تصور کیے جانے لگے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ علامت، ابہام اور اشاریت ادب کو تہہ داری اور متحرک مفہوم کی حامل بنا دیتی ہے اور معنوی جہت کو وسعت و گہرائی عطا کرتی ہے۔ جدیدیت کے اس تصور کے تحت افسانہ نہ صرف فن کار کے لیے پیچیدہ بن گیا بلکہ عام قاری کے لیے بھی اس کا پڑھنا خاصا دشوار ہو گیا۔

ردّ و قبول کے اُس دور میں جب خارج سے داخل کی طرف پیش رفت ہوئی، تو ایک جانب شعور کی رَو کی تکنیک، نفسیاتی تصورِ وقت اور فلسفۂ وجودیت کو فروغ حاصل ہوا، تو دوسری طرف تمثیلی اور داستانی رنگ کے قصوں کے ذریعے یہ صنف اساطیری اور دیو مالائی فضا سے ہم آہنگ ہونے لگی اور افسانوں میں کرداروں کی جگہ تمثیلوں، استعاروں اور علامتوں کا بکثرت استعمال ہونے لگا۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے کہ کس تحریک، رجحان یا نظریہ کے پسِ پشت کون سے فلسفے اور مقاصد تھے اور بحیثیت مجموعی ان کا اردو ادب پر کیا اثر پڑا۔

جدیدیت نے بیانیہ انداز سے انحراف برتا تھا۔ اور پھیلاؤ کے بجائے ارتکاز سے کام لیا تھا لیکن مابعد جدید دور بیانیہ کی واپسی کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ابہام اور تجرید کی جگہ بیانیہ افسانہ لکھنے کا رجحان بھی بڑھا ہے اور استعاراتی اور علامتی انداز بھی پروان چڑھا ہے۔ آج کہانی کا مرکز ومحور انسان کی ذات ہے جس کے تجربات کی عکاسی مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ پرتیں کھولی جا رہی ہیں۔ اب موضوعات سے زیادہ فن پر زور ہے بلکہ اکثر موضوعات کی تکرار کے باوجود اظہار کی تازگی نے فن پارے کو قابلِ توجہ بنایا ہے۔ عصرِ حاضر کے افسانوں کی تمام تر موضوعاتی عمارت خارجی دنیا کی صداقت، معیشت کے بے رحمانہ تضادات، روزمرہ پیش آنے والے سیاسی وسماجی مسائل، بھوک، جنس اور انسانی رشتوں کی کرختگی پر قائم ہے۔ فنی اعتبار سے اکیسویں صدی کے افق پر طلوع ہونے والے افسانوں نے صنفِ افسانہ میں ایک نئی حرارت اور توانائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی بدولت تخلیق کا کینوس بھی وسیع ہو رہا ہے اور تجربات کی راہیں بھی روشن نظر آ رہی ہیں۔

موضوع کی سطح پر کائنات سے ذات تک سمٹنے اور پھر ہیئتی سطح پر اس میں نت نئی تبدیلیوں کے عمل کی روداد ایک صدی کو محیط ہے۔ پچھلے سو سالوں میں برِ صغیر کے مختلف علاقوں کی تہذیب، وہاں کی سیاسی اتھل پتھل، اقدار کی شکست و ریخت اور ان کا کھوکھلا پن، رومان اور حقیقت کا ٹکراؤ، فطرت نگاری، طبقاتی جدوجہد اور فرد کا فطری وجبلی اظہار، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو کے لیے صنفِ افسانہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ طبقہ وارانہ تقسیم اور ذاتی مفاد کی بنا پر مسخ کیے ہوئے کردار اور ان سے وابستہ واقعات وحادثات کی ایک مکمل دستاویز افسانے کے اس سو سالہ سفر سے مرتب کی جا سکتی ہے، اور یہ برِ صغیر کی تاریخ کو تخلیقی تناظر میں دیکھنے کی ایک ایسی کوشش ہے جس کے بغیر روایتی تاریخ نگاری نہ صرف ادھوری بلکہ واقعات کی فہرست پر مبنی ایک رسمی تحریر سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔

دراصل داستانوی ادب کی توانا روایت موجود ہونے کے باوصف شروع سے ہی مان لیا گیا کہ اردو افسانے کی ساخت میں اختصار، جامعیت اور واحد تاثر ہو، زبان و بیان میں ہم آہنگی، نُدرت اور اصلیت ہو۔ اس وضاحت کی بدولت ادب کی دیگر اصناف کے برعکس 'افسانہ' حیرت انگیز انداز میں بہت جلد ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اس میں فکر کی وسعت اور عصری زندگی کی ترجمانی کے ساتھ تکنیک اور اسلوب کے تجربات بھی ہوتے رہے ہیں۔ اسی لیے ہر دور

کا افسانہ اپنے موضوع، اسلوب اور طریقۂ اظہار کے لحاظ سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ مثلاً پریم چند کا عہد حقیقت نگاری کا ہے۔ اس نے خارجی زندگی کے مختلف مسائل کو منعکس کیا، تمام عناصر ترکیبی کو بروئے کار لاتے ہوئے منطقی بیان کو فروغ دیا ہے۔ ترقی پسندی کے دور میں پریم چند کی روایت کو استحکام ملا ہے۔ عوامی زندگی کے گوناگوں مسائل کو تخلیقی سطح پر منظم طریقے سے برتا گیا ہے۔ بیانیہ براہِ راست اور کرداروں کی واضح پہچان ہے۔ جدیدیت کے زمانہ میں تجرباتی افسانہ نگاری کا رجحان حاوی رہا ہے۔ انسان کے داخلی جذبات کو فوقیت ملی ہے جبکہ پلاٹ اور کردار کی اہمیت کم ہوئی ہے۔ وضاحتی بیانیہ کی جگہ اشاراتی انداز اُس عہد کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مابعد جدید زمانے میں کہانی کی واپسی پر ازسرِ نو اور تمثیلی پیرائے کو وسعت ملی ہے۔ عہد حاضر کے افسانہ نگار فرد کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوری کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بین الاقوامی سیاسی اور سماجی نظام افسانے کی گرفت میں آ گیا ہے۔ نیز وہ باریک بینی سے صارفیت اور بازار کی عالم گیری کے نظام کو تہہ در تہہ سمجھنے اور اپنے فن کے لوازم کے ساتھ حاصل شدہ بصیرت کو قاری تک پہنچانے کا جتن کر رہے ہیں۔

(۲)

حقیقت نگاری، رومانیت، مارکسیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مراحل سے گزرتا ہوا آج کا اردو افسانہ اپنی فکری اور فنی شناخت کے ٹھوس حوالوں کے ساتھ جدت و ندرت کا بھی احساس دلا رہا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے افسانوں کے ایسے انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی جو جدید نصابی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ قاری کو تغیر و تبدل سے بھی متعارف کرا سکے۔ اولاً میں نے مختصر اور طویل افسانوں کی صف بندی کی پھر فیصلہ کیا کہ پہلے مختصر افسانوں پر توجہ مرکوز کی جائے۔ میرے لیے یہ مشکل مرحلہ تھا کہ پریم چند سے ترنم ریاض تک یعنی ایک صدی پر محیط بتیس تینتیس افسانوں کا ایسا انتخاب پیش کروں جس میں برِصغیر کی تمام فکری اور فنی ہلچل سمٹ آئے اور ضخامت بھی ساڑھے تین سو صفحات کے آس پاس ہو۔ ساتھ ہی کم سے کم لفظوں میں افسانہ نگاری کے فن کو اجاگر کرتے ہوئے مجموعے میں شامل بھی افسانوں پر مختصر مگر بامعنی گفتگو بھی ہو۔ بہر حال اسد یار خاں صاحب کے حکم، اپنی دلچسپی اور قارئین و طلبا کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس منصوبے کو یکسوئی، دلجمعی اور دیانت داری سے مکمل کرنے

میں لگ گیا۔ دوستی، رواداری اور مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پسند، ناپسند کے مرحلے میں معیار، میزان کا پوری طرح خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا پریم چند سے کہ وہ اردو افسانے کے بنیاد گزار اور رجحان ساز ہیں۔ ان کے افسانوں کی عہد حاضر میں بھی وہی اہمیت اور افادیت ہے جو پہلے تھی۔ پریم چند کا تخلیقی عمل، ان کی فکر اور فن ارتقاء کے تدریجی مراحل سے دوچار ہو کر ادبی سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے۔ تقریباً تیس سال پر مبنی وہ عہد اور اُس عہد کا اردو افسانہ جن نشیب و فراز سے گزرتا رہا وہ تمام زیر و بم پریم چند کے افسانوں میں بڑے ہی واضح دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کا افسانوی سفر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے عبارت ہو جاتا ہے۔ اُن کے افسانوں کو تاریخ وار سامنے رکھ کر اردو افسانے کی تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے اور ان کے افسانوں کو الگ کر لینے پر یہی بات ناممکن بن جاتی ہے۔

اردو افسانہ کے آغاز، تعمیر اور تشکیل کے واضح نقوش کے پیش نظر انتخاب میں پریم چند کے دو افسانے ''روشنی'' اور ''عید گاہ'' شامل کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں افسانے محض اپنے وقت کے تقاضوں کے علمبردار نہیں ہیں بلکہ زمانے کے تیز و تند تھپیڑوں سے گزرنے کے بعد آج بھی اپنے قاری کو دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔ ''روشنی'' میں ایک آئی سی ایس آفیسر اور ایک دیہاتی بیوہ کو مرکزی کردار بنا کر پریم چند نے غریب عورت کی اخلاقی جرأت، جذبۂ ایثار اور اعلیٰ انسانی اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔ بیانیہ تکنیک پر مبنی اس افسانے کا اسلوب سیدھا سادا، صاف ستھرا اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ پند و موعظت سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملے قدیم ہندوستانی اقدار کو اجاگر کرتے ہیں۔ دراصل پریم چند نے مذکورہ افسانے کے ذریعے ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز و تخصیص کو ختم کرتے ہوئے انسانی ہمدردی اور خلوص و محبت کی شمع کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے جس کی روشنی سے تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں۔

''عید گاہ'' غربت و امارت کا ایک استعارہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار حامد یتیم ہے۔ وہ غربت کی گود میں پل کر انتہائی حساس اور باشعور ہو چکا ہے جبکہ دیگر ساتھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کھیل کی دنیا میں گم ہیں۔ احباب کے ساتھ کھلونے خریدتے ہوئے حامد کا یہ احساس کہ روٹی پکاتے وقت دست پناہ نہ ہونے کی وجہ سے دادی کا ہاتھ جل جاتا ہے تو کیوں نہ ایسی شے خریدی جائے جو بامقصد اور کارآمد ہو، قاری کو سنجیدہ غور و فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھا گیا یہ افسانہ امیری و غریبی کی کشمکش، اتحاد و اخوت، یتیموں اور بیواؤں کی

بے چارگی اور بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے ساتھ ان کی خواہشات و نفسیات پر مشتمل چونکا دینے والا اشاریہ ہے۔ مذکورہ افسانہ میں اس بات کا بالواسطہ اعلان ہے کہ اگر غریب حساس اور بیدار ہو جائے تو وہ 'دست پناہ' کی مانند فولادی ہو جائے گا جس کے سامنے طاقت ور اور جابر طبقے جو افسانہ کے منظر نامے پر سپاہی، وکیل وغیرہ کی شکل میں نظر آرہے ہیں، ٹوٹ پھوٹ کر خاک میں مل جائیں گے۔ ذرا حوصلہ ہو تو فتح کا پرچم فولادی دست پناہ کی طرح غریب کے ہاتھ میں ہوگا۔ عوامی اقتدار اور جمہوری نظام کی یہ ایک بشارت بھی ہے جسے پریم چند نے نہایت سادگی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔

افسانہ ''دُلاری'' میں پلاٹ وقت کے تسلسل کا تابع ہے۔ کفایتِ لفظی کے ساتھ یہ ایک مکمل قصہ ہے جو کردار کے وسیلے سے سامنے آتا ہے کہ کس طرح ایک غریب ملازمہ جو جبریت کا شکار ہو کر جنسی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ سجاد ظہیر نے اس افسانہ میں ایک سیدھی سادی بے سہارا لونڈی کی کہانی کو تیکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ شیخ ناظم علی کے گھر میں پرورش پاتی ہے اور ان کے بڑے بیٹے کاظم علی کے ورغلانے پر اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیتی ہے، لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ کاظم کی دلہن آنے والی ہے تو وہ گھر سے غائب ہو جاتی ہے۔ کافی دنوں کے بعد کاظم کے ضعیف ملازم کے کہنے پر واپس آتی ہے۔ سبھی اس پر لعن طعن کرتے ہیں جسے وہ برداشت کرتی ہے لیکن جب کاظم اپنی ماں سے کہتا ہے کہ ''امی خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے وہ کافی سزا پا چکی ہے''۔ تو دُلاری کی قوتِ برداشت ختم ہو جاتی ہے۔ کاظم کے ترس کھانے سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ اس قابلِ رحم زندگی کو قبول نہ کر کے 'سفید پوش' معاشرے کی دھجیاں اڑانے پر خود کو آمادہ کرتی ہے اور 'رکھیل' بن کر رہنا بہتر سمجھتی ہے!! فکشن کی تاریخ پر غور کیا جائے تو یہی وہ زمانہ ہے جب فرائڈ کے نظریات کے تحت اردو میں نفسیاتی افسانے لکھنے کا رجحان شروع ہوا۔ اس مطمحِ نظر کو فروغ دینے کی پہل بھی سجاد ظہیر نے کی۔ انھوں نے جس طرح دلاری کے معصوم جذبات، غیرت اور حمیت کو اُجاگر کیا ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کے طرزِ عمل کا تجزیہ کیا ہے وہ اردو افسانے کی تاریخ میں اس قسم کے مظلوم نسوانی کرداروں کے نفسیاتی مطالعے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

''دو ہاتھ'' پلاٹ، کردار اور صورتِ حال کے اعتبار سے عصمت چغتائی کا کامیاب افسانہ ہے۔ اپنے محدود سیاق و سباق میں پلاٹ بے حد مربوط ہے۔ واقعات میں تسلسل، ربط،

حیرت واستعجاب اور دلچسپی ہے۔ کرداروں کے اعتبار سے ہر کردار اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ان کے برتاؤ اور غور وفکر میں منطق ہے۔ زبان مخصوص معاشرے کی ذہنیت کی عکاس ہے۔ اظہار میں کہیں بھی تصنع نہیں۔ محاورے اور مکالمے برمحل ہیں۔ راوی کی موجودگی اور برملا اظہار بیانیہ میں اور بھی جان ڈال دیتا ہے بلکہ وحدتِ تاثر کو برقرار رکھنے میں بھی معاون ہوتا ہے۔ دراصل عصمت چغتائی اس افسانہ میں بے باک اور بے رحم حقیقت نگار بن کر سامنے آتی ہیں۔ افسانہ میں جائز اور ناجائز، حلال اور حرام، اخلاق اور بد اخلاقی، شرم اور بے شرمی، ضمیر اور بے ضمیری کے گرد تمام تانے بانے بُنے گئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس میں ''دو ہاتھ'' کو بطور استعارہ، طنز ملیح کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔ جملے طنزیہ، بول تیکھے، مکالمے بے باک، اچھوتی اور نادر تشبیہات ہیں۔ رتی رام، بوڑھی ماں (مہترانی) سے ملنے آتا ہے جو رشتے میں اس کی تائی ہے۔ وہ بھاوج (گوری) کے قریب پہنچتا ہے اور پھر گوری اس کے بیٹے کی ماں بن جاتی ہے۔ لعن طعن ختم، خوشیاں عود کر آتی ہیں۔ گوری کا شوہر رام اوتار ناکارہ ہے مگر یہ بچہ اب اس کا سہارا ہے۔ پس پشت سماج کا ایسا مظلوم طبقہ جو برسہا برس کے استحصال کے نتیجے میں غیر محسوس طور پر جانوروں کی طرح زندگی گزار رہا ہے، اسی لیے بے حس ہے۔ مگر معاشرے کا وہ طبقہ جو دولت مند ہے، صاحب ثروت ہے، حساس ہے ان کے سفید لباس بھی کس حد تک داغدار ہیں اس کا اظہار مصنفہ نے ضعیفہ کی زبان سے اشاروں اشاروں میں کروایا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عصمت چغتائی نے کرداروں کی نفسیات کے وسیلے سے معاشرے کے گھناؤنے چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کا افسانہ ''ہتک'' ایک ایسی طوائف کے گرد، گردش کرتا ہے جو اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔ نہایت باریکی اور فنی ہنر مندی سے بُنا گیا یہ افسانہ دائروی شکل میں گھومتا ہوا اختتام سے آغاز کی طرف لوٹتے ہوئے بیانیہ عرصہ قائم کرتا ہے۔ درمیان میں کچھ واقعاتی اور نفسیاتی مناظر ہیں جو دلچسپی کے ساتھ ساتھ تحیر و تجسس میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اپنی دنیا میں مست رہنے والی سوگندھی کو یہ شکوہ ضرور ہے کہ کسی گاہک نے اسے صدقِ دل سے نہیں چاہا۔ لے دے کر ایک مادھو ہے لیکن وہ بھی مٹی کا مادھو ثابت ہوا۔ کبھی کبھی یہ شکوہ اُسے تشویش میں مبتلا کرتا ہے۔ طرح طرح کے خدشات جب اُسے اپنے شکنجے میں جکڑتے ہیں تو وہ انھیں ہی جواز کے سہارے جھٹک کر چاق و چوبند ہو جاتی ہے۔ رام لال دلال کے کہنے پر وہ گہری نیند سے اٹھ کر لمحہ بھر کے لیے سیٹھ کے روبرو آتی ہے کہ اچانک سیٹھ کے منھ

سے ''اونہہ'' کی ادائیگی جس انداز میں ہوتی ہے وہ سوگندھی کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ لفظ ''اونہہ'' اس کے ذہنی بہلاوے کو خلجان میں مبتلا کرتا ہے۔ ذلت کا احساس شدید ہوکر نفرت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اضطراب و تلاطم کی کیفیت اس کی پوری شخصیت کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔

دلال کا رویہ سوگندھی کے لیے نیا نہیں تھا۔ اس لیے وہ دلال سے نہیں گاہک کے حقارت آمیز برتاؤ سے تضحیک محسوس کرتی ہے جس کی وجہ سے اُس کے اندر طرح طرح کے سوالات اُبھرتے ہیں جو انسانی فطرت پر مبنی ہیں۔ سوگندھی جتنا خود کو بہلانے کی کوشش کرتی ہے اتنی ہی شدت سے اُس کے دل میں سیٹھ کے خلاف نفرت اور حقارت پیدا ہوتی ہے۔ منٹو کا یہ فنی کمال ہے کہ اس نے بے بسی، غصہ اور ذلت کی ملی جلی کیفیت کے لیے محض کلمۂ نفرت ''اونہہ'' ادا کروایا ہے۔ ابتداءً یہ کلمہ سوگندھی کے لیے حیرت و استعجاب کا سبب بنتا ہے لیکن رام لال کی وضاحت سے اُسے اذیت ناک تکلیف کا احساس ہوتا ہے جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہے اور جب اُس کرب کا ردعمل انتہائی لمحہ پر پہنچتا ہے کہ وہ اپنے خارش زدہ کتے کو بغل میں لے کر سو جاتی ہے تو قاری خود بھی حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بے حس معاشرہ تک اپنی بات پہنچانے کا منٹو کا یہ چونکا دینے والا انداز ہے جس کی ترسیل میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

کرشن چندر پامال، پسماندہ اور محنت کش عوام کے حقوق کے پاسبان اور نگہبان تھے۔ ان کے افسانوں کی بنیادی خصوصیات رومانیت، حقیقت، محبت، خوش حال معاشرے کی خواہش، سماج کے پسماندہ اور معاشی طور پر بدحال لوگوں کی زندگی سنوارنے کا خواب اور اسی زمین کو جنت بنانے کا شدید احساس اور تصور ہے۔ یہ تمام خصوصیات کرشن چندر کے اگر کسی ایک افسانے میں موجود ہیں تو وہ افسانہ ''کالو بھنگی'' ہے۔ ''کالو بھنگی'' میں حسن کا انداز، واقعہ کی ترتیب اور پیش کش کا طریقہ بدلا ہوا ہے۔ افسانہ نگار گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہوئے خود کلامی اور مکالماتی طرز میں سوال قائم کرتا ہے کہ نیک سیرت والا بدصورت کیوں کہلاتا ہے؟ ہر پل دوسروں کے لیے جینے والے کی اپنی زندگی کیا ہے؟ اسے عزت، دولت، شہرت اور احترام کیوں نہیں مل سکا ہے؟ ذمہ دار کون؟؟ اس کی خاموش نگاہوں میں جو رقت، التجا اور سہمی ہوئی دیرینہ خواہش ہے، اس کی تکمیل کب اور کس طرح ہو سکے گی؟ آج بھی یہ سوالات اتنے ہی پریشان کن ہیں۔ مرکزی کردار کالو جس کا پیشہ اس کے نام کا جز بن گیا ہے۔ یہ پیشہ تو خدمتِ خلق کا ہے مگر زمانہ اسے منفی شکل دے دیتا ہے، ذلیل سمجھتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا اس وجہ سے کہ وہ چھٹکار

اور ذلت کے باوجود تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ذلتیں اور رسوائیاں سہنے کے باوجود خدمت خلق کا بے لوث جذبہ اس میں موجزن ہے تبھی تو اس میں معصومیت، سادگی، بھولا پن، محبت اور اپنائیت ہے۔ انسانی درجہ بندی کی بے رحمی اور بد خلقی کی بنا پر اسے معاشی آسودگی میسر نہیں ایسے میں بھلا وہ جنسی آسودگی کا طلب گار کیسے ہو سکتا ہے۔ جنسی تسکین انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے اور انسان اس کے لیے جانے کتنے سوانگ رچتا ہے، کتنے روپ اختیار کرتا ہے اور انگنت شعوری و لاشعوری حرکتوں کا شکار ہوتا ہے۔ مگر 'کالو بھنگی' کی تو بس اتنی سی خواہش ہے کہ رزق حلال میں ایک روپیہ کا اضافہ ہو جائے تاکہ وہ گھی لگے پھلکے پراٹھے کھا سکے۔ شاید اسی لیے اس کو بھٹا بھوننے میں تسکین حاصل ہوتی تھی۔ آٹھ روپے ماہانہ کمانے والا تھکتا نہیں، گردشِ ایام کی طرح شب و روز کام میں مصروف رہتا ہے، بیماری کا بھی عذر نہیں کرتا۔ ڈاکٹر سے اس کا موازنہ کیوں کر ہو، کمپاؤنڈر خلجی جو مڈل پاس ہے اور بتیس روپے کماتا ہے اور چپراسی بختیار جو پندرہ روپے کماتا ہے، ان دونوں کی تمام کمزوریوں کے باوجود 'کالو' کا سماجی اور معاشی مرتبہ صفر نظر آتا ہے۔ کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں۔ گائے، بکری جنھیں وہ چراتا ہے وہی بے زبان اسے تسلی، سہارا، تھپکیاں دیتے، سر سہلاتے اور شاید یہی مشغلہ اس کے لیے دلچسپ تھا کہ لاشعوری طور پر اسے برابری کا احساس ہوتا ہوگا۔ تبھی تو وہ دونوں اس کی موت کا سوگ مناتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک بے انصاف معاشرے میں افسانہ نگار کی ترجیحات اور رویوں کے بارے میں بھی سوال اٹھاتا ہے کہ کس طرح کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور کیوں لکھی جاتی ہیں۔ اس طرح قصہ گوئی اور سماج کے رشتے پر ایک اچھی خاصی بحث کرشن چندر نے بالواسطہ طور پر کی ہے۔

رسم و رواج، عقائد اور توہمات کس طرح خارجی ظلم و تشدد اور داخلی کرب کی راہ ہموار کرتے ہیں، 'گرہن' اس کے بلیغ فنی اظہار سے عبارت ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس علامتی افسانہ میں اساطیر کے توسط سے ہولی کی زندگی پر لگتے ہوئے گرہن کے منظر و پس منظر کو عورت کی تضحیک و تذلیل اور ہتک آمیز زندگی کا معنی خیز اشاریہ بنا دیا ہے۔ افسانہ میں چار کردار ہیں مگر مرکزیت ہولی کو حاصل ہے۔ دوسرے کرداروں میں رسیلا، منیا اور کھتو رام ہیں جو افسانہ کی بنت میں معاونت کرتے ہیں۔

پسند، مرضی اور انا سے یکسر بے نیاز حاملہ ہولی کو جب زندگی کے سفر میں ہر طرف تاریکی نظر آنے لگتی ہے تو وہ تلملا جاتی ہے۔ ایسے میں اسے اپنا شوہر رسیلا بھی راہو یعنی کالے

راہجس کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ ساس (مّیا) کو بہو سے زیادہ ہونے والے بچے کی فکر لاحق ہے۔ وہ اسے ٹوکتی ہے کہ آج چاند گرہن ہے ایسے میں کپڑا پھاڑنے سے پیٹ میں بچے کے کان پھٹ سکتے ہیں۔ سرمہ لگانے سے وہ اندھا ہوسکتا ہے۔ کپڑا سینے سے اُس کا منھ سلا ہوا ہوگا اور اگر میکے خط لکھا تو ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھ جائیں گے۔ ہونے والے بچے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے،اس کی تو فکر ہے لیکن ماں پر کیا کچھ گزر رہی ہے،اس کا بالکل احساس نہیں ہے۔

ضعیف الاعتقادی سے بھرے پُر تشدد ماحول میں ہولی خود بھی اپنی حفاظت سے زیادہ آنے والی نسل کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں اس حد تک سہم جاتی ہے کہ بغیر کسی منصوبے کے جائے پناہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ بے جا اور ناروا سلوک اسے اپنے میکہ کی یاد دلاتا ہے کہ شاید وہاں کھلی فضا میں سانس لینا میسّر ہو۔

بیدی کا فنّی کمال ہے کہ وہ پلاٹ کی بُنت میں ایسی فضا خلق کرتے ہیں جس میں بنیادی قصہ کے ساتھ ساتھ علامتی اور اساطیری عناصر خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے اساطیر سے استفادہ کرتے ہوئے اسے ہولی کے گرہن لگنے سے جوڑ دیا ہے۔ ایک طرف راہو اور کیتو چاند کو اپنے نرغے میں لینے کے لیے بڑھتے ہیں تو دوسری طرف ہولی تاریکی میں پھنستی چلی جاتی ہے۔ سسرال کے ناقابل برداشت ماحول سے گھبرا کر گوشۂ عافیت کی تلاش میں نکلی مظلوم عورت ہوس پرستوں میں گھر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حامی تحفظ دینے کے بجائے اُسے گھنانے کے درپے ہے۔ قاری اس وحشت ناک ماحول سے گھبرا اٹھتا ہے۔ راہو اور کیتو چاند کو پوری طرح سیاہی کی چادر میں ڈھانپ لینے کے بعد اُسے چھوڑ دیتے ہیں مگر ہولی چاند نہیں، کائنات کی حسین ترین تخلیق، عورت ہے جو کل بھی جبر و تشدد کا شکار تھی اور آج کی فضا بھی اُس کے لیے سازگار نہیں ہے۔ شاید یہی اس کا مقدر ہے۔ اسی المیہ کو بیدی نے فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانہ ''ابابیل'' میں مرکزیت رحیم خان کو حاصل ہے جس کا عمل اپنے نام کے بالکل برعکس ہے۔ وہ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا ہے۔ یہ رویہ اس کو بالکل تنہا کر دیتا ہے۔ بچوں کے جانے کے بعد جب بیوی بھی اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو تنہائی میں اس کا ذہن لاشعوری طور پر خود احتسابی کی طرف مائل ہوتا

ہے۔ کھپریل کی چھت میں ابابیل کے گھونسلے کو دیکھ کر وہ اس پر جھپٹنا چاہتا ہے مگر گھونسلے کے اندر بیٹھے دو بچوں کی حفاظت کرتے ہوئے ابابیل کے جوڑے خصوصاً ماں کو حملہ آور دیکھ کر اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور پھر تخریب تعمیر میں بدل جاتی ہے۔ چار صفحے کے اس افسانے میں مصنف رحیم خان کے ظلم اور اس ظلم کو اچانک ترک کرنے کا کوئی واضح سبب بیان نہیں کرتا ہے۔ عنوان کی مناسبت سے بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں ہونے پاتی ہے۔ دلائل و جواز کے لیے قاری اسے بیوی کے جانے کے بعد پنچھی بھیس سے بھی جوڑ سکتا ہے، ماورائی حقیقت سے بھی اور ابرہہ اور سورۂ فیل کے تاریخی واقعے سے بھی۔

غلام عباس کی افسانوی کائنات تین مجموعوں (۱۔ آنندی ۲۔ جاڑے کی چاندنی ۳۔ کن رس) پر مشتمل ہے۔ انھوں نے جس عہد میں افسانہ نگاری شروع کی اس زمانے میں افادی، اصلاحی اور رومانی رجحانات کی جگہ ترقی پسند تحریک ادبی افق پر چھا رہی تھی تاہم غلام عباس ان سب کے عمومی رویوں سے گریزاں رہے اور ان ادیبوں سے بھی دور جن کا مطمحِ نظر محض نعرہ بازی تھا۔ وہ نہ تو پریم چند کی روایت کی تقلید کرتے ہیں، نہ ہی اپنے دور کے غالب نظریات کے ہمنوا ہوتے ہیں بلکہ فطرت انسانی کے بلیغ تجربات، حسین لمحات اور قلبی واردات میں ہی انفرادیت کی تلاش میں کوشاں رہتے ہیں جس کی منفرد مثال 'آنندی' اور 'کتبہ' ہے۔

'کتبہ' کا مرکزی کردار شریف حسین ہے جو ایک دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت و جاں فشانی سے گھر گرہستی چلاتا ہے تاہم اپنی دلی آرزو کو پورا نہیں کر پاتا ہے۔ اس کی بڑی خواہش مکان کے باہری دروازے پر اپنے نام کی تختی لگوانے کی ہے لیکن محدود آمدنی تکمیل میں مانع ہوتی ہے البتہ مرنے کے بعد اس کا بیٹا، باپ کی آرزو کتبہ کی شکل میں پوری کرتا ہے۔

غلام عباس نے عموماً شہری زندگی میں متوسط طبقے کو اپنے افسانوں کا مرکز و محور بنایا ہے۔ ''کتبہ'' میں بھی معاشی پریشانیوں میں مبتلا کلرک کی دم توڑتی ہوئی امید اور چھوٹی سی آرزو کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ روزمرہ کے تانے بانے سے جو منظر نامہ اُبھرتا ہے وہ نہ صرف معاشرہ پر گہرا طنز ہے بلکہ فطرت انسانی کی عکاسی بھی ہے۔ سماجی حقائق اور فرد کے جذبات و احساسات کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کیا انسان کی آرزو مرنے کے بعد مٹی کے مانند ہو جاتی ہے یا کتبہ کی شکل میں قبر کے سرہانے اس کی بے بسی پر آنسو بہاتی ہے۔

غلام عباس کے عہد میں کلرک کے موضوع پر بہت سی تخلیقات منظر عام پر آئیں، نثری قالب میں بھی اور نظم کے پیرائے میں بھی۔ لیکن غلام عباس کی پیش کش کا انداز جداگانہ ہے۔ وہ صورت حال کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے قاری کو ملوث رکھتے ہیں۔ انھوں نے کلرک کی فطرت اور نفسیات کو کتبہ کی علامت بنا کر حال اور ماضی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ نام و نمود کی چاہت فریب زندگی ہے۔ اس میں شریف حسین اور ان کا بیٹا دونوں مبتلا ہیں۔ افسانہ نگار نے اس تاثر کو ابھارا ہے کہ نیم پلیٹ دروازے پر لگے یا قبر کے سرہانے فرق اگر پڑتا ہے تو کس پر؟ تمیز و تخصیص سے مبرّا، یہ افسانہ محض معاشرہ کو آئینہ دکھاتا ہے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ فنکار نے اس کے لیے جذبات، احساسات، توہمات اور قلبی واردات کو شخصیت کے بکھرنے کے عمل سے منسلک کرتے ہوئے معاشرے میں پروان چڑھنے والے مسائل کا بخوبی احاطہ کیا ہے —— حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ تمام فنی خصوصیات کے باوجود یہ افسانہ اپنے عہد میں مقبول نہیں ہو سکا۔ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی سال (۱۹۴۰ء) 'آنندی' بھی شائع ہوا جس کی مقبولیت کے بوجھ تلے 'کتبہ' ابھر نہ سکا۔

''اخبار نویس''، موضوع، تکنیک، برتاؤ اور اسلوب کے اعتبار سے احمد ندیم قاسمی کا کامیاب افسانہ ہے۔ حکم اور فرض، خدمت اور تجارت، اعتماد اور اعتبار کی ملی جلی کیفیتوں کے ساتھ حیرت و استعجاب کے عنصر کو بھی ہنر مندی سے ابھارا گیا ہے۔ بیان اور بیانیہ۔ فکشن اور فیکٹ۔ افسانہ نگار اور صحافی کی آمیزش ''اخبار نویس'' میں جھلکتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے صحافتی دنیا کے نشیب و فراز کو مذکورہ افسانہ میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ انسانی سرشت کی کجی اور اس کی فطری جبلت قاری کے روبرو ہوتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار عباس احمد ایک جرأت مند اور بااصول صحافی ہے۔ ظلم، جبر اور بربریت کے خلاف کھل کر لکھتا ہے۔ رشوت، لالچ یا دباؤ میں آ کر کام کرنے کو وہ پسند نہیں کرتا ہے۔ مصلحت اندیشی اور سمجھوتے سے اُسے بغض ہے۔ وہ دولت، ثروت اور عہدے کے زیر سایہ پروان پانے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرتا رہتا ہے۔ اپنے اس بیباکانہ طرزِ عمل اور طرزِ تحریر کی بدولت وہ بہت دنوں تک کسی ایک اخبار سے وابستہ نہیں رہنے پاتا ہے جس کے سبب مالی دشواریوں سے دوچار رہتا ہے۔ اپنے دوست کے بے حد اصرار پر وہ ایک بڑے سیٹھ کے 'عدل' نامی اخبار میں قلم کا مزدور بننے کے لیے بات کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ سیٹھ سے گفتگو کے دوران اسے جو تنخواہ اور سہولیات پیش کی جاتی ہیں وہ ان

سب کے بارے میں جان کر حیران ہوتا ہے، سوچنے کے لیے وقت طلب کرتا ہے۔ اور پھر وہ سب کچھ دیکھ اور سن کر اپنے ضمیر کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ ذہن اور ضمیر کو جھنجھوڑنے والا یہ افسانہ تاثر دیتا ہے کہ یہاں مذہب کے نام لیوا، قوم کے نگہبان، قانون کے محافظ سب بکتے ہیں۔ خریدار کی شکل میں بڑے بڑے سیٹھ اپنی انا کی تسکین کے لیے ہر بات کو جائز سمجھتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی تناؤ بھری صورتِ حال، انسانی نفسیات کی پیچیدگی اور ٹوٹتی بکھرتی ہوئی شخصیت کا فنکارانہ اظہار مذکورہ افسانے میں نمایاں ہے۔

''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' آزاد پرندوں کو قید کرنے کے لیے بھری دوپہر میں پچھم سے آتی ہے اور کہرام برپا کرتی ہوئی اُتر کی جانب ڈھلان میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ جذبات و احساسات سے عاری یہ مشین کسی کے کرب کو محسوس نہیں کرسکتی۔ یہاں تک کہ دس سالہ معصوم بچے کی خاموش فریاد کو بھی نہیں جس کی بہن لقوے کی مریض ہے اور علاج کے لیے لقا کبوتر کے گرم لہو کی مالش تجویز کی گئی ہے۔ غیاث احمد گدی نے مشینی دور کی اس مشین اور اس کو چلانے والے مصنوعی آلوں کے ذریعے پورے سسٹم کو ہدف بنایا ہے کہ وہ کس طرح بے ضرر اور بے زبانوں کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔ افسانہ نگار نے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے انسانی بے حسی اور سماجی جبر کو اس طرح اُبھارا ہے کہ صارفیت کے دور کی تمام لغتیں اشاریے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ زیریں سطروں میں اُبھرنے والا تقابلی مطالعہ صرف مشرق و مغرب کا نہ رہ کر، ظالم و مظلوم کے مابین در آتا ہے۔ منی بائی، افسانہ نگار، کبوتر، طوطا وغیرہ متحرک اور بے جان یا انسان اور جانور میں متشکل ہوکر حساس قاری سے سوال کرتے ہیں کہ فطرت کے حسن اور اس کی حقیقی زندگی کو ضائع کیوں کیا جا رہا ہے؟ سود و زیاں کیوں اور اُن کا ماحصل کیا ہے؟ کیا صارفیت اور بازار کی عالم گیری مخلوقات کو اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے؟ اگر نہیں تو معصوم بچہ فطرت کو دیکھ کر کیوں مسکراتا اور لذت و خوشی محسوس کرتا ہے!! کیا محض اس وجہ سے کہ وہ ابھی ان مسائل و مصائب سے دو چار نہیں ہوا ہے۔ یہ چبھتے ہوئے سوالات جس ڈھنگ سے افسانے میں بُنے گئے ہیں وہ غیاث احمد گدی کی فنکارانہ بصیرت کے ضامن ہیں۔

''فوٹوگرافر'' میں اشیاء کے فنا ہونے کا تصور اور ماضی کے گزرے ہوئے ایام کی کیفیات کا امتزاج ہے۔ قرۃ العین حیدر کے اس افسانہ میں موضوع کی انفرادیت، ہیئت کی مضبوط گرفت اور اسلوب کا موثر اظہار ہے۔ ترتیب اور تنظیم میں بیان سے زیادہ بصری پیکر کی

اہمیت ہے مثلاً فوٹو گرافر دیکھ اور سن رہا ہے مگر جذبات سے عاری ہے۔ اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا ہے مگر سماعت نہیں۔ ہل اسٹیشن کے گیسٹ ہاؤس میں ایک نوجوان جوڑا ایک شب آرام کرتا ہے۔ ان میں ایک مشہور رقاصہ اور دوسرا موسیقار ہے۔ معمولات کے مطابق فوٹو گرافر ان سے تصویر اتروانے کی درخواست کرتا ہے۔ اتفاقاً تصویر کا لفافہ میز کی دراز میں رکھا رہ جاتا ہے اور سکون و اطمینان کی تلاش میں قیام پذیر دونوں مسافر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایک مدت کے بعد وہی لڑکی اتفاقاً اسی گیسٹ ہاؤس میں پھر آتی ہے۔ قیام بھی اسی کمرے میں ہوتا ہے۔ دراز کھولتی ہے تو پندرہ سال پہلے فوٹو گرافر کے ذریعہ اتاری گئی تصویر اسے مل جاتی ہے۔ وہ ماضی میں امر سندری پاروتی کے مجسمہ کے قریب گزرے ہوئے پل میں محو ہو جاتی ہے کہ کاکروچ اس کی انگلی پر چڑھ جاتا ہے۔ وہ خوف سے اسے جھٹک دیتی ہے اور قاری کے ذہن پر اپنے تمام تاثرات کے ساتھ یہ جملہ نقش ہو جاتا ہے کہ ''زندگی انسانوں کو کھا گئی صرف کاکروچ باقی رہیں گے''۔ یعنی کائنات ہر پل فنا کی جانب گامزن ہے تاہم اشرف المخلوقات کی حیثیت کائنات کے پھیلے ہوئے وسیع پردے پر محض ایک کاکروچ کے برابر ہے یا اس سے بھی کم!

''ہزار پایہ'' میں بیانیہ سے گریز کرتے ہوئے تجریدی اظہاریت سے کام لیا گیا ہے۔ (اس کی قرأت کے لیے قاری کو دو باتیں ذہن نشین رکھنی ہوں گی۔ نمبر ایک جدیدیت کا تصور اور نمبر دو خوف کا احساس۔) خالدہ حسین علامت اور تجرید کی وساطت سے وجودیت کے فلسفے کو اپنے افسانوں کا جز بنا دیتی ہیں۔ یہ فنی طریقۂ کار ان کے دیگر افسانوں کی طرح ''ہزار پایہ'' میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کہانی میں شروع سے ہی موت کی قربت کا احساس ہے جو بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ جسمانی موت کا احساس مرکزی کردار کو ہی نہیں بلکہ اس کے افرادِ خانہ کو بھی ہے۔ اور جب زندگی موت کی گرفت میں بے بس ہو تو بہت سے سوالات سامنے آتے ہیں مثلاً زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ کیا موت ہر چیز کا خاتمہ ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز ہے جسے زندہ رکھا جا سکتا ہے؟ کیا وجود با معنی ہو سکتا ہے؟ ہم کیا ہیں؟ ہمارے علاوہ کیا ہے؟ خارجی اور باطنی زندگی میں اشیاء اور ان کے ناموں میں کیا ربط ہے؟ بیماری اور موت کے تجربے کے توسط سے سامنے آنے والے اس وجودی افسانہ کو آگہی کے کرب اور آشوب عصر کے تناظر میں بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر اس کا اصل سروکار زندگی کے ازلی اور ابدی معموں سے ہے۔ اس لیے عصری اور تاریخی توجیہیں ثانوی ہی ہو سکتی ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

''ہزار پایہ'' میں ہر اثبات کی نفی وجودی شواہد کے وسیلے سے اس طرح ہوتی ہے گویا افسانہ کا اصول تعمیر لاتشکیلی ہے۔

''کونپل'' علامتی اور استعاراتی اسلوب میں لکھا ہوا نہایت موثر افسانہ ہے۔ اس میں ایک طرف ظلم وتشدد کی تصویر کشی ہے تو دوسری طرف صبر وضبط کی فضا ہے اور درمیان میں احتجاج و انقلاب کی نئی کونپل پھوٹتی ہے جس میں آمریت کو شکست دینے کی قوت پروان چڑھتی ہے۔ فوجی حکمرانی جمہوریت کا گلہ گھونٹنے کے مواقع تلاش کرتی ہے مگر عوامی نمائندہ فن کار کی شکل میں تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ مرکزی کردار جو جمہوریت کا امین اور باشعور نیز نئی نسل کا نمائندہ ہے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ جابر نظام اس کی آواز دبا دینے کی ممکن کوشش کرتا ہے۔ پرانی پیڑھی جو ماں کی شکل میں سمجھوتے کی ڈگر پر چلتی رہی ہے وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی خاموش ہے تاہم بچہ جدو جہد کا علمبر دار بن کر ابھرتا ہے اور قاری محسوس کر لیتا ہے کہ اس انقلاب کو دبایا نہیں جا سکتا ہے جس نے مضبوط جڑ پکڑ لی ہے۔ انور سجاد نے سماجی اور سیاسی کشمکش کو مصور کی طرح رنگوں کی شکل میں کینوس پر بکھیر دیا ہے۔ ایک عکس گھر کے آنگن میں انقلاب کے بیج کے بونے کا ہے، جو کونپل کی شکل میں پھوٹ چکا ہے اور جس کی حفاظت طوفانی بارش میں ننھا بچہ بڑے اعتماد کے ساتھ کر رہا ہے۔ دوسرا عکس دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کا ہے جس میں چھپکلی پتنگے کو ہڑپنے کے لیے جنبش کرتی ہے اور تصویر ہل جاتی ہے۔ یہ واضح اشارہ ظلم و جبر کے نظام کے ڈانواڈول ہونے کا ہے۔ تیسرا عکس بے زبانی میں زبان یعنی آزادیٔ ابلاغ کا ہے، اور بے حد بھرپور اور توانا علامت کی شکل میں ہے۔ وہ تشدد کی تمام آزمائشوں میں اس حد تک کھرا اُترتا ہے کہ ظالم حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انور سجاد کے اس افسانہ میں ترقی پسند سوچ اور جدلیاتی زاویۂ نگاہ ہم آہنگ ہیں۔ تجرید اور علامت کے وسیلے سے موثر فضا خلق کی گئی ہے۔ اسی لیے تخریب و تعمیر کی کشاکش میں لپٹا ہوا یہ افسانہ انسانی امید کو کامرانی سے سرفراز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ 'کونپل' اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں انھوں نے مروجہ کرافٹ اسٹوری کو توڑتے ہوئے مصوری اور شاعری کے امتزاج سے ہیئت کو نئی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

''شہر افسوس'' بے حد وسیع کینوس پر پھیلا ہوا مربوط افسانہ ہے جو مشرقی اور مغربی

پاکستان کے حدود کو توڑتا ہوا بنی اسرائیل، 'گیا کے بھکشوؤں' اور بیگم حضرت محل کے نیپال کے گھنے جنگلوں کی ہجرت پر آہ وزاری کرتا ہے۔ پرانی زمین سے ناطہ توڑنے اور نئی زمین سے رشتہ جوڑنے کی کیفیت کو علامتی اور استعاراتی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کے تین زاویے ہیں۔ میدان، بستی اور شہر افسوس۔ ایک مقام کو دار الامان جان کر لوگ دور سے آئے اور بس گئے لیکن کیا وہ اس میں رچ بس گئے؟ اگر نہیں تو کیا اس وجہ سے کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی ہے؟ افسانہ نگار نے تین زاویوں سے ہجرت کے کرب کی روداد کے لیے تین کردار ڈھالے ہیں۔ یہ تینوں بے نام کردار متحرک ہیں مگر فہم اور شعور سے کوسوں دور۔ نیم مردہ حالت میں جائے اماں ڈھونڈتے ہوئے۔ تینوں اپنی شناخت، ناموں سے محروم، اپنے تشخص کی تلاش میں ہیں بلکہ زندہ لاشیں ہیں جو اپنے اپنے گناہوں کو اٹھائے بے سمت چلے جا رہے ہیں۔ پوری فضا ایک ایسے جہنم کی ہے جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے اور اس عالم میں ہر شخص جان کی اماں مانگتا پھر رہا ہے۔ بس بھاگ رہا ہے، اپنے آپ سے، اپنے وجود، اپنے سائے سے۔ یاس کے اس ماحول میں بے اعتمادی اور بے اعتباری کا دور دورہ ہے۔ تہذیب، تمدن، انسانیت، محبت، مروّت، قانون، نظم و ضبط سب نے اپنا وجود کھو دیا ہے۔ زماں و مکاں بکھر چکا ہے۔ جو ابھر رہا ہے وہ تخریبی عمل ہے ایسے میں کوئی بھاگتے وقت اپنے مرے باپ کی لاش بغیر تجہیز و تکفین کے چھوڑ کر آیا ہے تو کسی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بہن کی ساڑی کھولی ہے یا بوڑھے شخص نے بہو کو برہنہ کیا ہے۔ اعمال و افعال کا سلسلہ چلتا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کون کس کو برہنہ کر رہا ہے، یہ احساس مٹ جاتا ہے۔ پہلے آدمی نے جو عمل کسی کی بہن کے ساتھ کیا وہی عمل کسی کی بہو کے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھا۔ بہن کے بھائی نے وہی عمل اس کی معصوم بچی کے ساتھ کیا اور وہ تینوں یار زندہ رہا۔ انتقام جذبات کو سلب کر لیتا ہے، فہم سے محروم کر دیتا ہے۔ توہین اور ذلت تسکین کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ خود میں اور جانور میں فرق نہیں کر پاتا ہے۔ منطق اور فلسفے کی آمیزش اس وقت ابھرتی ہے جب کتا مالک کو اور بیوی شوہر کی آواز کو پہچاننے نہیں پاتی بلکہ ملامت شروع کر دیتی ہے تب دوسرا آدمی اعلان کرتا ہے کہ ہاں پہلا مر چکا ہے۔ اپنے ہی اعمال پر انسان تو گیا، جانور بھی اپنے مالک کو پہچاننے سے انکار کر دے تو اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو پھر زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے۔ ہیجانی کیفیت، عمل اور ردِ عمل کا

سلسلہ کہ اب ہمارے ساتھ وہ بچہ ہوگا جوان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ایسے میں جو منظر ابھرتے ہیں وہ شہر خرابی، حاملہ عورت، بھاگتے بھاگتے ایسے نرالے نگر میں پہنچا دیتے ہیں جہاں صرف لاشیں نظر آرہی ہیں یا گھروں میں مقید لوگ ـــــ درندگی، بربریت اور رشتوں کی برہنگی کے لرزہ خیز منظر پر بھی انسان زندہ رہا۔ عورت کی مظلومیت اور کسمپرسی پر بھی وہ مر نہیں سکا کہ ندامت کے احساس سے عاری ہو چکا تھا۔ زندگی کی چاہت اور اس کی للک میں وہ اس منزل سے گزر رہا تھا جہاں انسان پتھر کی طرح بے حس ہو جاتا ہے۔ انتظار حسین کے اس افسانہ میں خوف، حیرت، تحیر اور تجسس میں معنوی تواتر، موضوعی تسلسل اور علامتی ربط ہے۔

''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' نمائندہ علامتی افسانہ ہے جو کردار اور پلاٹ کے روایتی تصور سے آزاد ہے۔ اس میں علائم کی تہہ داری افسانہ کی فضا کو پُر اسرار بنا دیتی ہے۔ انسان کی اپنی ذات سے شروع ہونے والے سریندر پرکاش کے اس افسانہ میں فضا کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور پھر اس میں پوری کائنات سمٹ آتی ہے۔ فضا خوابناک بھی ہے اور پُر اسرار بھی۔ سب کچھ غیر متوقع طور پر شروع ہوتا ہے۔ بے ربط انداز میں یادوں کے دریچے کھلتے ہیں اور قاری خلاؤں میں پرواز کر جاتا ہے اور جب اس سحر زدہ ذہنی سفر سے باہر آتا ہے تو خود کو دوسرے آدمی کے ڈرائنگ روم میں پاتا ہے ـــــ بچپن، جوانی، گم ہونا، پاجانا، آرزوؤں کا دم توڑنا اور نئی آرزوؤں کا ابھرنا یہ سب انسان کے داخلی سفر سے خارجی سفر تک کا اظہار ہے جس میں تجریدی آرٹ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس سفر میں انسان کو قرار نہیں، اطمینان نہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ فن کاری یہ بھی ہے کہ استعمال ہونے والے تمام استعارے ایمائیت اور رمزیت سے مزین ہیں جیسے سمندر پھلانگ کر میدان عبور کرنا، بوجھل سر جھکائے پیچھے چلے آنا، تھوتھنیاں اٹھائے ہوئے دیکھنا، سر ہلا کر رفاقت کا اظہار کرنا، نیم تاریک کمرے میں سہما سہما صوفہ، دھنستا ہوا پاتال وغیرہ۔

''ماچس'' استفہامیہ انداز میں شروع ہونے والا بلراج مین را کا علامتی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسی طلب سے شروع ہوتا ہے جس میں معاشرے کا مسخ شدہ چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ بے نام مرکزی کردار کی اچانک رات کے دوسرے پہر میں آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ ماچس کی تلاش میں گھر کے باہر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ سگریٹ کی طلب میں ماچس کے حصول کے لیے اسے شدید سردی کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔ تلاش میں سرگرم، وقت سے بے خبر، بے سمت

بڑھتا چلا جاتا ہے اور جب وہ ایک مرمت شدہ پُل پر پہنچ کر سرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی لالٹین سے سگریٹ جلانے کی کوشش کرتا ہے تو سپاہی پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں قائم کیے گئے سوالات کے جو جوابات ملتے ہیں وہ سماجی حقیقت کو عیاں کرتے ہیں۔ دائروی شکل میں شروع ہونے والا یہ افسانہ آغاز سے انجام تک علامتی اور تجریدی انداز میں رچا بسا ہے۔ تنہائی، رات، اندھیرا وہ ذہنی سفر ہے جس میں انسان بڑھتا ہی چلا جائے مگر کنارہ نہیں ملتا ہے۔ تلاش وجستجو بے جان شئے کی ہی نہیں انسانی وجود کی بھی ہے جو برق رفتار زمانے میں غفلت کے سبب کھو گیا ہے۔ اسی لیے اشاروں اور کنایوں میں عصری حسیت اور انسانی فطرت و جبلت بھی سمٹ آئی ہے۔

جیلانی بانو کا افسانہ ''راستہ بند ہے'' ایک اطلاع سے شروع ہوتا ہے کہ راستہ بند ہے۔ یہ خبر بھی ہے، اعلان بھی اور تاسّف کا اظہار بھی۔ محلِ وقوع ایک چوراہا ہے۔ چوراہے کا انتخاب شاید اس لیے کیا گیا ہے کہ یہاں جمع ہونے والے مختلف طبقوں پر نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ مکالماتی پیرایہ میں لکھا گیا یہ افسانہ محض بچوں، نوجوانوں، بزرگوں اور بے سہارا افراد کے مسائل کو ہی منعکس نہیں کرتا بلکہ معاشرے کی صحت کے ضامن ستونوں کے کھوکھلے پن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ انداز طنز آمیز مگر اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ اس سادگی میں پُرکاری کے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے انسانی وجود کو مشین میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کے جذبات واحساسات ختم ہو چکے ہیں۔ آدمی آپس میں ایک دوسرے سے کاروباری انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ نئی نسل جو ترقی کی خواہاں ہے وہ خواہش اور کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکی ہے اور نہ ہی اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ منتخب کر سکی ہے۔ تاہم اسے اپنی صلاحیت اور اپنے مستقبل کے زیاں کا شدید احساس ہے۔ اسی کرب ناک کیفیت کو مصنفہ نے اجاگر کیا ہے۔

''دیوی'' ممتاز مفتی کا نہایت موثر نفسیاتی افسانہ ہے۔ موضوع، مواد اور تکنیک کے اعتبار سے 'دیوی' نے اردو افسانہ کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک نوعمر شادی شدہ لڑکی کی جوان دیور پر کاش میں دلچسپی کو موضوع بنا کر معاشرے پر طنز کیا ہے جس میں طے شدہ دائروں سے باہر نکلنا معیوب اور معتوب قرار دیا جاتا ہے۔ مرکزی قصے کو تقویت پہنچانے کے لیے حمیدہ اور غلام علی جیسے پختہ عمر کے افراد کی ذہنی کیفیت اور جنسی جبلّت کو بھی اس طرح اُجاگر کیا گیا ہے کہ مشرقی اور مغربی قدریں روبرو ہوتی ہیں۔ دراصل رشتوں کے پاس ولحاظ میں

خواہشات دب جاتی ہیں مگر مناسب محرک انھیں دوبارہ سطح شعور پر لے آتا ہے۔ اس نفسیاتی عمل میں حقیقت نگاری کے ساتھ فرد کے کچلے ہوئے احساسات بھی جلوہ گر ہیں۔ نفسیاتی گرہوں سے واقف ممتاز مفتی انسانی شعور کی پیچ در پیچ گتھیوں کی طرف قاری کو بہت آہستگی سے متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا انداز چونکا دینے والا ضرور ہے مگر ہیجانی نہیں۔ وہ عموماً شخصیت کے تمام منفی اور مثبت پہلوؤں کو سمیٹتے ہوئے محرومی، گھٹن، فطرت اور جبلت کو شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے نہاں خانوں سے جوڑتے ہیں۔

''پیتل کا گھنٹہ'' وقت کے جبر و ستم کا افسانہ ہے۔ فضا یہ تاثر دیتی ہے کہ رئیسانہ شان ختم ہو چکی ہے مگر رکھ رکھاؤ برقرار ہے۔ مثبت قدروں کا تحفظ ہو رہا ہے۔ قاضی عبدالستار نے ایک صدی کی روداد کو پانچ صفحہ میں نہایت موثر طریقے سے پیش کر دیا ہے اور یہ بھرپور تاثر ابھارا ہے کہ اب زمیندار محض ظالم نہیں ہے۔ حالات و حادثات کوئی بھی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ مہذب جاگیردار اپنی آن بان کو برقرار رکھنے کی ممکن جدو جہد کر رہا ہے، رواداری کو نباہ رہا ہے، مہمان نوازی کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ واحد متکلم کے توسط سے کرداروں کے حرکات و سکنات کا بیان ہے جس میں وہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے دخیل ہے۔ ایجاز و اختصار کے کمال کے ساتھ منطقی طور پر واقعات میں ربط اور تسلسل ہے۔ ماجرا سازی کا خاص اہتمام رکھا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مناظر میں معاشرت کی تہہ بہ تہہ جھلکیاں، ماضی اور حال کے مناظر فنکار کی فنی گرفت پر دال ہے۔ اسی لیے یہ افسانہ ایک مخصوص تہذیب میں اقدار کی شکست کے ساتھ نئے نظام کے نمود اور بدلتے ہوئے حالات سے پیدا شدہ بے اطمینانی اور ماضی کی بازیافت کا ترجمان بھی ہے۔

''شہرزاد'' نفسیاتی کہانی ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے خواتین کے حوالے سے جدید و قدیم نظام فکر کی کشمکش اور صارفیت کی چکا چوندھ پر سخت تنقید کی ہے۔ پس منظر بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی کا ہے۔ عراق ایک نئی کروٹ لیتا ہے۔ مغربی علوم وفنون، تہذیب وتمدن کو فروغ ملتا ہے۔ خوش حالی اور وسیع النظری کی بنا پر دور دراز کے فاصلے مٹتے ہیں۔ کرنل سیف اپنی روشن خیال بیگم کے ساتھ سرکاری دورے پر پاکستان آتے ہیں۔ بیگم پاکستان کی خواتین میں جلد ہی گھل مل جاتی ہیں اور محفل میں ہر روز نئے واقعات و حادثات کا انکشاف کرتی ہیں۔ موثر اندازِ بیان اور قصوں کی ندرت و جدت کی بدولت انھیں ''شہرزاد'' کے نام سے مخاطب کیا جانے لگتا ہے۔ شوہر کی

ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد وہ کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ بغداد واپس ہوتی ہیں مگر ایک انقلابی مہم میں کرنل سیف بلاک ہو جاتے ہیں۔ بلبل کی طرح چہکنے والی 'شہرزاد' جو اپنے وطن کے رنگا رنگ قصے سنانے میں کبھی بھی نہیں تھکتی تھی، گم صم ہو کر فریادی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

''خلیق الزماں کی ٹم ٹم'' اقبال مجید کا روایت سے الگ ہٹ کر افسانہ ہے جس میں تمثیل اور استعارے سے کام لیا گیا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی کشاکش پر مبنی بظاہر یہ افسانہ ایک بے جان شے پر مبنی ٹم ٹم کی کہانی ہے اور یہ کہانی تقسیم ہند کے ایک اہم رُخ کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ ذہن اپنے صحافتی شعور اور تحقیقی نظریے کی بدولت جذبات کو بھڑکانے والے کھیل کا منکر نظر آتا ہے کیوں کہ وہ ظاہری ہمدردی، محبت، مروت کی حقیقت کو محسوس کرتا ہے اور یہ حقائق اس کی تلخی اور ذہنی تناؤ میں اضافہ کرتے ہیں------ اقبال مجید نے بیسویں صدی کے سیاسی کھیل کو آدمی کے استعمال کی ایک شے ''ٹم ٹم'' کے ذریعے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ٹم ٹم چودھری خلیق الزماں کی ہو، ورثے میں ملی ہو یا کباڑ سے آئی ہو، اس کا مثبت رول سیاست دانوں کی پینترے بازی کی بنا پر ذہن سے اوجھل ہوتا گیا ہے۔ ماضی میں ٹم ٹم کی یہ حسین سواری جو مسافت طے کرنے اور منزل تک پہنچانے کا ذریعہ تھی، جلد ہی اقتدار کو حاصل کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس کے دونوں پہیے، پائیدان، کوچوان اور گدّی سب کے نقش و نگار عصرِ حاضر کی حکمتِ عملی اور سیاسی بازی گری کو اجاگر کرتے ہیں۔ افسانہ میں واقعات ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ شعور اور تحت الشعور کی آمیزش سے ابھرنے والے وہم، تذبذب، خوف اور حقیقت کے اظہار کے لیے اقبال مجید نے انوکھا انداز اور موثر اسلوب اختیار کیا ہے-----

''خلیق الزماں کی ٹم ٹم'' کے دونوں مرکزی کردار نسائی ہیں۔ ایک کا تعلق ہندوستانی صحافت سے ہے اور دوسرا پاکستانی صحافت سے منسلک ہے۔ یہ خواتین تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں جن کی گفتگو کا دائرہ ماضی اور حال کی نسائی لاچاری اور اُن کے مقام و مرتبہ پر منحصر ہے۔ دونوں کرداروں کی ذہنی صورتِ حال کا بیان داخلی خود کلامی، آزاد تلازمۂ خیال اور خطوط جیسی فنّی تدابیر کے تحت ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے تمثیلوں اور استعاروں کے ذریعے شخصیت پرستی اور عقیدت مندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سچائی کا مقابلہ کرنے کی جانب ذہن کو راغب کیا ہے۔ موضوع، اسلوب، ہئیت اور پیش کش کے اعتبار سے اقبال مجید کا یہ افسانہ نہایت فکر انگیز ہے۔

انیس رفیع کا افسانہ ''کرفیو سخت ہے'' جبر و استحصال کا تیزابی علامیہ ہے۔ پروفیسر

انجن سرکار کا کہنا ہے کہ ملبے سے نکل نکل کر باہر آنا نیستی سے ہستی کا باقی سفر ہے۔ دراصل یہ افسانہ اس قومی اقلیت کی حرماں نصیبی اور بیچارگی کا بیان ہے جو بطور فاتح جنوب مشرقی ایشیا کے اس جغرافیائی خطے میں وارد ہوئی تھی اور اسے اپنا وطن بنایا تھا۔ عدل و انصاف کی بنیادوں اور اپنی قوتِ ارادی کی بدولت وہ شہنشاہیت قائم کی جو سینکڑوں برس کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ وقت گزراں کے ساتھ شہنشاہیت، جدید شکل میں سامراجیت کے خلاف عالمی بیزاری اور بیداری نے اس حاکمانہ نظام کی چولیں ہلا دیں۔ جمہوریت اور عوامی حکومتوں کا ورود ہوا۔ برصغیر میں جمہوریت، آزادی اور حقوقِ انسانی، خون کی ہولی کھیلتے تمام تر عصبیتوں، مذہبی اور فرقہ وارانہ جبر اور ان کی بنیادوں پر زمین کے حصے بخرے کے ساتھ الگ الگ خطوں میں خیمہ زن ہوئے۔ ہر خیمے کے ناقابلِ حصول aspiration اور توقعات تھے۔ بندر بانٹ کے محافظوں نے تقسیم کے وقت جو ڈنڈیاں ماریں، اُن کے نتیجے میں کبھی حاکم اور با اقتدار رہے افراد کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ خوف و ہراس اُن کا مقدر بن گیا۔ اُن ایام سے لے کر آج تک اُن پر کرفیو جیسا جبر مسلط ہے۔ ماضی قریب میں ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کا واقعہ کرفیو کے مزید سخت ہونے کا احساس کراتا ہے۔ داہر اور قاسم دونوں تاریخی کردار ہیں، مختلف مذہب کے ماننے والے ہیں جن کا ذہن ایک سیکولر نظام، امن و آشتی کے تصور کے ساتھ پروان چڑھا ہے، مگر تاریخ کے اس موڑ پہ قاسم کو لگا یہ ساری قدریں جن کی ہم پاسداری کرتے رہے ہیں ایک التباس ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کرفیو کے نفاذ کے وقت جن کے ہاتھ اپنی زمین سے اوپر اٹھ گئے اب نیچے آکر اپنی اس زمین کو نہ چھو سکیں گے۔ وہ خود کو ایک ایسی جماعت کا فرد محسوس کر رہا ہے جو خلا میں معلق ہے۔ افسانہ زمین اور انسان کی شکست و ریخت یعنی ریزہ کاری کا حصہ ہے۔ اسی وصف کی بنا پر یہ افسانہ ایک تمثیل بن گیا ہے۔

سلام بن رزاق کے افسانہ ''ایک جھوٹی / سچی کہانی''میں راوی کی مداخلت یوں ہے کہ وہ ٹی وی دیکھتا ہے اور خبریں سن کر اسے لگتا ہے جیسے پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے۔ اس کا بچہ اسے کہانی سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ پہلے تو وہ منع کرتا ہے مگر بچے کے اصرار پر کہانی سناتا ہے۔ آغازِ قصہ سے ہی وقت کی طنابیں کھنچتی ہیں۔ ماضی بعید میں جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ محبت اور اتحاد تھا، آسودگی اور خوش حالی تھی۔ اشرف المخلوقات کے ساتھ اس بستی میں ایک پری بھی براجمان تھی اور بہت خوش تھی۔ مگر پھر کیا ہوا کہ بستی کے لوگوں کی نیتوں میں کھوٹ آگیا، برکتیں اٹھ گئیں۔ لالچ اور خود غرضی کا زہر فضا میں گھل گیا۔ تقسیم اس طرح ہوئی

کہ عبادت گاہیں بھی بٹ گئیں۔ قید و بند اور افراتفری نے فنونِ لطیفہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ بس ہر وقت ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے، اذیت دینے، تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بننے لگے۔ پری بہت دکھی ہوگئی۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر بستی والوں کو کیا ہوگیا ہے۔ کیوں وہ ایک دوسرے کے اس حد تک دشمن ہو گئے ہیں۔ چوری، دھوکہ، فریب، لوٹ مار، قتل و غارت گری ان کا معمول کیوں بن گیا ہے۔ معصوم انسانوں کے لیے روز بروز یہ زمین تنگ کیوں ہوتی جا رہی ہے —— اور پھر اچانک ایک دن فضا میں پری کا نغمہ گونجا، لوگوں کے اندر سلگتی ہوئی آگ اور کدورت ختم ہوتی گئی۔ وہ آستینوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے لگ گئے۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں اس پری کا مجسمہ تیار کیا اور جب بھی کوئی تنازعہ ہوتا سب وہیں جاتے، اس گیت کو دُہراتے اور مطمئن ہو جاتے۔ آج بھی وہاں کے لوگ اس گیت کی بدولت امن و چین سے زندگی گزار رہے ہیں۔ افسانے کے اس انجام پر بچہ سوال کرتا ہے کہ وہ گیت کیا تھا؟ راوی یہ کہہ کر کہ مجھے وہ گیت یاد نہیں کیوں کہ میرے پاپا اور ان کے پاپا کو بھی یہ گیت یاد نہیں تھا۔ تاہم بچہ مطمئن نہیں ہوتا ہے اور یہی بے اطمینانی دراصل نئی نسل کو ہیجان میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ بستی کی کہانی صرف ہمارے معاشرے کی کہانی نہیں بلکہ پوری انسانی برادری کی کہانی ہے۔ ایسے میں ضرورت اس گیت کی ہے جس کے ذریعے آپس کی کدورت اور نفرت کو محبت میں تبدیل کیا جا سکے۔ قاری بھی سوچنے پر مجبور ہے کہ وہ گیت کب یاد آئے گا؟

''مٹی دادا'' بظاہر ایک کردار پر مبنی نہایت موثر افسانہ ہے۔ نقلِ مکانی کے سبب بچھڑنے کا غم، کھو جانے کی کسک اور گلے لگانے کی تڑپ پر اسد محمد خاں نے کئی افسانے خلق کیے ہیں۔ انھوں نے وندھیاچل کی آتما میں اُتر کر یا پھر نربدا کے کنارے بیٹھ کر فن کارانہ ڈھنگ سے جو قلمی تصویریں بنائی ہیں ان میں ہجرت کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ ان رنگا رنگ تصویروں کے ذریعے اسد محمد خاں نے اساطیر اور علامتوں کو نئے معنوں سے ہم آہنگ کر کے ہمارے دور کی داستان پینٹ کی ہے۔ یہ چلتی پھرتی تصویروں کی شکل میں قاری کے رو برو ہی نہیں ہوتی بلکہ ان سے مکالمہ بھی قائم کرتی ہیں۔ تاریخ کے جبر پر محیط افسانہ ''مٹی دادا'' میں اسد محمد خاں نے نہایت ہنرمندی سے ایک کردار کو اس طرح خلق کیا ہے کہ اس کے توسط سے نہ صرف ریاستوں کا کرّوفر، عروج و زوال سے قاری واقف ہوتا ہے بلکہ قبائلی زندگی کے آداب، رسم و رواج اور وضع داریاں بھی اس پر پوری طرح عیاں ہوتی ہیں۔ وہ پٹھان ہے کہ غیر پٹھان،

ہندو ہے کہ مسلمان، یہ تاثر نہ اُبھر کر تہذیبی اقدار بالکل منفرد انداز میں سامنے ہوتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ خون کے رشتے سے زیادہ اہم چاہت کے رشتے ہیں۔ پاس ولحاظ رواداری کو فروغ دیتا ہے۔ آن بان شان کی اہمیت خلوص ومحبت اور وفاداری کے آگے کچھ نہیں۔ مٹی دادا کے روبرو رنگ، نسل، زبان ہی نہیں بلکہ مذہب کا امتیاز بھی کھوکھلا ثابت ہوتا ہے وہ عبدالمجید خاں یوسف زئی تھا کہ نہیں اس کی تخصیص وتمیز مٹ جاتی ہے کہ اس نے جس فضا اور ماحول میں آنکھ کھولی، پروان چڑھا، اسی میں گھل مل گیا۔ اس حد تک کہ اس سے الگ ہٹ کر اس کا کوئی وجود، شناخت نہیں۔ افسانہ یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب ہے کہ خلوص اور نیک نیتی کے سامنے ذات، رنگ، نسل، زبان سب بے معنی ہیں۔ قوموں کا، اقتدار کا، جاہ ومنصب کا زوال آتا ہے، انسانی جسم کا بھی لیکن اپنائیت اور محبت کا زوال کبھی نہیں۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت مٹی دادا ہیں۔

''گنبد کے کبوتر'' میں تعبیر کی کئی جہتیں ہیں ہر جہت اپنی الگ معنویت رکھتی ہے۔ تہہ دار کہانی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ امکانات کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا جا سکے، معنویت میں اضافے کیے جاسکیں۔ شوکت حیات کی اس تہہ دار کہانی میں تعبیر کے امکانات کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے تفہیم سے جڑا ہوا ہے۔ کہانی میں کسی بھی واقعے کا ذکر ہو، مرکزی واقعہ کسی بدلی ہوئی شکل میں حاوی رہتا ہے۔ اس لیے یہ کہانی روایت کے مسمار ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ گنبد قدیم تہذیب کا استعارہ ہے اور اس تہذیب کے مسمار ہونے سے جسے تکلیف پہنچتی ہے وہ کبوتر ہے۔ اس سے اس کی جائے پناہ چھن گئی ہے۔ کبوتر کی طرح راوی بھی لاوارث ہو گیا ہے۔ وہ اپنے مسکن، اپنی تہذیب کی حفاظت نہیں کر سکا ہے جس کے تحفظ کی ذمہ داری اس پر تھی۔ اس تصور کی ہوئی ذمہ داری کی کشمکش کو افسانہ نگار نے Foreshadowing کے سہارے اجاگر کیا ہے۔ عکس احساس دلاتے ہیں بغض ونفرت، تعصب وتنگ نظری اور امن و محبت، انسانیت وشرافت کے۔ مختلف توجیہات کے پیش نظر یہ کہانی داخلی زندگی پر خارجی اثرات کی نمایاں مثال ہے۔ شوکت حیات نے پورے اعتماد اور آگہی سے فرد اور معاشرے کے مظاہر کو خوبصورت اشاروں میں متشکل کیا ہے۔ اسی لیے 'گنبد کے کبوتر' میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور منظری ربط بھی موجود ہے۔

''گم شدہ کلمات'' ماضی کی عظمت اور حال کی زبوں حالی کا ترجمان ہے۔ مرزا حامد بیگ

نے لفظ کی ہمہ جہتی اور معنویت تک اپنی ذات کے حوالے سے رسائی حاصل کی ہے۔ یہ ذات ان کے دیگر افسانوں کی زیریں سطح پر ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اس افسانے میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ انسانی اقدار کی گمشدگی کا ذکر کرتے ہوئے ذات کو بالائی طبقے کے ظلم سے علیحدہ کر لیتے ہیں اور بظاہر سامنے کے واقعے کو پیش کرنے کا جتن کرتے ہیں مگر اس جتن میں پلاٹ کی بُنت اور جزیات نگاری پر خصوصی توجہ ہوتی ہے۔ ان کے اسٹائل میں علامتی و تجریدی انداز بھی شامل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے انھوں نے افسانے کے ماحول کو، اور ابھرنے والی پوری فضا کو پُر اسرار بنا دیا ہے۔ دراصل ''گم شدہ کلمات'' میں عہد مغلیہ کے زوال کی تصویر کا ایک منظر نامہ ابھارا گیا ہے۔ افسانے کے دو خاص کردار ہیں، مرزا بہادر اور نی کے کا کا۔ پہلے نے عروج و زوال کی کہانی سنی ہے، دوسرا چشم دید گواہ ہے۔ کینوس صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ افسانی ماضی کے دریچوں سے گزرتا ہوا رعب وداب، عیش وعشرت کی عبرت انگیز تصویر پیش کرتا ہے۔ علاقائی لب ولہجہ، محاورے اور اشارے بیانیے کی جان ہیں۔ 'فیکا' جس کی پہچان باپ کے حوالے سے نہیں، ماں کی نسبت سے ہے۔ شناخت اور بے شناختی کے لیے، حاکم اور محکوم کی نفسیات کو اُجاگر کرنے کے لیے جزئیات نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس انوکھے افسانے کا آغاز بھی بہت دلچسپ ہے کہ مرزا بہادر اپنی بڑی حویلی میں چہار بیتے سننا چاہتے ہیں۔ فیکے کا کا کو باعزت طریقے سے طلب کیا جاتا ہے۔ یادِ ماضی کے منظر بدلتے ہیں اور نظریں فیکا اور اس کی ماں پر ٹھہر جاتی ہیں۔ فیکا اس اعتراف کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ دراز کرتا ہے کہ عیش باغ کی تمام گمنام راہ داریوں سے تو وہ خود بھی واقف نہیں البتہ ان میں سے ایک گمنام راہ داری سے اس کا اپنا وجود وابستہ ہے۔ وہ پیدا ہوا، پروان چڑھا۔ ماں اور بیٹے کی شکل میں دونوں کی بدبختی کے سائے بڑھتے ہی گئے۔ افسانہ نگار نے یہ مناظر اس زاویے سے، شدت کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ قاری تباہی و بربادی کے بنیادی سبب کو محسوس کر لیتا ہے اور گم شدہ کلمات کی یہ روداد ایک عہد کے زوال کی کہانی بن جاتی ہے۔

زاہدہ حنا کا معروف افسانہ ''گم گم بہت آرام سے ہے'' میں تین ادوار کا ذکر ہے۔ پہلے دور میں رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور کہانی ''کابلی والا'' کا براہِ راست تفصیلی اور بامعنی ذکر ہے۔ عہد غلامی میں افغانستان کا پٹھان، رحمت اپنوں سے جدا ہو کر تلاشِ معاش کے لیے کلکتہ آتا ہے اور زحمتوں میں پھنس جاتا ہے تاہم منّی اسے اپنی بیٹی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ دوسرا دور

تبدیلیوں کا ہے۔ خصوصاً ایشیا کا بدلتا ہوا منظر نامہ۔ زاہدہ حنا نے اس کا براہِ راست ذکر نہیں کیا ہے مگر بالواسطہ طور پر ''کابلی والا'' کے کردار کی توسیع بھی محسوس ہوتی ہے (مشہور افسانہ نگار انور قمر نے ''کابلی والے کی واپسی'' میں اس کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہوئے محسوسات و جذبات کو اجاگر کیا ہے)۔ پس منظر سے باہر آئیں تو اب وہ رحمت ہی نہیں افغانستان بھی بدل چکا ہے۔ قدریں چرمرا چکی ہیں۔ وحشت اور بربریت کا دور دورہ ہے۔ زاہدہ حنا نے رحمت یعنی ''کابلی والا'' کے توسط سے تمام تانے بانے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے بنے ہیں۔ پوری کہانی ایک طویل خط کی شکل میں ہے۔ ماضی بعید کی شرمیلی اور بھولی بھالی منّی کو عصرِ حاضر کی حساس اور باشعور ڈاکٹر تسلی اور تشفی دیتی ہے۔ وہ امریکی بمباری سے تباہ حال معصوم شہریوں کا علاج کرتی ہے، ان کے لیے مسیحا ثابت ہوتی ہے۔ مگر 'بامیان' میں برپا تشدد کو عدمِ تشدد کا جامہ پہنانے کی ممکنہ کوشش کرتی ہے۔ وہ امن کے ستون کے گرد برپا قہر کے جواز تلاش کرتے ہوئے ایثار و محبت اور امن و انسانیت کے جذبے کو تقویت پہنچاتی ہے، اس اعلان کے ساتھ کہ گُم گُم بہت آرام سے ہے!! زاہدہ حنا نے ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے سیاسی اور سماجی بحران کو تہذیبی زوال کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وجودی طرز کا احساس بھی ان کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اس وجودی فلسفے کو انھوں نے صرف ذہنی سطح پر نہیں اپنایا ہے بلکہ ان کے بیشتر کرداروں میں زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ ان کا تخلیقی رویہ عصری شعور اور رومانیت سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے کردار نوسٹیلجیا سے غذا حاصل کرتے ہیں، ان معنوں میں کہ وہ صرف برِ صغیر ہند و پاک نہیں بلکہ افغانستان، ایران، عراق، تیسری دنیا کا درد اپنی کہانیوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ ''گُم گُم بہت آرام سے ہے'' اس کا نادر نمونہ ہے۔

''ایک عام آدمی کا خواب'' گہری معنویت کا افسانہ ہے۔ رشید امجد نے استعارات اور علامات کے سہارے اس کے تانے بانے بنے ہیں۔ برق رفتار زندگی میں ایک عام شخص کی انگلیاں اپنے اُس چینل کو تلاش کرتے ہوئے شل ہو چکی ہیں جس کا وہ متلاشی ہے۔ اسی طرح اس کی آنکھیں ایک مخصوص خبر کو تلاش کرتے ہوئے پتھرا گئی ہیں۔ آغاز سے ہی اس قسم کے سوالات قائم کیے گئے ہیں جیسے تفریحی پروگرام کی بہتات میں ذہنی، قلبی اور روحانی سکون کی تلاش کیوں نہیں؟ نئی نسل کو قتل و غارت گری، وحشت اور بربریت سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کیا قدروں کا زوال ہو چکا ہے؟ رواداری، محبت اور مساوات کا سبق پرانا ہو چکا ہے؟ عام آدمی یہ

سوچتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ منظر بدلتا ہے۔ نئے منظر میں اس کی مدد کے لیے اللہ بخش موجود ہے۔ جو کام اشرف المخلوقات کو کرنے چاہئیں وہ مافوق الفطرت کردار، اللہ بخش کرنے کا تہیہ کرتا ہے۔ جن کی شکل میں نمودار ہونے والا کردار دنیاوی نظام کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر توجہ دیتا ہے۔ اصول و ضوابط پر عمل کرنے کے لیے سمجھاتا ہے، ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے، سزائیں دیتا ہے اور ایک دن تھک ہار کر اعلان کرتا ہے کہ ''آقا! یہاں ہر چیز الٹی ہے، میں انھیں سیدھا نہیں کر سکتا۔'' راوی بے بسی کے عالم میں کہتا ہے کہ اللہ بخش میرے پاس تو اب صرف خواب ہی رہ گئے ہیں، کم از کم میرے خوابوں کو ہی ٹھیک کر دو! نہیں آقا! جب خوابوں سے بھی لذت چلی جائے اور ان میں دن کی اذیت ناکی شامل ہو جائے تو خواب بھی ذہنی روگ بن جاتے ہیں۔ راوی کے ساتھ قاری بھی سوچنے لگتا ہے کہ شاید خود پر مسلط کی ہوئی ان مصیبتوں کا کوئی حل نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خود ہماری پیدا کردہ ہیں۔ اور اس لیے ہم ہی ان کے ذمہ دار ہیں۔ رشید امجد نے راوی اور جن، خواب اور خیال کے سہارے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اگر روبوٹ بن کر رہ گیا تو رشتوں کی معنویت، ان کا پاس ولحاظ اور مستقبل کی سمت و رفتار کیا ہوگی؟

''بادِ صبا کا انتظار'' کی بُنت میں واقعات اور کرداروں کے عمل اور ان کے مکالموں میں مکانی اور زمانی ربط نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں وقت کی طنابیں پھیلتی اور سکڑتی ہیں۔ اس پورے فکری اور فنی نظام میں قاری اگر تاریخی حقائق پر نظر رکھتے ہوئے ذہن کے دریچوں کو وا کرے تو پھر اسے انتشار اور بے ربطی میں گہرا ربط اور نظم دکھائی دے گا اور چھپی ہوئی تہہ در تہہ حقیقتوں کا علم ہوگا۔ سید محمد اشرف کے اس افسانہ میں ہمیں ایک ایسی مریضہ نظر آتی ہے جو بند کمرے میں گھٹن میں مبتلا ہے۔ جس کی وجہ سے تلملاتی ہے البتہ شام کو جب ایک جانب کی کھڑکی کھلتی ہے اور اس سے تازہ ہوا اندر داخل ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے راحت محسوس کرتی ہے۔ اس تبدیلی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مشورہ دیتا ہے کہ اگر چاروں طرف کی کھڑکیاں کھول دی جائیں تو تازہ ہوا سے یہ جلد صحت یاب ہو جائے گی۔ بظاہر اس سیدھے سادے افسانے میں ڈاکٹر مریضہ کا واحد علاج کھلی فضا بتاتا ہے کیوں کہ بادِ صبا تمام مخلوقات کو راحت، فرحت اور نئی زندگی بخشنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اس افسانے کی باطنی تہوں کو ٹٹولا جائے تو یہ بالواسطہ طور پر اردو زبان کی تاریخ کا تاریخی سفر نظر آتا ہے۔ جس کے گرد تنگ نظری کے دائرے سخت ہوتے

نظر آتے ہیں اور یہ زبان جو کل ہر ہندوستانی کو محبوب تھی، ڈر اور سہم کر مریضہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ افسانہ میں غیر ضروری بیان سے ممکن حد تک گریز برتا گیا ہے اس حد تک کہ ہزار سالہ داستان چودہ صفات میں سما گئی ہے۔ مصنف نے ''بادِ صبا'' کو استعارے کے طور پر استعمال کر کے نہ صرف اُسے تہذیب و ثقافت اور زبان کا اہم جز بتایا ہے بلکہ بڑے فنکارانہ طور سے یہ احساس بھی دلایا ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اس نئے ہزاریے میں ہمیں اپنے ادبی اور تہذیبی رویوں پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا، تعصب اور تنگ نظری کے بنائے ہوئے بدنما اور بے بنیاد سانچوں کو توڑنا ہوگا جو ہماری فکری آزادی میں مانع ہیں تبھی ہماری لسانی اور تہذیبی وراثت کا تحفظ ممکن ہے۔ افسانہ کی زیریں لہروں سے اُبھرنے والا یہ تاثر قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اگر زبان کو محدود کیا گیا یا اس کو کھلی ہوا سے محروم رکھا گیا تو یہ بسترِ مرگ پر حسین و جمیل خاتون کی مانند ہوگا۔ اس طرح افسانہ کا رجائی پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مصنف نے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی شکل میں مریضہ یعنی اردو زبان و ثقافت کے مرض کی نہ صرف تشخیص کر دی ہے بلکہ اس کے اسباب بھی بتا دیے ہیں اور فیصلہ اُن کے لواحقین اور ورثاء پر چھوڑ دیا ہے۔ سید محمد اشرف نے مریضہ کے بیان میں ایسا رمزی اور تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو اردو زبان کے مختلف نقش و نگار کو بطریقِ احسن اُجاگر کرتا ہے۔

''باغ کا دروازہ'' فوک ٹیلز (Folk Tales) کی تکنیک پر لکھا گیا طارق چھتاری کا منفرد افسانہ ہے۔ اسلوب، زبان اور بیان بھی کچھ داستان کی طرز کا ہے۔ یعنی سننے اور سنانے والے دونوں موجود ہیں۔ اس میں تحیّر ہے، تجسس ہے اور نجات دہندہ بھی۔ فرق بس اتنا ہے کہ اب اس نجات دہندہ کو کوئی دیکھ نہیں پاتا ہے اور وہ اس لیے کہ اب مسائل کے حل کا طریقۂ کار بدل چکا ہے۔ اسی لیے راوی کا رویہ بھی بدلا ہوا ہے۔ وہ دادی سے قصہ سُننا نہیں، اپنی آنکھوں سے قصہ دیکھنا چاہتا ہے، معاصر منظر نامہ میں شریک ہونا چاہتا ہے، اس کا ایک حصہ بننا چاہتا ہے۔ موضوعِ فکر کے اعتبار سے افسانہ یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بدلتے ہوئے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تدبیر سے کام لینا چاہیے اور ہر حالت میں اپنے دل و ذہن کے دروازے کھلے رکھنا چاہئیں کہ اس برق رفتار زمانے میں یکساں حالت میں رہنا بھی تنزلی کی علامت ہے۔ اب تعمیرِ نو کے لیے قوتِ بازو اور بلّم بھالے کی جگہ ذہن اور قلم کو حاصل ہو چکی ہے اس لیے ایسی نسل کو پروان چڑھایا جائے جو قلم کی طاقت اور اس کے صحیح

استعمال سے بخوبی واقف ہو۔ جو آج بھی ماضی میں جی رہے ہیں، اور شیخ چلی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ دادی جان کی طرح خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور جو نوروز کی طرح بیدار ہیں، زمانے کو مٹھی میں کیے ہوئے ہیں۔

''بادِ صبا کا انتظار'' کی طرح مذکورہ افسانہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب جب خیالات و نظریات میں وسعت آئی ہے تو خارجی طور پر اشیاء کی شکل میں اور داخلی طور پر علوم وفنون کی صورت میں ترقی کی راہیں روشن ہوئی ہیں۔ لوک کہانی کی روایت کے ذریعے افسانہ نگار نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب جب آنے والوں نے اس سرزمین کو اپنایا اور اس کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیا تو اس دھرتی کے باسیوں نے بھی وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خواہ وہ دراوڑ ہوں، آریائی ہوں، مسلمان ہوں یا انگریز۔ سمندر کے راستوں سے آئے ہوں، درۂ خیبر سے، ہمالیہ کی وادیوں سے یا کوہ قاف کے راستے سے۔ ان آنے والوں نے بھی اس باغ کو سجانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے اور اس کو سرسبز وشاداب بنایا ہے۔ طارق چھتاری نے نوکِ قلم سے ہندوستان کی ہزار سالہ تہذیب کو استعاراتی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ تہذیب مختلف قوموں، نسلوں اور لسانی رشتوں کی ہے۔ جن کی ملی جلی شکل نے ایک سرسبز وشاداب باغ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اختتام پر پہنچتے پہنچتے قاری کو احساس ہو جاتا ہے کہ اس کہانی کا موضوع تنگ نظری پر طنز اور کشادہ دلی کا استقبال ہے۔

غضنفر کا افسانہ ''کڑوا تیل'' تھیم اور برتاؤ کے اعتبار سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ اس کا موضوع بظاہر معاشرے میں جاری استحصال ہے۔ صدیوں سے جاری حاکم ومحکوم کی روداد تو بہتوں نے بیان کی ہے مگر جانوروں کے استحصال کو انسانی صورتِ حال سے مربوط کرنا اور جانور کو انسانی خود غرضی کی ازلی تمثیل بنا دینا اس افسانہ کا خاص وصف ہے۔ پلاٹ نہایت مربوط، گٹھا ہوا ہے۔ راوی تلہن کا تیل نکلوانے کے لیے شاہ جی کے کولھو پر اپنی باری کے انتظار میں بیٹھا ہوا، پورے عمل کا بغور مشاہدہ کر رہا ہے نیز اپنے جذبات واحساسات سے قاری کو بھی آگاہ کراتا ہے۔ کرداروں میں بیل، بچھڑا، شاہ جی اور راوی ہیں۔ بے جان شے، تلہن کو بھی غضنفر نے جاندار قالب عطا کیا ہے۔ سرسوں اپنے وجود کو کھو کر، انسانوں کو فیضیاب کرتی ہے اور سنہری رنگت میں تبدیل ہو کر ایسی چمکدار بوندوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے تازگی، فرحت اور صحت کا تصور ابھرتا ہے۔ فضا اور ماحول میں اندھیرے اور روشنی کے امتزاج سے

ابھرنے والی وہ سنہری کرن ہے جو اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ اسلوب عام فہم ہے جس میں صوتی آہنگ کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ لفظی تلازمۂ خیال نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ افسانہ کا بنیادی وصف تضاد ہے، ایسا تضاد جس میں کشاکش بھی ہے اور عمل بھی۔ ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم۔ ایک ادنیٰ ہے، دوسرا اعلیٰ۔ ایک بے زبان مخلوق ہے، دوسرا اشرف المخلوقات۔ صورتِ حال سے سبھی واقف ہیں تاہم بے زبان کی پیٹھ پر شاہ جی کے پڑتے ہوئے سونٹوں کی سڑاک سڑاک سے صرف راوی ہی بے چین ہوتا ہے، دوسرے موجود لوگ، گاہک کیوں نہیں؟ قاری کے ذہن میں ابھرتے ہوئے یہ سوالات کہ حاکم کے حکم پر چلنے والا بیل زخمی کیوں ہے؟ اشاروں پر عمل کرنے والے کی آنکھوں پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟؟ طویل مسافت بھی اسے ایک دائرے میں محدود کیے ہوئے ہے۔ بچتے ہونے پر بھی پورے جسم پر چابک کے نشان دراصل فطرت اور جبلت کی نشاندہی کرتے ہیں اور انسانی سرشت میں مضمر استحصال کرنے کی ازلی خواہش کو آشکارا کرتے ہیں ـــــ جدّت یہ ہے کہ غضنفر نے رائج بے جان مشین کو ایک جاندار شبیہہ میں پیش کیا ہے جو ماضی کے جبر کی یاد ہی نہیں دلاتا ہے بلکہ مستقبل کی تعبیر بھی، بچھڑے کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ بوڑھا بیل شاہ جی کو ہی نہیں اوروں کو بھی فیضیاب کر رہا ہے مگر اس کا پیٹ دونوں طرف سے دھنس گیا ہے۔ وہ اپنی محنت و مشقت سے سرسوں کے دانوں کو روغن میں بدل رہا ہے جس کے عمل کو دیکھ کر راوی کا چہرہ روشن ہو رہا ہے مگر اس کی اپنی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے ـــــ ایسا ممتحن جس سے امرت دوسروں کو مل رہا ہو مگر خود کو زہر پینا پڑ رہا ہو!! زندگی کی مٹھاس سے دور، کھلی فضا سے محروم کر دیا جانے والا بیل شاہ جی کی کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے۔ راوی سب کچھ ہمدردانہ طور پر محسوس کرتا ہے مگر Irony یہ ہے کہ وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ نظام کی تبدیلی اس کے دائرۂ کار میں نہیں ہے۔

''دامِ وحشت'' اپنی بنیاد میں احساسِ جلال و جمال کا افسانہ ہے۔ اس کی ہیئت میں بیانیہ، پلاٹ، کردار اور بیان کے تسلسل کو امکانی اور جمالیاتی اظہار کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ مبین مرزا کے اکثر افسانے اسی طرز پر ہیں جو اپنی تخلیقی بصیرت کی بھرپور نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اسلوب کی رنگا رنگی اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔ جس سے پیرایۂ اظہار میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع کے ساتھ ساتھ زندگی کا سا پھیلاؤ ہے جس کی وسعت میں عصرِ حاضر مختلف زاویوں سے جلوہ گر ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اب سے چار

دھائی قبل تہذیبیں، ثقافتیں اور قومیں اپنی انفرادیت کے نقوش کو اپنی الگ شناخت کا ذریعہ گردانتی اور ان پر نازاں رہتی تھیں لیکن عالمی بازار اور صارفیت کی چکا چوند نے تہذیبوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ مبین مرزا نے اس برق رفتار صورتِ حال کے تحت مذکورہ افسانے کے تانے بانے بُنے ہیں اور اشاروں اشاروں میں قاری کو شیخ سخاوت علی کی ذہنی کیفیات اور خدشات سے آگاہ کرایا ہے۔ آنکھوں میں پھرتے مناظر اور کانوں میں پڑتی آوازوں کے توسط سے مبین مرزا نے امریکہ میں گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ ٹاور کے واقعہ کے بعد عالمی سطح پر جو بدلاؤ آیا ہے اس کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ پس منظر میں مرکزی کردار کی بیوی ہے جو ڈیڑھ سال پہلے اپنے بھائی کے پاس تیسرے بچے کی ولادت سے چار مہینے پہلے امریکہ چلی گئی تھی۔ پیش منظر کراچی کے حوالے سے پاکستان کی موجودہ صورتِ حال، عبادت گھروں اور امام بارگاہوں میں بم دھماکوں، خودکش حملوں کا ہے۔ جہاں مسجد کے دروازوں پر گارڈ اور بم ڈسپوزل اسکواڈ کے لوگ تعینات رہتے ہیں۔ شیخ سخاوت علی کی جمعہ کے خطبے کے دوران مشکوک آدمی پر نظر پڑتی ہے، خدشات دل دوز مناظر کی شکل اختیار کرتے ہیں مگر وہ انھیں جھٹکتا ہے۔ تجسس اور تحیر بڑھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ معاملے کی سنگینی کے بارے میں کسے بتائے! کہیں یہ وہم نہ ہو! تذبذب کی کیفیت، ذلت اور شرمساری کا احساس قاری کو پاکستان کی موجودہ صورتِ حال سے پوری طرح واقف کرا دیتا ہے۔

ترنم ریاض اپنے موضوعات عام زندگی سے چُنتی ہیں۔ ان کے ہاں علامتیں ان کی فکری زمین سے پھوٹتی ہیں۔ وہ افسانہ کی بُنت میں فضا اور ماحول سے بھی علامتیں یا اشارے اکٹھا کرتی ہیں۔ کبھی ایک مصور کی طرح کہانی کے کینوس پر مختلف رنگوں کے ذریعے مختلف شیڈس اُبھارتی ہوئی نظر آتی ہیں تو کبھی سنگ تراش کی طرح مجسموں کی رگوں میں خون کی روانی اور حرارت شامل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ''مجسمہ'' ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں بظاہر میوزیم کا تفصیلی ذکر ہے جہاں ماضی کی چیزوں کو سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ افسانہ نگار اشاروں اشاروں میں بتاتا ہے کہ اگر ان تاریخی چیزوں کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو تو وہ رفتہ رفتہ تباہ ہونے لگتی ہیں اور یہیں سے کہانی کے زاویے بدلنے شروع ہوتے ہیں۔ اس کا مرکزی کردار عظمیٰ ہے جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لیے اس خطے کی سیر کو جاتی ہے جہاں اس کا بچپن گزرا، تعلیم و تربیت ہوئی۔ جانے سے پہلے وہ وہاں کی شفاف جھیلوں،

خوبصورت باغوں اور پارکوں کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ کتنی یادیں وابستہ تھیں ان جھیلوں کے ساتھ۔ اس کا بچپن، ابو، امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ میلے کا سماں، مقامی لوگوں سے لدی کشتیاں، ملکی اور غیر ملکی سیاح، جذبوں کی فراوانی سے معمور منظر اور پس منظر میں لپٹی ہوئی یہ کہانی قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کشمیر کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔اور یہ بگڑی ہوئی صورتِ حال کیا سدھر نہیں سکتی؟ دائروی شکل میں شروع ہونے والی حیرت واستعجاب سے ابھری ہوئی یہ کہانی پہلے سرے سے چل کر آخری سرے پر بآسانی مل جاتی ہے اور قاری کو حیرتوں کی دنیا میں ڈھکیل دیتی ہے۔دراصل اس اشاراتی کہانی میں بیانیہ کو توڑتے ہوئے وقت کے بہاؤ کو تیزی سے بدلا گیا ہے۔اس کا پلاٹ بظاہر سیدھا سادا اور مختصر معلوم ہوتا ہے۔یعنی مجسمہ کا حرکت میں آنا اور کرداروں کو خوف وہراس میں مبتلا کر دینا، فاصلہ عجائب خانے کے ہال اور برآمدے کے درمیان کا ہے مگر ترنم ریاض نے اس محدود پلاٹ کو ارتسامات خیال اور بازآفرینیوں کے ذریعے اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وادیٔ کشمیر کا پورا منظر نامہ قاری کے سامنے آ جاتا ہے اور پھر ایک ایک کر کے اس پر سب کچھ منکشف ہوتا چلا جاتا ہے۔

(۳)

اس تفصیلی گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ اردو افسانے کی بُنت کسی حتمی تکنیک کی محتاج نہیں رہی تاہم تکنیک کے تجربات پریم چند کے عہد سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ پرانی روایات تبدیل ہوتی رہیں اور نئی روایتوں نے جلد ہی ان کی جگہ حاصل کر لی۔ پلاٹ پر زور دینے والے افسانے ہوں یا کردار پر۔وجودی ہوں یا تجریدی، اپنے اپنے عہد میں مقبول رہے ہیں۔اگر حقیقت نگاری کے تناظر میں دیکھیں تو سادہ وسماجی، اشتراکی وطبقاتی، نفسیاتی وجنسی، رومانی و علامتی، حقیقت نگاری منظر نامہ پر چھائی رہی ہے۔دوسرے منظر نامہ میں اجتماعیت، فردیت، وجودیت، رمزیت، اشاریت، تجریدیت کے تجربات نظر آتے ہیں۔شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، خود کلامی، استہزائیہ انداز کے افسانوں میں لاشعوری محرکات کی حامل کیفیات نظر آتی ہیں۔خواب کا بیان، تخیلی فضا، سرریلزم وغیرہ نے افسانویت کو ہی نہیں وقت اور مقام کی حدود کو بھی توڑا ہے۔سماجی شعور، فکری پس منظر اور علامتی نظام میں مغربی رجحانات اور نظریات سے کسب فیض کیا گیا ہے۔مشرق کی قصہ گوئی کے اسالیب کی تجدید بھی ہوئی ہے تبھی تو داستانی،

رومانی، استعاراتی، تجریدی، تمثیلی، علامتی وغیرہ اسلوب نظر آتے ہیں۔

پچھلے سو سال میں عالمی سطح پر جو فکری، سماجی اور سیاسی منظر نامہ مرتب ہوا ہے یا مغرب کی ادبی اور فنی تحریکیں اور نظریے افسانہ پر کس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں، اس کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے یہ انتخاب ترتیب دیا گیا ہے تاکہ اردو افسانہ میں فکری اور فنی سطح پر بتدریج وقوع پذیر ہونے والی زیادہ تر تبدیلیوں کا احاطہ ہو سکے۔

اس دوران اردو افسانوں کے کئی اہم انتخاب شائع ہوئے ہیں۔ پھر ایک اور انتخاب کے شائع کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن ایجوکیشنل بک ہاؤس کے سربراہ جناب اسد یار خاں صاحب نے جو دلائل دیے اُن سے اطمینان ہوا بلکہ یہ احساس بھی کہ ایسے مختصر اور طویل افسانوں کا الگ الگ انتخاب منظر عام پر آنا ضروری ہے جس سے قاری کو متذکرہ بدلتے ہوئے رجحان، اسلوب اور تکنیک کے تجربات کا اندازہ ہو سکے۔ بر دست مختصر افسانوں کا انتخاب پیش خدمت ہے جلد ہی طویل افسانوں کا انتخاب بھی آپ کے سامنے ہوگا۔

قارئین کو اس کا احساس ہوگا کہ اس میں فلاں فلاں افسانے اور بھی شامل ہو سکتے تھے! مجبوری کا ذکر ابتدائی صفحات میں کر چکا ہوں۔ کچھ اہم افسانوں کو یوں بھی اس انتخاب سے الگ رکھا گیا ہے کہ وہ ہر جگہ بآسانی دستیاب ہیں اور ان پر خوب گفتگو ہو رہی ہے۔ تکرار سے بچنے کے لیے بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ فکر وفن کے اعتبار سے ہر دور کے محض چند نمائندہ افسانوں کو اس ترتیب کے ساتھ شامل کیا جائے کہ مکمل ایک صدی کے اردو افسانوں میں رونما ہونے والے تجربات کی نمائندگی ہو سکے ——— اگر میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو یہ میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔

صغیر افراہیم

پروفیسر شعبۂ اردو،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(یو پی) انڈیا

email: s.afraheim@yahoo.in

روشنی

پریم چند

آئی۔ سی۔ ایس۔ پاس کرکے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد برآئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا بنگلے ہی پر کچہری کرلیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی اس لیے سیر وشکار اور اخبارات ورسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یوروپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے۔ سوچتا تھا۔ وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شاندار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کرکے گجن پور کے تھانے کو چلا کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی، مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی آم کے درختوں میں بور آگئے تھے اور کوئل کو کنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا کیونکہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا ''چلو بیٹا چلو۔ ڈھائی تین گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے''۔ ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کردیے گئے تھے۔

جا بجا کاشتکار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جارہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے، وہی باوا آدم کے

زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوسناک جہالت، وہی شرم ناک نیم برہنگی۔ اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقات اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا، لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل! آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت وحرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں، جہاں آج بھی شجر وحجر کے عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا۔ افق گرد وغبار کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لحہ بہ لحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جا رہا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ وتنہا طوفان سے طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی، وہ پردۂ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الامان گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا، یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منھ چھپا لیا۔ سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منھ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو ایک عجیب

دہشت مجھ پر مسلط ہو گئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آکر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار وقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلے۔ افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس اراراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے کہیں سانڈنی ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمیندار ہوگا۔ مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز بالکل قریب آگئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آرہی ہے ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جارہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے اپنے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منھ پونچھا اور اس سے بولا ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز بھی نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آکر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا۔ ''کہاں جاؤ گے؟''

''گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔''

''تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟''

وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔''

''تم اس آندھی میں کہیں رُک کیوں نہیں گئیں؟''

چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رُک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔''

آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد وغبار کی ایک دھونکنی سی منھ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے، بے کسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے، حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منھ چھپا لیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالو میں سر چھپا لیتا ہے۔

(۲)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا۔ نہ گرد وغبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے سامنے ایک پہاڑی تھی اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گاؤں میں پہنچا وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمہیں ڈھونڈھنے جا رہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا ''میں اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلہ آیا کہ مجھے راستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟''

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ کہیں دہنے بائیں مڑنا نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔''

''یہی تمہارا بچہ ہے۔''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا تو شیطان ہے۔ لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی کہیں جاتی ہوں۔ من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے کو تو دلچسپی ہو گئی۔ پوچھا ''تمہیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہو گئے؟''

عورت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:

''ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابو جی، بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا تے ہوئی۔ بس آنکھیں بند ہو گئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کے اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی بیل بدھنے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔ بھگوان تمہارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے۔ میرے لیے یہی بہت ہیں۔''

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے۔ میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں۔''

"یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔"

"نہیں بابو جی۔"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔"

"نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ۔ نہیں دیر ہو جائے گی۔"

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا۔ اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری! یہ فرض شناسی! یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں اس آندھی میں ذرا بھی ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟"

عورت مسکرائی۔ "ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آکر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پور اکیلے نہ جانے پاتے۔ جاکر تمہیں پہنچا آتا۔ تمہاری خدمت کرتا۔"

گھوڑا اُڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے۔ وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے اُڑا چلا جا رہا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(۳)

گجن پور بھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ، بیہڑ بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا ہوا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔

برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی ایک نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ بھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکایک سامنے ایک لق دق میدان آ گیا۔ جس کے پرلے سرے پر بجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے جو مجھے ہر آفت بر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اُڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اُڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گذر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی۔ کیونکہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا:

"بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔"

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکیدار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیرنا

جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر سے اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اُٹھتا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں۔ میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لمحہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے مگر میں خوش تھا۔ کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا۔ بے خوف۔ بے خطر دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا "تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو"۔

میں نے کہا "تمہارا خادم ہوں"۔

"تمہارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔"

"وہ کون دیوی ہے؟"

"وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے۔"

"تو کیا وہ عورت ہے؟"

"نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے"۔

OO

عید گاہ

پریم چند

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّے کی طرح پُر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھ کتنا پیارا ہے۔ گویا دُنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کُرتے میں بٹن نہیں ہیں۔ تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی دے دیں۔ عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا۔ وہ بھی دوپہر تک کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عید گاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عید گاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیویوں کے لیے گھر میں دودھ شکر اور میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں۔ ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت

بچہ ہے۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا۔ اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے۔ کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے۔ جس کا گوٹہ سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہِ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔ ''تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سیویاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سیویاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں اس نے فہمین کے کپڑے سئے تھے، آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی۔ اس عید کے لیے لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے۔ اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے گا۔ دھوبن، مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی۔ سب کو سیویاں چاہئیں۔ کس کس سے منھ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچوں کے ساتھ تھا۔ سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے

آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اُٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو خوب اُلّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے۔ یہ مدرسہ ہے۔ یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے۔ اب تک پڑھتے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے۔ تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کوڑن جیسے کام سے جی چرانے والے یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی بیہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں۔ وہ سب بتلا دیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے "بیٹ" تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امّی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگیں۔ اللہ قسم"۔

حامد نے اس سے اختلاف کیا۔ "چلو" منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آجائے۔

محسن: "لیکن دوڑتی تو نہیں، اُچھل کود نہیں سکتیں۔"

حامد: "کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی۔ تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں اُن سے پیچھے رہ گئے۔"

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دوکانیں شروع ہو گئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔

اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھونا۔ ایک ایک دوکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے۔ رات کو ایک جنات ہر ایک دوکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے۔ وہ سب خرید لیتا ہے۔ اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے۔

محسن: ''جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب۔ آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔''

حامد: ''جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔''

محسن: ''اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔''

سمیع: ''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا۔ مویشی خانہ میں ہے۔ اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔''

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے۔ اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر انھیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے، یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ لپ، بھام پھو!

نوری نے تصحیح کی۔ یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمہیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو سب ایک محلہ میں چوروں سے کہتے ہیں۔ اور دوسرے محلہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ

چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔"

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ "ارے احمق۔ انہیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے سائے نیچے سوئے اللہ قسم! پھر جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار، کوئی موٹر پر چلتے تھے۔ تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگن صابرو شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عید گاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہوگئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے۔ اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں۔ پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رُتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں اور ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُر احترام رُعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

نماز ختم ہوگئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں

کی دو کانوں پر یورش کی۔ بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے کبھی زمین پر گرتے ہیں۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ۔ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ انکے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔ حامد سوچتا ہے۔ کیوں کسی کا احسان لوں۔ عُسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔ سب لوگ چرخی سے اُترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے۔ اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔ خاکی وردی اور پگڑی لال۔ کندھے پر بندوق۔ معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن۔ اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ ''میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا۔ صبح شام۔''

محمود: ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری: ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا۔ اور روز روپے لائے گا۔''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ ''مٹی کے ہی تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں''۔
لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دوکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند، سیٹیاں، بگل بھنورے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند، نوری ربڑ کا بت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری اسے وہ بجا بجا کر گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارا یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا: ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟''

حامد سمجھ گیا۔ یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نورا اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔ محسن نے کہا ''اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ اللہ قسم۔''

حامد نے کہا ''رکھیے رکھیے۔ کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا۔ ''تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لوگے؟''

محمود: ''تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو۔''

حامد: ''مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''

محسن: ''لیکن جی میں کہہ رہے ہوگے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔''

محمود: ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو

جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا۔"

حلوائیوں کی دوکانوں کے آگے کچھ دوکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دوکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اُتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر کی خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اُتار لو۔ چولہے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے۔ بازار آئیں۔ اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں۔ کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں۔ میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھلواؤ۔ اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں آپ منھ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہوگی۔ اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انھیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں۔ جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں۔ مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں۔ سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا۔ اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں

کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں۔ تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگیں۔

دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دوکاندار سے پوچھا۔ ''یہ دست پناہ بیچو گے؟''

دوکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی، اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

''تو بتلاتے کیوں نہیں۔ کے پیسے کا دو گے؟''

''چھ پیسے لگیں گے۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا تین پیسے لو گے؟'' اور آگے بڑھا کہ دوکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دوکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرو گے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی۔''

محمود: ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد: کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!''

سمیع متاثر ہو کر بولا: ''میری خنجری سے بدلو گے۔ دو آنے کی ہے۔''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا

پانی لگے تو ختم ہو جائے میرا بہادر دست پناہ آگ میں پانی میں، آندھی میں طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔ میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار۔ اب دو فریق ہو گئے۔ محمود، محسن، اور نوری ایک طرف۔ حامد یکہ وتنہا دوسری طرف سمیع غیر جانب دار ہے۔ جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ اور لکڑی کی چیزیں۔ دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے چنے منھ میں چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر، یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ ''اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔''

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر لو۔

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ ''بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب!''

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا۔ ''یہ سپاہی بندوق والا۔''

حامد نے منھ چڑھا کر کہا۔ یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بچارے۔''

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔ ''تمہارے دست پناہ کا منھ روز آگ میں جلا کرے گا۔

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب تمہارے یہ وکیل

اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں، سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"

نوری نے انتہائی جدت سے کام لیا۔ "تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا"۔ اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ "بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ "دست پناہ باورچی خانہ پڑا رہے گا۔"

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی کہ تینوں سورما منھ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور بت ریزرو تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے۔ دست پناہ رستم ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے تھار اور خوشامد کا مزاج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔ "ذرا اپنا چمٹہ دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو۔"

حامد: "ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن۔ محمود۔ نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا۔ اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ بولا ہی چاہتے ہیں۔ مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ تو ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے۔ حامد کو خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔

(۲)

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اُچھلی تو میاں بہشتی نیچے آرہے اور عالم جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں اُن پر چیڑ کا ایک پرانا پٹرا رکھا گیا پٹرے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو منزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور ان کی مجسمہ خاکی کے پرزے ہوئے۔ پھر بڑے زور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی۔ تاکہ بیکار نہ جاکر زاغ وزغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا۔ اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی۔ اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ''چھونے والے داگتے لہو'' پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے۔ ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملی جراحی ناکام ہو جاتی ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر

پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے۔ کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی۔''

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ''تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں؟''

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا اور شفقت بھی وہ نہیں جو بیان ہوتی ہے۔ اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی۔ درد، التجا، میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جانسوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا۔ کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کردے۔

اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا کیا راز سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

OO

ڈُلاری

سجاد ظہیر

گو کہ بچپن سے وہ اس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولہویں سترہویں برس میں تھی کہ آخر کار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوش حال آدمی تھے۔ گھرانے میں ماشا اللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحبہ بھی بہ قید حیات تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دُلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں نوکرانیاں اور مامائیں آتیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں اس کے بعد ذرا سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں اور چلی جاتیں۔ مگر دلاری کے لیے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیوں کے مقابلے میں اس کی حالت اچھی ہی تھی۔ مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی۔ ''میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں۔'' اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بی بیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ یہ تو سب خدا کا کیا دھرا ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا؟ دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے

گئی۔ لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہمسن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کیونکہ شریف تھیں، ان کا وقت پڑھنے لکھنے سینے پرونے میں صرف ہونے لگا۔ دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی۔ وہ خوبصورت تھی۔ کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم۔ مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے چکٹے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں میں البتہ وہ اپنے رکھاؤں کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی، یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحبہ یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی۔ دلاری گڑیا بنی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے، نوکر چاکر کھڑے تماشہ دیکھتے۔ بچے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے، جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحبہ انھیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انھیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ اکثر پرانی رسموں کے خلاف تھے۔ مگر اظہارِ ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

انھیں پیاس لگی اور انھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔ ''امی جان پیاس لگی۔''

بیگم صاحبہ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''بیٹا، شربت پیو، میں ابھی بنواتی ہوں۔'' اور یہ کہہ کر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے۔ ''جی نہیں امی جان، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، میں خود اندر جا کر پانی پی لوں گا۔'' مگر دلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل دی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چن رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہنچ کر رُکے۔

دلاری نے مڑ کر پوچھا۔ ''آپ کے لیے کون سا شربت تیار کروں؟'' مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دلاری کو آنکھ بھر کے دیکھا، دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر الگ رکھ دی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے، جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئے ہیں۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جا رہے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آجائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے، کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی۔ بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کو شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔

درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی، مگر اس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلے میں دیکھا۔ بڈھا بے چارہ بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہوگئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچے گی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے سر سے پیر ایک سفید چادر اوڑھے، پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑے ہو کر اسے دیکھتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں شیخ ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آگئی ہے، تو وہ باہر نکلے، جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا۔ ''بے وقوف، اب ایسی حرکت نہ کرنا!'' اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔

اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی دبے قدم اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہنچیں، مگر بہت قریب نہیں۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی

تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر بہت ترس آرہا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر، جہاں اس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے، اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت ذلت۔ یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی؟

دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی، حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی، مگر اس کی اسے کافی سزا مل گئی، خدا بھی گنہگاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لیے یہ اتنی اہم چیز نہیں، جتنی ایک شریف زادی کے لیے ہے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا:

"دلاری، یہ تو نے کیا کیا؟"

دلاری نے گردن اٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے اپنے بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا۔

حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحبہ آگئیں۔ ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ دلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحبہ نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ، مگر منھ کالا کر کے! سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہوتا ہے.........."

مگر باوجود ان سب باتوں کے، بیگم صاحبہ اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی، گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

☆

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحبہ اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھ کر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مُردار خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بیکس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں

مارتے ہیں، بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

یکایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا:

''امی، خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے!''

لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے، جب اس کے کان صرف پیار کے لفظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اس کے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش، اسی بے دلی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے۔

اس روحانی کوفت نے دلاری کو اس وقت نسوانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے ہٹنا شروع کر دیا۔ مگر یہ ایک مجروح پُر شکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔

اس دن، رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

○○

دو ہاتھ

عصمت چغتائی

رام اوتار لام سے واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا؟ اس لیے رام اوتار تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹمارہے تھے، مارے شکرگزاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوالیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہوگی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے، ان میں سے بس رام اوتر وا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچایا مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان وشوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی، جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی، سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام پر توپ بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا، پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہوگی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتر وا واقعی نہ رہا ہوگا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے اور اس کا جوان خون جنگ سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمسی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اس کا گھونگھٹ فٹ بھر

لمبا رہا اور کسی نے اس کے رخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا۔ جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لیے اڑ رہا ہو۔ تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لیے، سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رُت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہوگئی۔ کم بخت ہر وقت ہی ہی، ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پر میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی، لوگ بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی روٹی سے اُچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنویں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں۔ اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتہ میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی دُرگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی۔ چپراسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات دھمو کے جڑنے لگتی اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کم بخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے الٹے توے پر کسی پھوہڑ یا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کا جل تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہو سکا۔ پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی، خاصی کٹھلاسی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے گھر، جدھر سے نکل جاتی، کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی، یعنی اس کی ساس، بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی۔ چالیس برس میلا ڈھونے سے اس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر وہیں تھم گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے آنول نال اسی نے گاڑے تھے۔ جوں ہی اماں کے درد لگتے، مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت

مفید ہدایتیں دیتی۔ بلائیات کو دفع کرنے کے لیے کچھ منتر تعویز بھی لاکر باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچن کی تو بات اور تھی، ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں ان کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن ان کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی، بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بچھار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی، جس میں سب بھاوجوں نے شدومد سے ووٹ دیے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا۔ ساری خواتین حسب مراتب زمین و پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچوں کے منہ سے دودھ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی اور مقدمہ پیش ہوا۔

''کیوں ری چڑیل، تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا، کیا منہ کالا کرائے گی؟''

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی، پھوٹ پڑی۔ ''کیا کروں بیگم صاحب، حرام خور کو چار چوٹ کی مار بھی دہی لے تو۔ روٹی بھی کھانے کو نہ دی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔''

''ارے روٹی کی کیا کمی ہے اسے۔'' باورچن نے اینٹا پھینکا۔ سہارنپور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی، کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپراسن، مالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بے چاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

''بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرنے سے موئے ناتھوڑی، پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں......؟''

ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے مہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اماں نے رائے دی۔ ''موئی کو میکے پھنکوا دے۔''

''اے بیگم صاحب کہیں ایسا ہو سکے ہے؟'' مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آتی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آجاتیں۔ مزے سے بھر کلی دودھ دیتیں۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیج دیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھوں والی ہے۔ پر چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

مہیلائیں کوئی ناسمجھ نہ تھیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آ گیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لیے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنئے سے لے کر خرچ کیا تھا، ججمان کھلائے تھے، برادری کو راضی کیا تھا، یہ سارا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ساری ادھاری میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم نہ ملے گی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ ''اگر اس لچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔''

بڑھیا نے بہت واویلا مچایا اور جا کر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زرخیز تھی۔ پٹتی رہی، بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے عملے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہو گئی اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو ہرے بھرے خاندان کے لیے سیہی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا۔ پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا، سو وہ بھی اس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اس کی بہو ابھی نابالغ تھی اس لیے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا، جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے، کانسے کے کڑے

گونگے ہو گئے۔ اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے، ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ بجائے بے تھکے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مرد وے اسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آکر ڈٹ جاتا۔ بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑ گڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا، جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور وہ عملے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات بے بات باورچی، جو اسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا، کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسی پر ڈالتا ہے، یہ حرام زادی خاک اڑانے آجاتی ہے۔ چپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو کے لیے کئی مشکیں لیے تیار رہتا تھا، اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی مگر ٹالتا رہتا تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن ڈاڑھی والے داروغہ جی، جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے، ابا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے اور اس بھیا نک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے جو بہو اور رام رتی کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ ابا نے معاملہ سیشن سپرد کر دیا یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا پھر سے چھڑی اور بڑھیا کو بلا کر اس کے لتے لیے گئے۔

''اری نگوڑی خبر بھی ہے، یہ تیری بہو قطامہ کیا گل کھلا رہی ہے؟''

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے، اور جب اسے صاف صاف بتایا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں، دونوں بہت ہی قابل اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں، تو اس

پر بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی، بڑا واویلا مچانے لگی کہ رام اوتر واہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹھولی بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اس کی جان کی لاگو ہوگئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے، وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی رازدار ہے، آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کیے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر نہیں۔ اسے کسی سے بغض نہیں۔ اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے، ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری مہلائیں اس کی پچ کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی، ان کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے۔ تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن کے لیے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا۔ لوگ کچھ بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا اور لوگ شدومد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے۔ مگر اس نئے موضوع پر بڑھیا بالکل اٹن کھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سننے لگی ہے۔ اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور رتی رام پر حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا منھ کالا اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی، دو دن میں صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا۔ بلکہ ادھر ادھر کی شکایتیں کرنے لگی کہ اس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے، نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی......... بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی

ہے۔ لیکن ان کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے یہ بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی، اسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتروا کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

''آن دے رام اوتروا کا، کہاں گی، توری ہڈی پسلی ایک کر دیہئے۔'' اور اب رام اوتروا لام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے اور بدھائی سمیتی پھری۔ اس کا بھلا چاہنے والوں نے اسے حساب لگا کر بہت سمجھایا کہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اس کا کہنا تھا، اساڑھ میں رام اوتار لام پہ گیا، جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے سنڈاس میں گر پڑی تھی۔ اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لو لگی تھی۔ مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا۔ ''وید جی پورے حرامی ہیں، دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔'' اس کے بعد وہ اصل سوال سے ہٹ کر خبیلاؤں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ بات اس کائیاں بڑھیا کو سمجھا تا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اس نے رام اوتار کو چٹھی لکھوائی۔

''رام اوتار کو بعد پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے۔ سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آ جاؤ۔''

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا۔ مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی، جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لیے موزے اور بنیائن لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا تو پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر لیٹی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا، کہ ساری کوٹھیوں کا کام ترت پھرت ہو رہا ہو، مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا، اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائے گا اور

اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا ہے۔ آخر کو سپاہی ہے، کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی طوطا چشمی کی وجہ سے سو گئی تھی، دو چار خون ہونے اور ناک کٹنے کی آس میں جاگ اُٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہو گا جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تا کہ اطمینان سے مچیٹے کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنویں کے پاس ٹیک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی۔ مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو۔ جھٹ پٹ اُس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے عملے کی قوتِ مردانہ پر ضرب کاری لگی۔ ہت تری کی، سالا سپاہی بنتا ہے، ہیجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو! گمنی سمٹائی جیسے نئی نویلی دولہن نے کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کسیں، اسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا۔ جیسے اس کے سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے ابا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے، وہ بھی جز بز ہو گئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تل گئے۔

''کیوں بے، تو تین سال بعد لوٹا ہے؟''

''معلوم نہیں حجور، تھوڑا کم جیادہ..... اتا ہی رہا ہو گا۔''

''ادھر لونڈا سال بھر کا ہے۔''

''اتا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سرا۔'' رام اوتار شرمایا۔

''ابے تو حساب لگا لے۔''

''حساب؟..... کیا لگاؤں سرکار۔'' رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

''الو کے پٹھے یہ کیسے ہوا؟''

''اب جے میں کا جانوں سرکار...... بھگوان کی دین ہے۔''

''بھگوان کی دین! تیرا سر...... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا۔''

ابا نے اسے چاروں اور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔ تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

''تو اب کا کروں سرکار...... حرامجادی کو میں نے بڑی ماردی۔'' وہ غصے سے بپھر کر بولا۔

''ابے بڑا الو کا پٹھا ہے تو...... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کم بخت کو۔''

''نہیں سرکار، کہیں ایسا ہوئے سکے ہے۔'' رام اوتار گھگھیانے لگا۔

''کیوں بے؟''

''حجور، ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لیے کاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔''

''کیوں بے، تجھے برادری کیوں کھلائی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا۔''

''جے میں نہ جانوں سرکار، ہمارے میں ایسا ہی ہووے ہے۔''

''مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار...... اس حرامی رتی رام کا ہے۔'' ابا نے عاجز آ کر سمجھایا۔

''تو کا ہوا سرکار...... میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام، کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔''

''نرا الو کا پٹھا ہے۔'' ابا بھنا اٹھے۔

''سرکار، لونڈا بڑا ہو جائے گا، اپنا کام سمیٹے گا۔'' رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔

''وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا۔'' ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے...... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی، یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں۔ اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

OO

ہتک

سعادت حسن منٹو

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سوگئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغۂ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے، اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ''بیوڑا'' کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے

باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے —— دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑھا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کی پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی، پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کی گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا، جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں

بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی، اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے، جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا —— ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے —— یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! —— سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے، مزے الگ رہے۔ تجھ سے کچھ لے ہی مرتا ہے —— سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے —— سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا —— ''سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! —— اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر —— ''تیری جان کی قسم مادھو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں —— سمجھیں؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان —— اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔''

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔ ''نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی

ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سر کی سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ — ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں! رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا — جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی — ارے وہ تو ڈرنے لگا! — سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا — وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا — بولا — روشنی کرو — روشنی کرو — میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا — بولا لائٹ — لائٹ! —

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!" اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی — تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردوے!" — وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی — وہ پھر گھبرانے لگا — تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی — کبھی اندھیرا کبھی اجالا، کبھی اجالا کبھی اندھیرا — ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا — سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے، جو یوں مفت دے گیا — جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لیے۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی — "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو — اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ — اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے — وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی — ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن — ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے، غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے، اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ ہونے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیے ہیں —— جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی، لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات —— کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے —— ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر —— انھیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے —— وہ بیہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے۔ کتنا آنند دیتی ہے —— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی، کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں، تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا —— بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوان کے پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر

یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی، جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا ——— "سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں۔ اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی، جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے، بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ

خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں! —— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا: ”تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ —— اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ —— چھی چھی چھی —— دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات —— اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا —— مجھے عورت چاہئے، پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں —— تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں —— بس یہ دس روپے، جن میں ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں —— تو بھی ان کا بجنا سن رہی اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور —— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا —— تین چار دن کے لیے —— یہ دھندا چھوڑ —— میں تجھے خرچ دیا کروں گا —— کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا —— ؟“

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی، باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا —— سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا —— اور پانی کا یہ گھڑا —— دیکھا۔ کتنا میلا ہے اور یہ —— یہ چیتھڑے —— یہ چندیاں —— اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کر باہر پھینک ان کو —— اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے —— اور ——

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ

کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقعہ دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔ ''دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے —— ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو —— اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا۔ اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔ ''دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی —— اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا —— دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا —— ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......''

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا ''تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟'' اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں'' —— دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک طمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے —— لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ طمع کیے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی —— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی —— وہ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منھ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ لیس دار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی جھک کر اس

نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منھ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منھ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ ''رام لال؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا۔ ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کارگ (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟'' —— پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا۔ ''اندر کوئی ہے تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا ''نہیں'' —— تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ —— بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا —— اب تو میرا منھ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پاؤڈر روڈر لگا اور چل میرے ساتھ —— باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں —— چل چل ایک دم جلدی کر۔''

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ ''رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔''

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا ''تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ ''وہ بات نہیں رام لال —— ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں —— بہت پی گئی۔''

رام لال کے منھ میں پانی بھر آیا۔ ''تھوڑی بچی ہو تو لا —— ذرا ہم بھی منھ کا مزا ٹھیک کر لیں۔''

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ ''بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا —— دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آ۔''

رام لال نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹل مین آدمی ہیں، وہ تو

موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے —— تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل —— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ "بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپیوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑی پہنی، اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازاروں سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی —— سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کا سر درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا، جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ "لیجئے وہ آ گئی —— بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے۔" پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سوگندھی ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے

کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونھ'' نکلا، پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا.........

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟.....کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ ''پسند نہیں کیا تجھے؟ —— اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔''

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر —— کہاں ہے وہ سیٹھ —— تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا —— اس کی.........

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ ''او سیٹھ —— او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی —— بس ایک منٹ کے لیے۔'' پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑی اور اس کی ریشمی سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑی کے چیتھڑے اڑا دے کیوں کہ ساڑی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ، اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی، جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آگیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سوچا —— ''میں نے اس موئے کو دکھانے

کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے ــــ میری کیا سب کی یہی عادت ہے ــــ پر ــــ پر ــــ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور ــــ یہ بازار ــــ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک۔" یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدنگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔ اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا۔ اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا۔ مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو ــــ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا ــــ کیا یہ درد تھا؟ ــــ ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا ــــ یہ کیا تھا؟...... لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی ــــ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ "سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اسے ــــ اسے ــــ صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی ــــ نہیں آئی تو کیا ہوا؟ ــــ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ــــ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی ــــ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ــــ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ــــ ٹھیک ہے۔ پر سوگندھی ــــ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا ــــ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے ــــ اونہہ ــــ اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ــــ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر

میں چنبیلی کا تیل —— اور —— یہ منھ اور مسور کی دال —— ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے —— اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو —— دس روپے اور یہ عورت —— خچر کیا بری ہے..........''

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پاکر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس کے خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی باہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا، کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے —— اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو —— صرف ایک بار —— وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ —— سوگندھی —— اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منھ نوچنا شروع کردے۔ وحشی بلّی کی طرح جھپٹے اور —— اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے —— بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مُکّے مارنا شروع کردے اور جب تھک جائے —— جب تھک جائے تو رونا شروع کردے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ''تم روتی کیوں ہو؟ تمھیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟'' —— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلاء کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ —— یہ آواز کہاں سے آئی؟ —— سوگندھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا —— ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے —— اس کا دل —— یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! —— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے —— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑا دھڑ کیوں کرتا تھا —— بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا۔ ''رات کٹی گن گن تارے۔'' کہتا

کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں۔" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا۔ "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت کے اندر ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضاء متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑے رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اڑا تھا۔ بیچارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیے تھے ——— "مجھ میں کیا برائی ہے؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری ——— ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے ——— کوئی ——— کوئی ——— اس

وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ ''سوگندھی! کون کہتا ہے تو بری ہے، جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے۔'' ـــــ نہیں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ ''سوگندھی! تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ''ماں'' بن رہا تھا ـــــ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ـــــ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ـــــ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ـــــ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑ بڑ تھی؟ ـــــ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا کو محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ـــــ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے اس کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ـــــ کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ـــــ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑاتی ہوئی سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں، جدھر موٹر گئی تھی۔ مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ـــــ اور ـــــ

''نہ آئے ـــــ بلا سے ـــــ میں جان کیوں بیکار ہلکان کروں ـــــ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردِسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل ـــــ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر

سوچا —— فرسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا —— سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی۔''

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے، جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیال کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا —— قدم پھر بوجھل ہو گئے۔ اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں —— اس سیٹھ نے —— پرماتما کرے......سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بد دعا دے مگر سوچا، بد دعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی —— اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا —— کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ''یہی لینے آیا تھا نہ تو؟ —— لے دام دیے بنا لے جا اسے —— پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ——''

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار —— صرف ایک بار —— اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں۔ یہ نہیں یہ کرے —— یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں —— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی —— بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بُن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی

نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ ''آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ——— صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اسی طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ——— وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟ ——— کیوں؟''

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔ ''میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔''

مادھو بڑا سٹپٹایا۔ ''انتظار؟ ——— تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔''

رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا ——— اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔ اور........''

مادھو خوش ہو کر بولا۔ ''اور میں آ گیا ——— بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ دل کو دل سے راہ ہے ——— تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟''

سوگندھی نے جواب دیا۔ ''چار بجے کے قریب۔''

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ ''اور میں نے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا ——— جیسے تو پھولوں والی ساڑی ——— ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں ——— کیا تھا تیرے ہاتھوں میں! ——— ہاں تیرے ہاتھوں میں روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔ ''مادھو تو چنتا کیوں کرتا ہے ——— لے یہ تھیلی ——— ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟'' ——— سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا ——— کیا سناؤں بڑی پریشانی

ہے! ــــ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو ــــ انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے ــــ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے ــــ ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔''

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔ ''مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ ــــ جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ــــ بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ــــ جان بچی لاکھوں پائے ــــ بس بس اب جانے دے ــــ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا ــــ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ــــ واپس کب جائے گا تو؟''

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقعہ اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔ ''دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا ــــ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو........زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔''

''پچاس!'' یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی۔ ''ہمارا فوٹو اترے گا! ہمارا فوٹو اترے گا۔''

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ــــ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ ''کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟''

سوگندی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی

کی تھی۔ ’’اس کی —— منشی پالٹی کے اس داروغہ کی...... ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا —— کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی —— اونہہ! یہ منھ اور مسور کی دال‘‘۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کیساتھ۔ ’’رانی بھنگن کچڑا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔‘‘

ایک بار پھر اس نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی۔ جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہو۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ ’’ہی ہی ہی......‘‘

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ’’اونہہ‘‘ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا —— ’’مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔‘‘

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ’’تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا —— پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہو —— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منھ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ —— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا۔ اونہہ...... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے...... آج کل زمانہ ہی ایسا ہے، جو عیب چھپائے وہ ہی برا ——‘‘

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ ’’دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے —— اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں......‘‘

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ’’اگر تو نے پھر سے اپنا

دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں بتاتی ہوں —— پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا —— اور دس روپے بھاڑا ہے میرا —— اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات، رہے نہ ساڑھے سات! ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا —— تیرا میرا ناطہ ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری —— پہلے میرے اور تیرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔ آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں —— یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس مار رکھا ہے؟''

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ ''سوگندھی!''

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ ''یہ چیتھڑے، یہ چندیاں —— اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان کو......''

مادھو چلایا۔ ''سوگندھی!''

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں.......... کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟ —— بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ —— میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ —— چور یا گٹھ کترا؟ —— اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ —— بلاؤں پولیس کو؟ —— پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ——''

مادھو سہم گیا۔ ''دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ ''سوگندھی! تجھے کیا

ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر —— تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا —— بھاگ یہاں سے ورنہ" —— سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں میں منہ رکھے سو رہا تھا۔ ہڑ بڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔ "خبردار! —— پڑی رہنے دے وہیں —— تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی —— اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا —— ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے —— جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے.... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر دماغ کو پُر کرتی تھی اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

OO

کالُو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے، لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے۔ ''چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ کتنے سال ہو گئے، تمہیں لکھتے ہوئے؟''

''آٹھ سال۔''

''کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟''

''ساٹھ اور دو باسٹھ۔''

''مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم

میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟''

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لیے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لیے اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لیے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لیے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لیے، اپنے کولھوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لیے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، چپٹے چپٹے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر گنجی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت نیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے، اس کی چاردیواری میں اپنے دیے جلا کر چلے گئے۔ لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے۔ اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے۔ زندگی کے ہر رنگ میں ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے، ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں۔ لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے، تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں۔ لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں۔ اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

☆

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے تیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے وہی پاؤں وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو، جو ایسا معلوم ہوتا تھا ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آرہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لیے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا۔ اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ تیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلا ناغہ۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر، یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں، لیکن یہ شخص نہیں مانتا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لیے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درآں حالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لیے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے، کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ خواہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں؟ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو۔ کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے، نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا، اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا، اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا، صم بکم۔ مگر اب یہ جائے ضرور، اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے

بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تا کہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے۔ اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے کہ زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آبا و اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اور اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے اور کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف، اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی۔ اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا، کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے۔ لیکن

کالو بھنگی کو اتنی مار کھانے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا۔ دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لیے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی۔ حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے۔ لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی —— اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا تھا۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں راستے میں۔ وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منھ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا ہے اور بکری کے منھ میں ڈال رہا ہے۔ اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے۔ اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر، کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دُم دبا کر، کبھی ناچ کر کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا سا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا۔ بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیوں کہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے، یا کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا بھی تھا جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا۔ اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا۔ لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا، دوپہر کو اور شام کو۔ اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ۔ مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا، لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور، چرند اور پرندے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی نیولا بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رستگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبز تحی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرتائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزہ دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی میٹھی جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتے دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بدذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ کہ انھیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی

ٹھکائی ہوئی، بری طرح بچارا کالو بھنگی بھی پٹا۔ مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے میں جھاڑو لیے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لیے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعے کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے فاؤنٹین پین اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟''

''کیسی چھوٹے صاحب؟''

''کوئی خاص بات۔ عجیب انوکھی نئی؟''

''نہیں چھوٹے صاحب۔'' (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلیے ممکن ہے.........!)

''اچھا تو تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں——'' وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے۔ پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے——چار روپے کا آٹا لاتا ہوں......ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ۔ کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟''

''سات روپے۔''

''ہاں سات روپے، ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے قرض لیتا ہوں۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے، خیر! لیکن دو جوڑے تو چاہئیں۔ اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے!''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک، بڑا جی چاہتا ہے۔''

اب بولیے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہوگئی۔ جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کرکے کانپنے لگتے، اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی، تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں، چھوٹے صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے، چھوٹے صاحب، پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟'' (لیجیے یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کرکے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کے لیے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔''

''عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔''

''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے، چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟''......(ہم کیا بتائیں۔ خاک)

''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''

''کس بات کا افسوس چھوٹے صاحب!''

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

☆

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا، اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپراسی اس کے لیے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا۔ اپنا بستر خود کرتا۔ اپنا بول و براز خود صاف کرتا۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا، کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے۔ اس لیے اس کی آخری تنخواہ بھی بحقِ سرکار ضبط ہو گئی کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ اور جب وہ مرا تو اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کیے۔ مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات تا آخر!

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا۔ آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔''

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

''کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا۔ وہ سب کچھ، جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو۔ پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہو گئی ہے۔ تمہارا نام، کالو بھنگی، کام بھنگی، اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی، کوئی اچنبھا، معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں، پھر میں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں —— تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے اور ایک روپیہ بنئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی۔ مگر آٹھ روپے میں تو

شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں؟ اب خلجی ہی کو لو ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کرسکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کرلیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی، سولہ سترہ برس کی الہڑ جوانی، چاروں کوس سے سنیما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی وہ۔ اپنے گاؤں کے دونو جوانوں کا عشق قبول کیے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہوجاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کرسکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ عشق بڑے تذبذب غیر یقینی، گومگو کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اور اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی کہ اُدھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے، اسی لیے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پُوت کے لیے بھی۔ اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بے تاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پُوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے۔ اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں۔ اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے —— پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی —— نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا۔ نمبردار کا بیٹا،

وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی۔ دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے۔ اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا۔ اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے۔ اور پھر پٹواری کا پُوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی اور نوراں کے پاؤں پر زخم آ گئے۔ مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی۔ اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں ـــــ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ انجکشن کی طرح تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے، کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا، کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے، اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا، مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا۔ ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا، بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی۔ اور جب جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے ہوئے خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا۔ لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رُکی۔ نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب اتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا، اور یہ دھڑکن

روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی، اس کا بچنا محال تھا۔ مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سڑاند دور ہوتی گئی۔ سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آگئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتار دی تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر۔ اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں، خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کرلیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا، دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے، اس سے معافی مانگنے کے لیے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لیے ہسپتال آئے تھے۔ اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی۔ کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ چلے نہ جاتے۔ اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں، اس کا اپنا گاؤں، اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی، ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے۔ اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی۔ اور دونوں خر دماغ لڑکے بھی، جواب نوراں کو دیکھ کر اپنے کیے پر پشیمان ہو رہے تھے۔ اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈباتی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی ـــــ سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم، دوسرے قدم اور سیکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد وغبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی۔ خلجی، جو مڈل پاس تھا۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا اور پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی، جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا اور جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پُر کیف زندگی تھی خلجی کی، لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس

کے کہ:

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا، تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا، تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت اسے اپنا سر کھجانے لگتا، اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا، لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی؟ سب کچھ تو کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں؟ ہر بار ان آٹھ روپے کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے۔ اور ایک روپیہ بنیے کا، آٹھ روپے ہو گئے، کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی۔ تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لیے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑے

گا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے، جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ بھی ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کڑم کا ساگ بویا ہے۔ اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیں اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں۔ اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار خاں کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ بخت یار خان کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کرکے گھر چلی گئی تھی۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے۔ اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لیے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی، جو اب اپنے کیے پر پشیمان تھی، اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے۔ پھر بارش شروع ہوگئی۔ پھر کریڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار، باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے۔ ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''لماں لماں!'' بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

''لماں!'' بخت یار چلایا۔

''لماں!'' کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہوگیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا ''میرا خیال ہے وہ نکو گئی ہوگی، تمہارے ماموں کے پاس۔''

نکو کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی لماں ملی۔ برف گر رہی تھی۔ اور وہ چلی جارہی تھی۔ گرتی، پڑتی لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی کانپتی آگے بڑھتی چلی جارہی تھی اور جب بخت یار نے

اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لیے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے، بخت یار اور کالو بھنگی۔ اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں، بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی، میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں؟ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں۔ لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ بہت ستا لیا تم نے!

لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے۔ تُو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں، لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ من تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بوائیوں پر مرہم لگائے۔ تُو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے۔ تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں۔ تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے، انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے۔ تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے ایک مصفّا لباس دے دے، تیرے ارد گرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے۔ حسین، مصفّا، پاکیزہ، اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں!

لیکن جو کچھ تُو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے، جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلاتی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے۔ اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت و شفقت سے وہ

بھٹا کھلاتا ہے، تو اپنے ذہن کی پنہائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے۔ جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے، تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منھ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے، دیکھ لو، یہ ہے میرا بیٹا —— یہ ہے میرا بیٹا۔ اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تُو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لا شعوری انداز میں گننے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو تیری ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی۔ کیوں کہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبر دار اور دوکان دار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، ہر شخص کی، لاکھوں کروڑوں اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا۔ اور تُو اسی طرح اپنی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا۔ اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا، جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا، جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھو لے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پنہائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں، جب تک تو جھاڑو لیے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوسِ قزح کے اس پار لے جائے۔

○○

گرہن

راجندر سنگھ بیدی

روپو، شبو، کتھو اور منا ـــــــ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے، سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میا پیار سے چاندرانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیا! حامد تھا۔ گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِشام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ـــــــ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ـــــ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ـــــ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھ جائیں گے اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبے سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کا میکہ اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ سمندر کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت اسٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے کا نوکے

بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی ہٹیلی میا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبرِ اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ——— دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی۔ پھر جانوروں کے لیے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ حتیٰ کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی۔ اور پھر میا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میا اور کائستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک شکم پُر کتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جماہی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے، وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی سیتل سارنگ دیوگرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیوگرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے، اس کے باوجود اسے کائستھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کائستھوں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ کل ودھوا، کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر ڈیڑھ سال بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لیے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لیے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیے جاتے تھے۔

''دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔'' ہولی سوچتی تھی۔ ''اور ساس کے کوسنے، مار پیٹ سے کہیں برے ہیں اور بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ رسیلا کی بات تو دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے، وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا!...... لیکن کیا شاستر

کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور منیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے —— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی......"

......راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں اس کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی، بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں......اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا راکشس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر آتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا —— کیا مجھے بھی اس کا قرض دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اسکے پیچھے منیا آئی اور آتے ہی بولی "بہو......اناج رکھا ہے کیا؟"

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی "ہاں ہاں......رکھا ہے —— نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی منیا......"

"تو بیٹھی کیا کر رہی ہے، نا اب جاوی؟"

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی "جی، مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟"

منیا لاجواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لیے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟" —— رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے۔ جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اُسے پالنے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں بڑبڑائی —— اور

سب ہو جائے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سرمہ پینے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پر ہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا۔

''میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟''

''جلدی کیسی؟''

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''یہی......تم بھی تو کتیا ہو کتیا؟''

ہولی سہم کر بولی۔ ''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس راں بھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی، رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔ اس وقت میا ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈار کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا البتہ میا کی اس عادت سے جل بھن گئی ......''رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی جیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے......''

ہولی سوچتی تھی کل رسیلا نے اس لیے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور آج اس لیے مارا کہ میں نے بات کا جواب دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔ کیوں گالیاں دیتا ہے۔ میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ نہیں دکھائی دیتا......اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد......!

میا نے کچھ باس متی، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھرا دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلی تھی یہ میا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باس متی چاول پیندے سے چمٹ گئے تو بہو مرتی کرتی پھوہڑ ہو گئی اور آپ اتنی سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف

کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر پر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی۔" لے، دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی بچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے، وہ کتیا ہے یا نباب جادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرے میں داخل ہونے والا ہی ہوگا۔ بچہ ڈھلے ہوئے کپڑے کی طرح چڑمڑ سا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا برا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟...... لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے کیوں کہ یہ کوئی سننے کے لیے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے، سب گناہ ہولی کا ہے۔

اُسی وقت ہولی کو سارنگ دیو رام یاد آ گیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا نا چا کرتی تھی، اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا بالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں۔

ماہندی[1] تو اوی مالوے   انیو رنگ گیو گجرات رے

ماہندی رنگت لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی، ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا، گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ نباب جادی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں —— وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

..........سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تریویدی گھاٹ پر اشنان کے لیے چلی جاتی ہیں، پھول، ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اُچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے رہے ہیں اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور —— ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیائش سمندر میں لے جاتی ہے...... ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گہنا جاتے ہیں۔ پھر دریا کی ایک لہر

آتی ہے اور پھر پاک وصاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے پھر گھنٹے، ناقوس، شنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور وغوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جمگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے ہوئے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں، کیوں کہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے تا کہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لیے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے —— چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرے میں آنے ہی والا تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کائستھ کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لیے چلی۔

اب مینا، رسیلا، بڑا لڑکا شبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے، گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں میں بہا دینا چاہتی تھی تا کہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی —— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب، ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصہ تھی، بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے خلات نجھے نجھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے، ایک اژدہا نما رسے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے اسٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ دیوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں......اور پھر وہی

اماں..........کنوارپن اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منھ کیوں چوما اور گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آپڑا۔ اس نے آگے بڑھ کے رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آچکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لیے.......اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار بعید الفہم طاقت ہے —— اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا —— دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی.......آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں —— سارنگ دیوگرام کے سامنے.......وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصے تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ کے قریب ایک ٹنڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ چند بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں.......پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا —— مرغی.......وہ لے.........چابیاں میرے پاس ہیں........پانی زیادہ ہوگا.........

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آب کاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا، عین جب کہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی، ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی چاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے پہچان لیا۔ اور کچھ دلیری سے بولی۔

"کتھورام"

کتھورام نے بھی سیتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا۔

کتھورام بولا

''ہولے''

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''کتھو بھیا...... مجھے سارنگ دیو گرام پہنچا دو......''

کتھورام قریب آیا، ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا۔

''سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟'' اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟''

ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا۔

''بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے، ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔

''ہولے...... کیا تم اسارٹھی سے بھاگ آئی ہو؟''

''ہاں''

''یہ سرپٹھ جادیوں کا کام ہے؟...... اور جو میں کاستھوں کو خبر کر دوں تو؟''

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جادوی تھی اور نہ سرپٹھ جادی۔ اس جگہ اور اور ایسی حالت میں وہ کتھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے رسے ڈھیلے کیے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیو گرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کتھورام بولا ''ڈرو نہیں ہولے...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹتے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔''

کتھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کتھورام اور اس

کے ساتھی کو وہ تکتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے تھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟"

تھورام نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ تھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد تھورام اندر آیا تو اس کے منھ سے شراب کی بو آرہی تھی.........

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی، سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لیتی گئی ـــــ دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف........ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی............ پھر شنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی، سرپٹ، بگٹٹ............ وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی............ اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کو قرضہ وصول کیا تھا............ دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے............ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور ساحل سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں ـــــ

دان کا وقت ہے........

چھوڑ دو........ چھوڑ دو............ چھوڑ دو............

ہر پھول بندر سے آواز آئی

پکڑ لو........ پکڑ لو............ پکڑ لو............

چھوڑ دو........... دان کا وقت ہے........ پکڑ لو........... چھوڑ دو!!

○○

لے : ماہندی (حنا) تو مالوہ ـــــ وسط ہند میں پیدا ہوئی۔ اس گھر میں گجرات رنگا ہوا ہے۔ (گویا) اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

ابابیل

خواجہ احمد عباس

اُس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لوہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ مرا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا —— ’’ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے —— ‘‘بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا —— ’’کیوں بے نتھو،

تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا۔ اور اب چھدو تیری بھی شامت آئی ہے گیا۔'' اور پھر ان غریبوں کی شامت آہی جاتی سوت کی رسّی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو اُدھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کے بیوی بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا —— ''ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا —— ''بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہو گیا —— ''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اُتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا چولھے کو جا کر دیکھا تو

ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پئے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالو۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا، ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دیکھا دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

اری آنکھ پھوڑے گی —— ''اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا۔ اور گھڑونچی پر سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا، لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اُڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیئے تھے۔ اب دُنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کبڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا —— ''ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں —— '' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسبِ معمول باسی روٹی کے ٹکڑے

کر کے ابابیلوں کے گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اسی طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا۔ اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اس نے پروا نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیلدار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا —— "ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمہیں کون کھانا دے گا —— " چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔" کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا۔ "صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دے دیں گے کہ پاگل خانہ بجھوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی پر چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

OO

کتبہ

غلام عباس

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے، جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے، مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا، بخرات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اُسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی ان ہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے

چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض من چلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں کوٹ کاندھے پر گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی، اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگ روٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے، اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فاؤنٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی۔ مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی۔ جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے۔ بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اُسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی اسکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیش تر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا۔ اور کند اُسترون سے متواتر ڈاڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں۔ جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑ چڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔ جس کی سیڑھیوں کے گردا گرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں۔ اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع و ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُر لطف تماشہ تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک، دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیٹریاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پُرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھیک، بدھ کا نیم قد مجسمہ.........

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی، جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

''کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتایئے کیا دیجئے گا!''

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

''ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔'' یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

''اجی بنیے تو، کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں......اچھا لے جایئے۔''

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اُسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کرکے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے......یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک کی ہی سی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اُس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آچلا تھا مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا۔ اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبہ کی دل کش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑے ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے۔ جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے........

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اُس کے حصہ مکان میں دو کوٹھریاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھری میں تھی۔ مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبہ کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا۔ تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں۔ اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کی بیوی بچے نہیں آئے، وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی۔ اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ گرا نہ دے۔ اُسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس کے صندوق ہی میں پڑا رہا جب گرمی کا موسم آیا۔ تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو ہٹانا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ کو بھی نکال کر کاٹھ کے اس بڑے بکس میں ڈال دیا۔ جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے بُرش، بے کار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور

ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے بڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا۔ جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا، اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے، اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی، تو اس کے افسروں نے اس کی ذہانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی۔ جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبہ کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ کو نکالا، صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا۔ کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دُگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا اُن کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا۔ ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے............ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے............ ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے............

مگر جب تین مہینے گزر رہے نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آجانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے، وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی

سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر نظر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ کے گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر، کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے، کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے۔ جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھری دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے۔ مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آدھ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم۔ اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان

کے لیے نوکریوں کی تلاش۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی۔ جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اُس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی۔ مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور وہ زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا۔ پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی اور اسے نمونیہ ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی۔ جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

OO

اخبار نویس

احمد ندیم قاسمی

حاتم نے عباس کی ایک نہ مانی اور اس کے بازو میں بازو پھنسا کر یوں چلنے لگا جیسی گرفت ذرا سی ڈھیلی ہوئی تو عباس واپس بھاگ جائے گا۔

''تم چلو تو سہی'' حاتم کہہ رہا تھا۔ ''سیٹھ کو صاف صاف اپنی شرائط بتا دینا۔ وہ ضرورت مند ہے۔ مان جائے گا۔ آخر اس نے روز نامہ ''عدل'' خرید رکھا ہے۔ جب تک اسے کوئی معقول ایڈیٹر نہیں ملتا، وہ اخبار کو مارکیٹ میں نہیں لانا چاہتا اور اس وقت وہ معقول ایڈیٹر تم ہی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اتنے دنوں سے بیکار پڑے ہو۔ بیکار آدمی تو اکیلا بھی ہو تو خود کشی کی سوچنے لگتا ہے اور تم تو بال بچوں والے ہو۔''

عباس پہلے تو ایک طرح سے گھسٹتا چلا گیا۔ پھر معمول کی رفتار اختیار کر لی مگر اس کا احتجاج جاری رہا۔ ''میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا حاتم، جو انسان کو اپنی بساط کا مہرہ سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ صحافت سے میرا روزگار بھی وابستہ ہے مگر میں صحافت میں ممکن حد تک دیانت کو شامل سمجھتا ہوں اور اگر میں نے دیانت سے کام لے کر سیٹھ کے اخبار میں لکھنا شروع کر دیا تو وہ مجھے ایک دن بھی برداشت نہیں کرے گا۔ تم خواہ مخواہ کا تکلف کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم سیٹھ کے دوست ہو مگر سیٹھ کے ذہن میں اس دوستی کی بھی کوئی قیمت ضرور مقرر ہو گی ورنہ تم تو اپنے درمیانے طبقے کے آدمی ہو۔ اس طبقے کے لوگوں کو اونچے طبقے والے دوست نہیں رکھتے۔ وہ ان سے صرف کام لیتے ہیں۔ وہ صرف نٹ بولٹ کسنے کے کام آتے ہیں۔''

حاتم اس کی گفتگو سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر وہ سیٹھ کے محل کے طویل و عریض صدر دروازے میں سے گزر کر جب پورچ میں پہنچے تو عباس نے وہاں ایک ایسی موٹر کار کھڑی دیکھی جو اس سے پہلے اس نے ٹی وی پر اس وقت دیکھی تھی جب برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کینیڈا کے دورے پر گئی تھی اور ہوائی اڈے سے اپنی قیام گاہ تک ایسی ہی موٹر کار میں سوار ہوئی تھی۔ یہ ایک کار دو کاروں پر مشتمل معلوم ہوتی تھی۔ عباس نے سوچا کہ اگر ایسی کار میں صرف ایک آدمی سفر کر رہا ہو تو وہ بے چارہ کتنا اکیلا اکیلا لگتا ہوگا۔

جب وہ سیٹھ کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو عباس چکرا کر رہ گیا۔ انسان نے اب تک جتنے بھی رنگوں کا کھوج لگایا ہے، وہ سب اس لمبے چوڑے کمرے کے پردوں، صوفوں، کشنوں اور غالیچوں میں استعمال کر دیے گئے تھے۔ حد یہ کہ مرکزی میز پر جو ایش ٹرے اور سگریٹ کیس رکھے تھے، وہ بھی قوس قزحی رنگوں سے آراستہ تھے۔ حاتم نے عباس کو پیش کرنے کے لیے ایک سگریٹ کیس کا ڈھکنا اٹھایا تو پیانو کے سریلے سر بجنے لگے۔ تب عباس نے کہا۔۔۔ ''یہ سگریٹ کیس تو بانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ لیجیے سیٹھ صاحب، آپ کو ایک اور سگریٹ کا خسارہ ہوا۔''

عباس نے اس توقع سے حاتم کی طرف دیکھا کہ وہ بے اختیار ہنس دے گا مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بھویں اچکا کر صوفوں پر بیٹھے ہوئے دو لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور زبانِ بے زبانی سے التجا کی کہ اتنی بے تکلفی مت برتو اور یہ بھی دیکھو کہ تم یہاں اکیلے نہیں ہو۔ سیٹھ صاحب کے دوسرے مہمان بھی بیٹھے ہیں۔ عباس نے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی کہ شاید ان میں سے کوئی مسکرا رہا ہو، مگر سب پتھر کے بت بنے بیٹھے تھے۔ ماحول کی اس سنگینی سے عباس کے منھ کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ بولا۔ ''یار۔ یہاں سادے پانی کا ایک گلاس مل سکے گا؟''

اتنے میں ایک باوردی ملازم طشت میں سبز اور گلابی اور سنہری اور سفید مشروبات کے گلاس رکھے آیا۔ عباس نے ایک گلاس اٹھا تو لیا مگر پھر استفہامیہ نظروں سے حاتم کی طرف دیکھا۔ تب حاتم مسکرایا اور بولا۔ ''عام شربت ہے بھئی۔ گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟''

''عام شربت ہے؟'' ایک مہمان نے حیرت سے دوسرے مہمان کو دیکھا اور دونوں نے بھرے ہوئے گلاس طشت میں واپس رکھ دیے۔

عباس ان کی مایوسی دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور اپنا گلاس مہمانوں کو جیسے دکھا دکھا کر غٹا غٹ پی گیا۔ یہ بادام یا الائچی یا ایسی ہی کسی چیز کا شربت تھا۔

حاتم کہیں اندر چلا گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد واپس آیا تو بولا۔ ''سیٹھ صاحب نہا رہے ہیں مگر انھوں نے فرمایا ہے کہ ہم دونوں ان کے بیڈ روم میں آکر بیٹھ جائیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔''

حاتم اور عباس کئی کمرے اور برآمدے اور گیلریاں اور راہداریاں عبور کرتے ہوئے سیٹھ کی خواب گاہ تک پہنچے۔ اس خواب گاہ کا رقبہ اتنا تھا کہ اگر اتنا رقبہ کسی ہما شما کے پاس ہو تو وہاں تین چار کمروں کا گھر تعمیر کر لے۔ پلنگ اتنا بڑا تھا کہ اس پر ایک وقت میں نصف درجن انسان استراحت کر سکتے تھے۔ اس پر جن کشنوں کے انبار لگے تھے۔ ان پر بھی رنگوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک طرف چھ یک نشستی صوفے نیم دائرے میں رکھے تھے۔ ایک پر ایک سونڈ بونڈ صاحب بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ حاتم اور عباس نے سلام کیا تو انھوں نے سر کی نہایت خفیف جنبش سے جواب دیا۔ عباس یہ سمجھا کہ یہی سیٹھ صاحب ہیں اور نہانے کے بعد کپڑے بدل کر ملاقات کے لیے تشریف فرما ہیں، ورنہ کوئی بھی دوسرا آدمی سلام کے جواب میں سر کو اتنی ذرا سی جنبش نہیں دیتا جیسے کوئی جنبش ہوئی ہی نہ ہو۔

عباس مسلسل حاتم کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کرے تو بات آگے بڑھے، مگر حاتم کی نظریں کسی اور طرف تھیں۔ تب اچانک ایک دروازہ کھلا اور سیٹھ صاحب ایک قد آدم تولیہ لپیٹے کمرے میں تشریف لے آئے۔ حاتم اور عباس کھڑے ہوئے تو سگار پینے والے صاحب اس سے بھی زیادہ عجلت سے کھڑے ہو گئے اور سیٹھ نے پہلے انھیں مخاطب کیا۔ ''کیسا رہا سگار؟''

وہ صاحب بولے۔ ''سگار کیا پی رہا ہوں قبلہ، شہد کے گھونٹ پی رہا ہوں۔''

سیٹھ ہنسا۔ ''مگر سگار کی سی لطیف تلخی شہد میں کہاں۔''

وہ صاحب بولے۔ ''آپ کی یہ بات تو سینٹ پرسینٹ ٹھیک ہے۔''

پھر سیٹھ اِدھر متوجہ ہوئے۔ ''اچھا تو حاتم، یہ ہیں ایڈیٹر صاحب؟''

حاتم بولا۔ ''جی ہاں۔ یہی ہیں۔ عباس احمد نام ہے۔''

''نام تو ان کا میں نے بھی سن رکھا ہے۔'' سیٹھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر عباس سے

مصافحہ کیا اور اپنے مہمان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''آپ رانا فروغ احمد خاں ہیں۔ انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔ میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ ان کے سامنے گفتگو کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ـــــ'' رک کر سیٹھ نے دیوار پر نہ جانے کون سی جگہ کو انگوٹھے سے دبایا کہ پوری دیوار چھت تک یوں کھل گئی جیسے یہ دیوار نہیں تھی، کپڑے کا پردہ تھا۔ اوپر سے نیچے تک اور یہاں سے وہاں تک رنگ رنگ کی شراب کی بوتلیں قطار اندر قطار سجی کھڑی تھیں۔

سیٹھ نے پہلے عباس سے پوچھا۔ ''کہیے کون سی میک پسند ہے؟''

حاتم فوراً بولا ''جی یہ عباس وسکی نہیں پیتا۔''

اور عباس ہکلایا۔ ''میں تو صاحب ابھی ابھی آپ کے ڈرائنگ روم میں الائچی یا کسی ایسی ہی چیز کا شربت پی کر آ رہا ہوں۔''

سیٹھ نے سقف شگاف قہقہہ لگایا۔ ''اس کے باوجود آپ جرنلسٹ ہیں!''

عباس بولا۔ ''جی ہاں۔ اس کے باوجود میں جرنلسٹ بھی ہوں اور ایک ہوش مند انسان بھی ہوں۔''

کمرے پر جیسے ایک دم سناٹا قیامت کی طرح ٹوٹ پڑا۔ سیٹھ کے ہونٹ یوں سختی سے بھنچ گئے جیسے خود کو کچھ کہنے سے روک رہا ہے۔ مہمان صاحب کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا تھا اور حاتم غصے سے عباس کو گھور رہا تھا۔

مگر پھر سیٹھ ایک دم مسکرانے لگا اور خوش مزاجی پر اتر آیا۔

''جرنلسٹ اگر بے تکلف نہ ہو تو اسے جرنلسٹ ہی نہیں کہنا چاہیے۔ آپ کی یہ بات سن کر مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔ کیوں رانا صاحب؟'' اور اس نے کوئی بٹن دبا کر دیوار بند کر دی۔

اور انکم ٹیکس کمشنر یوں کھل کر مسکرایا جیسے سیٹھ کے اشارے کا منتظر تھا۔

سیٹھ بولا۔ ''حاتم نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میرے روزنامے کو آپ کی ضرورت ہے۔''

عباس نے حاتم کی طرف دیکھا اور پھر بولا تو مسلسل بولتا چلا گیا۔ ''آپ کے اخبار کو میری ضرورت ہے اور مجھے ایک اخبار کی ضرورت ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ میں ممکن حد تک اصولی آدمی ہوں۔ ممکن حد تک اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اتنا گندہ ہو چکا ہے کہ بعض چھوٹی چھوٹی بے اصولیاں ہماری زندگی کا معمول بن چکی ہیں اور انسان کا جی نہ بھی چاہے تو اسے اس طرح کی بے اصولی سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر بڑے بڑے مسئلوں پر نہ میں بے اصولی کا ارتکاب کر

سکتا ہوں، نہ سمجھوتا کر سکتا ہوں۔ آپ ماشا اللہ اس ملک کے کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہیں۔ آپ ملک کے سب سے بڑے ملوں کے سلسلے کے مالک ہیں۔ ملوں میں ہڑتالیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اگر آپ کی کسی مل میں ہڑتال ہوئی تو میں تو ایک دیانت دار اور بااصول ایڈیٹر کی حیثیت سے ہڑتالیوں کے حق میں لکھوں گا کیونکہ مزدور لوگ محض تفننِ طبع کے لیے تو ہڑتالیں نہیں کرتے۔ وہ تو جب چار طرف سے مجبور ہو جاتے ہیں تو ہڑتال کرتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے حق میں لکھنا ہر ایماندار ایڈیٹر کا فرض ہوتا ہے۔ اب اگر آپ کے اخبار میں آپ کی کسی مل کے ہڑتالیوں کے حق میں اداریہ آ گیا تو یقیناً آپ کے لیے یہ صورت ناقابلِ برداشت ہوگی اور مزدوروں کے حق میں نہ لکھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا، اس لیے میرے لیے آپ کے اخبار کی ادارت سنبھالنا مشکل ہے۔ میں حاتم سے یہ ساری باتیں کر چکا ہوں مگر وہ مجھے مجبور کر کے آپ کے پاس لے آیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول کریں گے۔"

اس تمام دوران سیٹھ یوں مسکراتا رہا جیسے یہ سب کچھ اسے پہلے سے معلوم ہے۔ پھر بولا۔ "شاید آپ نے میری ملیں نہیں دیکھیں۔ سب ملیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ میں نے مزدوروں کی رہائش کے، علاج کے، ان کے بچوں کی تعلیم کے، ہر سال ان کے بونس کے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں اور ان کی اتنی معقول اجرتیں مقرر کر رکھی ہیں کہ ان کے ہڑتال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر جب ہماری ملوں میں کبھی ہڑتال ہوگی ہی نہیں تو آپ کو مجھ سے یا مجھے آپ سے کیا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ کسی دوسری مل میں ہڑتال ہو اور آپ مزدوروں کے حق میں لکھیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری صنعت کار برادری احتجاج کرے گی تو میں انھیں سمجھا دوں گا کہ آزادیٔ رائے میرا پختہ اصول ہے سو میں اپنے اخبار کے ایڈیٹر پر کوئی پابندی کیسے عائد کر سکتا ہوں۔ سمجھے آپ؟ یہ مسئلہ تو یوں طے ہوا۔ اب مطلب کی بات بھی طے کر لینی چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ جس اخبار کی ادارت آپ نے چھوڑی ہے وہاں سے آپ کو سات ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میں اکیس ہزار روپے ماہانہ نذر کروں گا۔ آپ کو ایک بنگلہ بھی ملے گا۔ پانی، بجلی، گیس کا بل بھی اخبار ادا کرے گا۔ ایک آرام دہ کار بھی ہوگی جسے آپ جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں گے اور پٹرول اور مرمت وغیرہ کا خرچ اخبار ہی برداشت کرے گا۔ تنخواہ کے علاوہ آپ کو میڈیکل الاؤنس وغیرہ کے نو ہزار روپے ملیں گے۔ یوں ٹوٹل تیس ہزار ماہانہ بیٹھتا ہے۔ یہ اتنے بڑے افسر آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کی تنخواہ اس رقم سے نصف سے بھی کم

ہوگی۔ کیوں فروغ صاحب؟''

انکم ٹیکس کمشنر نے نہایت نیاز مندی سے ''جی ہاں'' کے الفاظ ادا کیے۔

سیٹھ پھر بولا ''عباس صاحب۔ اگر آپ کسی مد میں اضافہ چاہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میرے اخبار کو آپ اور صرف آپ ایک معیاری اخبار بنا سکتے ہیں۔ اب بتایئے۔ کیا فیصلہ ہے آپ کا؟''

تیس ہزار روپے ماہانہ!——نصف جس کے پندرہ ہزار ماہانہ ہوتے ہیں اور پھر مفت بنگلہ، مفت کی کار——عباس احمد کرسی پر بیٹھا نہ ہوتا تو اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ کچھ دیر تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ پھر حاتم کی آواز آئی۔ ''کیا سوچ رہے ہو عباس؟ تمہارے اصول بھی محفوظ ہیں اور تمہیں اتنی بہت سی سہولتیں بھی پیش کی جا رہی ہیں۔ ملک کا یقیناً تم پر حق ہے مگر تمہارے بال بچوں کا بھی تو کچھ حق ہے۔ اس حق کو پورا کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوگا؟''

عباس احمد نے خاصی محنت کے بعد اپنا توازن سنبھالا اور سیٹھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دو تین دن کی مہلت چاہیے تاکہ میں سوچ لوں اور کسی حتمی فیصلے پر پہنچ سکوں۔''

''ٹھیک ہے'' سیٹھ بولا۔ ''کیوں حاتم؟''

''بالکل ٹھیک ہے سر'' حاتم بولا۔

سیٹھ نے عباس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اخبار کے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ سمجھے آپ؟''

''جی'' عباس بولا اور حاتم کے ساتھ باہر پورچ میں آ گیا۔

حاتم نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آیا مگر عباس نے کہا۔ ''میں گھر تک پیدل جانا چاہتا ہوں۔ راستے میں بھی سوچتا جاؤں گا۔ آج میں نے روزانہ کی ٹہلائی بھی نہیں کی۔''

حاتم بولا۔ ''جیسا تمہارا جی چاہے، مگر یار۔ جذبے کے علاوہ انسان میں عقل بھی ہوتی ہے۔ عقل سے کام لینا۔''

عباس مسکرایا اور بازو الوداعی انداز میں بلند کر کے بنگلے سے باہر آ گیا۔

بھئی۔ بہت معقول پیش کش ہے۔'' اس نے خود اپنی سرگوشی سنی اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ سکڑ کر کیڑا سا بن گیا ہے اور اپنے بل کی تلاش میں رینگتا جا رہا ہے۔

اس نے رک کر اپنا سر دائیں بائیں زور سے جھٹکا۔ دونوں ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں زور زور سے ملیں اور تیز تیز قدم اٹھا کر گھر کا رخ کیا۔

تیں ہزار روپے اور بنگلہ اور لمبی چوڑی ''کار'' اور ——— ''سوچتے سوچتے وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی جون بدل گئی ہے اور وہ انسان سے چیونٹا بن چکا ہے۔ اس کے قدموں کے پاس کالے کالے چیونٹوں کی ایک قطار جا رہی تھی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ مگر چند ہی قدموں کے بعد جب یہ چیونٹے ایک درخت کے تنے پر چڑھنے لگے اور اس نے درخت کی آخری پھننگ کو دیکھا کہ آسمان میں اتر کی جا رہی ہے تو کانپ گیا اور چکرا کر بیٹھ گیا۔ فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے دو آدمی اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ اٹھا اور جب گھر پہنچا تو اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ''کیا ہوا آپ کے دشمنوں کو؟'' اس کی بیوی سلمٰی نے گھبرا کر پوچھا۔ مگر وہ سیدھا اندر کمرے میں چلا گیا اور پلنگ پر گر کر تکیہ چہرے پر رکھ لیا۔ ''میں کچھ سوچ رہا ہوں'' وہ بولا۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''کیا سوچنے دوں؟'' بیوی دروازے پر سے بولی جہاں تینوں بچے خوفزدہ سے کھڑے تھے۔ ''مجھے کیوں نہیں بتاتے آپ؟''

اور عباس تکیہ ایک طرف پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ ''نہیں بتاتا۔ نہیں بتاتا۔ میری سوچوں پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو ——— جاؤ!''

چھوٹا بچہ ڈر کر رونے لگا۔ سلمٰی سب کو سمیٹتی دروازے پر سے ہٹ گئی۔ عباس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا۔ پھر وہ چت لیٹ گیا۔ اس کی نظریں چھت کے ایک نقطے پر جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک چھپکلی کسی مکھی مچھر کی تاک لگائے بیٹھی تھی۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنے شکار پر جھپٹی اور پوری چھت عبور کر کے دیوار پر آ گئی۔ عباس کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ جب چھپکلی دیوار سے اتر کر فرش پر آئی تو عباس پلنگ پر اٹھ بیٹھا۔ چھپکلی ایک مقام پر پتھر بنی بیٹھی رہی۔ عباس بھی بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ واپس دیوار کی طرف لپکی تو عباس بھی اٹھ کر دیوار تک یوں بے ارادہ آ گیا جیسے اس کی نکیل چھپکلی کے ہاتھ میں آ گئی ہو مگر چند پل چھپکلی کو گھورتے رہنے کے بعد وہ سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور میز سے ایک پیپر ویٹ اٹھا کر پوری قوت سے چھپکلی کو نشانہ بنا کر مارا۔ چھپکلی چھت کے دوسرے کونے کی طرف لپک گئی

اور پیپر ویٹ نے سنگار میز کے شیشے پر گر کر اسے کرچی کرچی کر ڈالا۔ اس کی بیوی حواس باختہ اندر آ گئی۔ اور پکاری ''کیا ہوا؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ یہ شیشہ کیوں توڑ دیا آپ نے؟''

اور عباس چھت کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''اس چھپکلی سے پوچھو۔''

''چھپکلی سے پوچھو!'' بیوی نے حیرت سے یہ الفاظ دہرائے۔ پھر زار زار روتی ہوئی باہر بھاگی۔ ''ہائے میں مر جاؤں، انھیں تو کچھ ہو گیا ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے خدانخواستہ؟'' پڑوسن نے دیوار کے ادھر سے پوچھا۔

اور عباس احمد کمرے سے باہر آ گیا۔ ''کچھ نہیں ہوا بہن صاحبہ۔ میرے ہاتھ سے پیپر ویٹ چھوٹ کر شیشے پر گر گیا اور یہ نیک بخت سمجھی مجھے کچھ ہو گیا ہے۔''

واپس کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھا تو سلمیٰ اندر آ گئی اور اس کے قریب آ کر بڑے پیار سے بولی۔ ''آپ کو میری قسم، مجھے سچ سچ بتائیے آپ کو کیا ہوا ہے۔''

''سچ سچ بتاؤں؟'' عباس نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ سچ سچ بتائیے''، سلمیٰ بولی۔

''اچھا تو سچی بات یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے انسان سے چھپکلی بن گیا تھا۔ اس سے پہلے ایک کیڑا بنا تھا۔ پھر مکوڑا بنا تھا۔ میں وہ نہیں رہا جو میں ہوں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ——''

سلمیٰ حواس باختہ کھڑی ہو گئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ ''اگر آپ مذاق کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے مگر آپ تو مسکراتے ہی نہیں۔ آپ کو میری قسم بتائیے۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟'' پھر وہ عباس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر رونے لگی۔ ''خدا کے لیے مجھے کچھ تو بتائیے۔''

عباس نے اپنے ہاتھ چھڑا کر سلمیٰ کو اپنے پہلو سے لگا لیا۔ ''بات یہ ہے سلمیٰ کہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے حاتم ایک اخبار کے مالک کے پاس لے گیا تھا۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔''، سلمیٰ بولی۔

''اس اخبار کا مالک ملک کا بہت بڑا سیٹھ ہے۔ وہ ارب پتی ہے۔ پتہ ہے ایک ارب کتنے کا ہوتا ہے؟ ایک سو کروڑ کا ایک ارب بنتا ہے اور ایک سو لاکھ کا ایک کروڑ بنتا ہے۔ حساب لگا لو کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس نے مجھے اپنے اخبار ''عدل'' کی ایڈیٹری کے لیے پتہ ہے کتنی

تنخواہ کی پیش کش کی ہے؟ بتاؤں؟ سنو گی تو بے ہوش نہ ہو جانا۔" وہ ہنسا۔

اس دوران عباس پہلی بار ہنسا تھا اس لیے سلمٰی کے چہرے پر اطمینان کی چمک آ گئی۔ وہ بولی۔ "جو بیوی اپنے میاں کی بیکاری کے دنوں کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر سکتی ہے وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔"

عباس نے سلمٰی کو ایک بار پھر اپنے پہلو میں سمیٹا۔ "سیٹھ نے مجھے تیس ہزار روپے ماہانہ اور مفت کے بنگلے اور مفت کی کار کی پیش کش کی ہے۔"

"ہائے میں مر جاؤں!" یہ کہہ کر سلمٰی جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔ وقفے کے بعد بولی۔ "بڑا سیانا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تو آپ کی ٹھیک ٹھاک قیمت لگائی ہے۔"

"قیمت لگائی ہے؟" عباس نے سلمٰی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یعنی تم کہتی ہو کہ سیٹھ مجھے خرید رہا ہے؟"

"نوکری اور کیا ہوتی ہے" بیوی نے کہا۔ "ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ملازم رکھتا ہے تو دراصل اس کی قابلیت اس کی ذہانت خریدتا ہے۔"

"یہ بات تو ہے" عباس نے سلمٰی سے اتفاق کیا۔ "مگر ہر انسان کی ایک انا ہوتی ہے۔ اگر یہ انا بھی بک جائے تو وہ رہ کیا جائے گا۔ صرف ایک سانس لیتا ڈھانچا۔ اور میں اپنی انا نہیں بیچنا چاہتا۔"

"تو پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"تمہارا خیال ہے تیس ہزار ماہانہ آمدنی کے بارے میں، جو ایک سال میں ساڑھے تین لاکھ سے بھی زیادہ ہو گی۔ پھر بنگلہ، پھر کار، پھر بنک بیلنس۔ ایک دم ہم کتنے اونچے ہو جائیں گے!"

اونچے تو ہو جائیں گے۔ سلمٰی جیسے مسئلے کو کھنگال رہی تھی۔

"وہ تو ہے۔ اونچے تو ہو جائیں گے۔"

"اونچا ہونا تو بری بات نہیں ہے نا سلمٰی" عباس بھی بلند آواز سے سوچ رہا تھا۔ "سبھی کا حق ہے کہ وہ بہتر سے زیادہ بہتر کی طرف بڑھتا رہے۔"

"کیوں نہیں۔ سبھی کا حق ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں" عباس نے سوچ بچار جاری رکھی۔ "ادھر میرے اصول ہیں۔

اُدھر ایک سہ ماہی میں ایک لاکھ کی یافت ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اپنے اصولوں کو گھورے پر پھینکنے جا رہا ہوں۔"

"اس لیے کہ اخبار کا مالک ارب پتی ہے اور کئی ملوں کا مالک ہے؟"

"ہاں"

"اس سے پہلے آپ جن اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں وہ کون سے غریب غربا کے اخبار تھے۔ وہ بھی تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور پھر صنعت کاروں کے اخبار تھے۔"

"مگر دیکھ لو۔ جہاں بھی میری دیانت کو خطرہ پیش آنے لگا میں ملازمت چھوڑ کر گھر میں آ بیٹھا۔"

"تو اس بار آپ کو کس نے روکا ہے۔ اب کے بھی اصولوں کو خطرے کا سامنا ہوا تو گھر چلے آیئے گا۔"

عباس نے سلمٰی کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر پیار سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "یہ اتنی بہت سی دانائیاں تم نے کہاں سے سمیٹ لی ہیں سلمٰی عباس احمد صاحبہ؟"

پھر دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ بچے بھی بھاگے آئے اور ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد عباس نے سیٹھ کے بنگلے کا رُخ کیا۔ وہ بڑی آسودگی کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں بھی وہ اتنے اعتماد سے داخل ہوا جیسے سیٹھ نے آدھی کوٹھی اس کی ملکیت میں دے دی ہے۔ اس نے سیٹھ کو اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی تو اسے فوراً بلا لیا گیا۔ سیٹھ نے اپنے کمرے میں عباس سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیے۔ حاتم ساتھ نہیں آیا آپ کے؟"

عباس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے سوچا ایک مختصر سی بات ہی تو کرنی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ــــــ"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ فون کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ چونکا اٹھایا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا؟" وہ اس زور سے کڑکا کہ عباس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہڑتال اور ہماری مل میں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "نہ کوئی پیشگی نوٹس، نہ بات چیت کی کوئی کوشش، یہ کیا غنڈہ پن ہے؟ میں اپنی مل کی یہ ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ مل کی تالہ بندی کر دو۔ ورکرز سے سب سہولتیں ایک دم واپس لے لو۔ اپنی فورس کو کام میں لاؤ۔ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی انھیں

سیدھا کردو۔ مجھے پانچ منٹ کے اندر اطلاع دو کہ میرے آرڈر پر عمل ہوا یا نہیں۔ باسٹرڈ ز۔"
اور اس نے چونگا فون پر تڑاخ سے دے مارا۔

پھر مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا عباس کی طرف بڑھا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"جی۔ آپ کچھ کہنے لگے تھے۔"

"میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا تھا۔" عباس بولا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کے اخبار کی ایڈیٹری کی پیش کش قبول نہیں کر سکوں گا۔"

"تو پھر آپ یہاں کس خوشی میں آئے ہیں؟" سیٹھ صوفے پر سے اٹھتے ہوئے، فون پر کڑ کنے کے بعد دوسری بار کڑکا۔

اور عباس احمد کوئی جواب دیے بغیر اٹھا اور مسکراتا ہوا سڑک پر آ گیا۔

OO

پرندہ پکڑنے والی گاڑی

غیاث احمد گدی

صبح ہوتی، دن چڑھتا، اور سورج جب ٹھیک نصف النہار پر پہنچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی، ٹھیک ویسے ہی جیسی میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لیے نکلتی ہے۔ یہ گاڑی، جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند اور بے حد خوبصورت ہوتی کہ نگاہ اٹھ کر داد دیتی، اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی، کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو! ایک لمبا، خمیدہ کمر، زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا، بالکل اسی طرح کا دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا، جس کے ہاتھ میں پتلا سا بہت لمبا بانس ہوتا، بانس کے سرے پر برش جیسا گچھا ہوتا جس پر گوند یا اسی طرح کی چپک جانے والی لیسدار رطوبت لگی ہوتی، جس سے وہ پرندوں کو دیوار پر، چھتوں کی منڈیروں پر، ٹیلی فون کے کھمبوں، پیڑوں یا فرش پر دانہ دنکا چگتے ہوئے پرندے، جہاں نظر آتے وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور عین پرندوں کے پروں پر لیسدار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوا دیتا۔ پہلے تو پرندہ تڑپتا چھٹ پٹاتا، اڑنے کی کوشش کرتا، پھر تھک ہار کر لیسدار رطوبت سے چیں چیں کرتے ہوئے پروں کی قوتِ پرواز کے اُلجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھ سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا۔ دھیرے سے گاڑی کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتا، اس میں پرندے کو ڈھکیل دیتا۔ دروازہ بند کرتا، پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا جہاں پرندہ پھڑ پھڑا کر تھک جاتا،

اس وقت اس آدمی کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھتیں۔

ہر روز جیسے سورج سروں پر آتا، تیز کرنیں سروں میں گڑتیں، پچھلی دروازے کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی صدا سنائی دیتی۔ ذرا دیر بعد بڑی سبک خرامی سے ایک آدمی، جس کا چہرہ بے حد زرد ہوتا اور اس کی آنکھیں نیم وا ہوتیں، اس کی کمر سے پتلی سی رسی لپٹی ہوتی جو گاڑی کے سرے سے بندھی ہوتی اور نیم غنودگی کے عالم میں چلتا بڑھتا آتا، پھر جہاں کوئی چڑیا، کوئی پرندہ نظر آتا، آپ ہی آپ رک جاتا اور پیچھے چلنے والے آدمی کو پرندے کی طرف اشارہ کرتا۔ یہ روز مرہ کا دستور ہوتا۔ دوکاندار دوکانوں میں سوتے، راہ گیر چلتے رہتے، موٹر کاریں تیزی سے پوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں، جوتا گانٹھنے والا جوتا گانٹھتا رہتا، خرید و فروخت جاری رہتی، شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ لیکن دن کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی، لیکن ان میں سے کسی کی نظر اٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلے سے اٹھتا، گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے۔ وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھوں اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ یہ عمل کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا، فقط چند منٹ۔ دس یا بیس منٹ تک۔ پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سکنڈ رہ گیا، تو اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے، اور پرندے پکڑتی چلی جارہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔

ایسی ہی کیفیت والا ایک دن تھا، جب میں نے ایک دوکان دار کو جلیبیوں کے تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں دیکھو، جلیبیوں پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں؟...... ابھی، جب شہر میں بیماری پھیلی ہوئی ہے، یہ مکھیاں کتنی خطرناک......!

''مکھیاں......؟'' حلوائی نے کاہلی سے ہاتھ ہلا کر مکھیوں کو اڑانے کی کوشش کی، مکھیاں ذرا دیر کو اڑیں، پھر جلیبیوں کے تھال پر ٹوٹ پڑیں۔ ''ہاں، مکھیاں تو سالی اڑتی ہی نہیں۔''

حلوائی نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم کو کیا صاحب! تم کو تو نہیں خریدنا.......''

میں نے جواب میں انکار کیا تو حلوائی نے آنکھ ماری اور سرگوشیوں سے ذرا قریب کے لہجے میں کہا:

''اور مجھ کو کیا صاحب، مجھ کو بھی تو کھانا نہیں.........!''

بس یہیں سے میں چونک گیا کہ اصل بات کیا ہے؟ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اور شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا تو کیا ملے گا کوئی خدا کا بندہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں بات آ گئی۔ میری پیشانی پر جو بہت دیر سے بلکہ کئی دنوں سے ایک تیوری کسی سنتری کی طرح کھڑی دکھ رہی تھی، سمٹ گئی۔ پھر میں ہنسا اور میں نے بھی گفتگو کے ذرا دور کے لہجے میں کہا۔ ''تو بھائی حلوائی! ایک کام کرنا، ان گاڑی والوں کی توجہ مکھیوں کی جانب مبذول کرادو.........!''

حلوائی چونک گیا اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، لیکن پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

''ارے ہاں.......مگر کیوں صاحب، مجھے اس جھنجھٹ سے کیا فائدہ؟''

''یہ جو مکھیاں جلیبی کا سارا رس......''

''ہاں یہ تو ٹھیک کہا، سارا رس چوسے چلی جاتی ہیں کم بخت......مگر صاحب مجھے اس سے کیا نقصان؟ مجھے تو فائدہ ہے۔''

''وہ کیا؟......'' میں نے حلوائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''فائدہ کیسے ہے؟''

حلوائی پہلے ہنسا۔ پھر اس نے بناسپتی میں چپڑے ہوئے توند پر ہاتھ پھیرا اور بے حد سنجیدہ ہو کر میری طرف جھک گیا۔ ''بابو تم کیا جانو دنیاداری، یہ راز کی بات ہے۔ دنیا ایسے نہیں چلتی.........''

پھر حلوائی خاموش ہو گیا۔ اور ذرا گہرا ہو کر پھر گویا ہوا۔ ''پر تُو اپنا ہمدرد لگتا ہے۔ اس لیے بتاتا ہوں، کسی سے کہنا نہیں۔ تو بابو جلیبیوں کا یہ رس جو مکھیاں چوستی ہیں تو رس اور پھر مکھیاں کہاں جاتی ہیں ذرا اتنا تو بتاؤ؟''

''کہاں جاتی ہیں.........مجھے تو پتہ نہیں۔ حلوائی، یہ تم ہی بتاؤ؟

''کہیں نہیں جاتی ہیں......... ''حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔''رس مکھیوں میں اور مکھیاں جلیبیوں کے ساتھ پلڑے پر......... سمجھے بابو؟ ایسے فائدہ ہوا!''

لیکن میں بہت دیر تک نہ سمجھ سکا اور بے وقوفوں کی طرح حلوائی کے چہرے کو تکتا رہا۔ حلوائی پھر ہنسا، پھر مونچھوں پر تاؤ دیا۔''نہیں سمجھے اب بھی.........؟''

ابھی ہماری گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ پچھمی دروازے کی جانب سے گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑی اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ ذرا دیر بعد وہ زرد رُو خمیدہ کمر آدمی دکھائی پڑتا ہے۔ حسبِ دستور اس کی کمر سے پتلی سی رسی بندھی ہوئی تھی جس کے پچھلے سرے پر وہ گاڑی پھنسی ہوئی تھی۔ آدمی اسی کاہلی سے سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا، پھر گاڑی سامنے آئی، جس کے رنگین شیشوں کے اندر دو کبوتر اور ایک گوریا بند تھے۔ کبوتر تو سر نہوڑائے ایک طرف کھڑے تھے یا پھر دھیرے دھیرے کاہلی سے چہل قدمی کر رہے تھے، لیکن گوریا تیزی سے اِدھر اُدھر پُھدکتی پھر رہی تھی اور قدرے اضطراب کے عالم میں تھی۔

اب گاڑی بیچ چوراہے پر آگئی تھی۔ دھوپ آج روز کی نسبت قدرے سخت تھی اور گاڑی گھسیٹنے والا ہاتھ کو آنکھوں کے اوپر چھجے کی شکل میں کیے آس پاس متجسس نظروں سے جھانکتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ ٹھہر گیا۔ سامنے نالی کے کنارے ایک پرندہ پیاس سے بے حال جھک جھک کر نالی سے پانی پی رہا تھا اور گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا تھا۔ اُسے کسی بات کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ جبھی گاڑی کھینچنے والے آدمی نے بانس والے ساتھی کو اشارہ کیا۔ بانس والے نے چپکے سے لپک کر پرندے کو جا لیا۔ ذرا دیر بعد اس نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے دروازے کا پٹ کھولا اور دھیرے سے پرندے کو اندر دھکیل دیا۔ پرندہ ایک طرف کو لُڑھک گیا تو پھدکتی ہوئی گوریا ایک بار زور سے گاڑی کے اندر شیشوں پر پھڑ پھڑانے لگی گویا بند شیشوں کو توڑ کر نکل بھاگے گی۔ بانس والے آدمی نے مسکرا کر شیشوں کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک آگئی، پھر اس نے شیشے پر ہلکے ہلکے تھپکیاں دیں، گوریا سہم کر ایک طرف ہو گئی۔ اس کے بعد ویسی ہی ہلکی چال سے گاڑی آگے بڑھی۔ گھنٹیوں کی آواز خاموش فضا میں سنائی دی۔ ٹن ٹن ٹن.........ٹن ٹن ٹن.........

ذرا دیر بعد گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''گئی.........چلی گئی.........''

''ہاں، چلی گئی، اس پرندے کو بھی لے گئی۔'' جب فضا کا سحر ٹوٹا تو گاڑی اُتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اتر چکی تھی۔ اور اب دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ فقط اس کے پہیوں سے اڑتی ہوئی دھول تھی، جو دھیرے دھیرے فضا سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھ رہی تھی۔ پھر چند منٹ بعد تماش بینوں کے چہروں پر جو حیرت کے اثرات تھے، وہ زائل ہو گئے اور وہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے!

''اچھا بھائی جان........ یہ پرندے والی گاڑی........''

سوال کرنے والا رک گیا اور خاصی دیر تک رُکا رہا۔ تب میں نے پلٹ کر دیکھا، ٹھیک میری پشت پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا میری طرف مجسم سوال بنا تک رہا تھا۔

''یہ پرندے والی گاڑی'' وہ لڑکا اتنا کہہ کر پھر رُک گیا، جیسے اسے خود پتہ نہیں کہ پوچھنا کیا ہے۔

''ہاں ہاں...... میاں، کیا پوچھنا چاہتے ہو پرندے والی گاڑی کے متعلق......؟''

''جی بھائی جان، اتنا کہ...... یہ گاڑی ہے پرندہ پکڑنے والی........''

''ہاں میاں، ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا گاڑی ہے! ہر روز دوپہر میں آتی ہے اور شہر کے جتنے پرندے ہاتھ آتے ہیں، سمیٹ کر چل دیتی ہے۔''

''اچھا بھائی جان........'' ذرا دیر بعد اس لڑکے نے یوں چونک کر سوال کیا، گویا اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''اچھا بھائی جان، کیا یہ لوگ باجی کے لقا کو بھی لے جائیں گے؟''

''ہاں ضرور لے جائیں گے۔ فقط دیکھنے کی دیر ہے.........''

''پھر باجی اچھی کیسے ہوں گی؟ انھیں لقوہ ہو گیا ہے نا۔ حکیم جی نے کہا تھا کہ دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا بھی چاہیے۔''

لڑکے نے بڑی حسرت سے کہا، یوں کہ میں اس کے افسردہ چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔

''ہاں ہاں، بات تو سوچنے کی ہے، لقا کبوتر کو نہیں جانا چاہیے........''

''پھر میں کیا کروں، آپ ہی بتایئے بھائی جان؟........ میں تو بہت چھوٹا ہوں نا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میاں........ اور سچ پوچھو تو میں بھی بہت چھوٹا ہوں!''

''آپ چھوٹے ہیں؟''......وہ لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''آپ اتنے بڑے ہیں، واہ''......لڑکا قہقہے لگانے لگا۔

میں خاموشی سے بدستور اسے دیکھتا رہا اور میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''میاں تم ہنس رہے ہو؟''

''بھائی جان، ایک اور بات پوچھوں؟'' اس نے ذرا ٹھہر کر دوسرا سوال کیا۔

''پوچھو میاں، وہ بھی پوچھ ڈالو......''

''آپ اتنے اداس، بھائی جان آپ کبھی ہنستے کیوں نہیں؟''

میرا جی چاہا سچ کہہ دوں۔ کیسے ہنسوں میاں، اس کارگہ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے مگر اس معصوم بچے کو جو ذرا دیر پہلے لقا کبوتر کے چلے جانے کی فکر میں اداس تھا، اور اب سے ذرا دیر پہلے قہقہے لگا رہا تھا، کچھ نہیں بتا سکا۔ فقط پیار سے اسے دیکھتا رہا۔

''بھائی جان میں آپ کو ہنسا دوں......؟'' وہ لڑکا بڑی محبت سے میری طرف بڑھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا...... ''آپ کہئے تو میں آپ کو ہنسا دوں؟''

پہلے تو میں چونکا۔ دفعتاً مجھے عجیب سا لگا، ناسمجھی میں اس لڑکے نے ذرا اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ پھر میں نے ذرا محبت سے تاکید کی:

''میاں آہستہ بولو۔ دھر لیے جاؤ گے۔ کسی نے سن لیا تو پولیس کو خبر کر دے گا کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اس کی بہن بیمار پڑی ہے اور اس کا لقا کبوتر بھی چلا جانے والا ہے۔ اور یہ خود ہنستا بھی ہے اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی سوچتا ہے۔ ہوش کے ناخن لو میاں، مفت میں پکڑے جاؤ گے۔''

''بلا سے پکڑ لیا جاؤں۔'' لڑکے نے حوصلے سے کہا۔ ''آپ کہیے تو ہنسا دوں آپ کو؟''

''ہنسا دو میاں، بڑا کرم ہوگا۔ بڑی مہربانی ہوگی تمہاری......''

''تو پھر دوستی کیجئے۔'' اس نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تم سے دوستی! ارے چھٹنکی تمہارے اتنے اتنے تو میرے بیٹے ہیں۔ میں تو تمہارے باپ کے برابر ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ باپ بھی دوست ہوتے ہیں۔ میرے مولوی جی کہتے ہیں اچھے باپ اپنے بچوں کے دوست بھی ہوا کرتے ہیں؟''

"یہ بات ہے.........تو ہوا دوست تمہارا آج سے۔" میں نے اس کے ننھے سے خوبصورت ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

"پھر چلیے میرے ساتھ ندی کی طرف۔ وہاں آپ اور ہم دو ہی ہوں گے۔ وہاں میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گا۔"

وہ لڑکا مجھے گھسیٹتا ہوا ندی کی طرف لے چلا۔ میں پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے، راہ گیر پلٹ پلٹ کر ہماری دوستی کو دیکھتے رہے اور ہم پلٹ پلٹ کر راہ گیروں کو تک رہے تھے۔ جن کے کوئی دوست تھے بھی یا نہیں، جن کے کوئی ایسے پیارے بیٹے تھے بھی یا نہیں! اور جب ہم ندی کے قریب پہنچے تو اس نے پہلے تو چالاک نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اپنے نیکر کی جیب سے ماچس کی ایک ڈبیہ نکالی، مسکرایا، میری طرف پلٹا اور گہری سرگوشی میں بولا۔ "اس میں ہے..........."

جواب میں میں نے بھی اتنی ہی ہوشیاری سے پہلے بائیں طرف دیکھا، پھر دائیں طرف دیکھا۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اتنی ہی سرگوشی میں پوچھا:

"کیا ہے اس میں؟"

"یہ ہے، یہ ہے اس میں۔" لڑکے نے کہا اور جھٹ سے ماچس کے اندرونی حصے کو باہر دھکیل دیا۔ ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ تتلی نیم جان سی پڑی تھی۔ جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کے ننھے ننھے پروں کے اردگرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ اور پروں کے عین درمیان زیرے کے برابر سرخی تھی۔ اور اس سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھلکا ہوا تھا اور پروں کے کناروں پر افشاں چمک رہی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دکھ رہی تھی۔

میں تتلی کو غور سے دیکھتا رہا اور ذرا دیر رنگوں کی دنیا میں کھویا رہا......جب تک میں ڈوبتا ابھرتا رہا، وہ لڑکا اتنے ہی انہماک سے میرے چہرے کے خط و خال پر کچھ ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے تتلی کی طرف سے نظر اٹھائی، لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ قدرے افسردگی سے میری طرف پلٹا......."آپ تو عجیب ہیں بھائی جان........آپ تو تتلی کو بھی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے.......!"

"ہاں میاں......." مگر میں چونک اٹھا۔ اس دس برس کے بچے نے تو بہت دور پہنچ

کر پکڑ لیا۔

''یہ تم نے کیا کہہ دیا میاں کہ میں..........''

''ہاں، بھائی جان''..........اس نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا.........''آپ تو تتلی سے بھی خوش نہیں ہوئے۔ کیسے ہماری دوستی نبھے گی..........؟''

''نہیں نبھے گی میاں، کبھی نہیں نبھے گی..........''

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، مگر ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہ لڑکا بھی ہمراہ رہا ....''لیکن بھائی جان وہ میر القا کبوتر، وہ گاڑی.......''

دوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا۔ جوتے گانٹھنے والے موچی سے، کپڑے بیچنے والے بزاز سے، بھیڑ میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے، روٹی اور دال بیچنے والے سے، راہ گیروں سے، سفید پتلون والے سے، تیز رفتار بابو سے، بوجھ ڈھونے والے قلی سے، رنگین دوپٹے والی خاتون سے، جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے گویا سارے زمانے کو روند کر گزر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، دونوں سیاستدانوں سے، جو آپس میں سازشی انداز سے گفتگو میں مصروف لپکے چلے جا رہے تھے میں ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا، تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکامیاب کوشش کی، کہ دس سالہ بچے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لیے کہا ہے۔ اگر یہ گاڑی والے، بچے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہوگا——؟

مجھے کسی نے جواب نہیں دیا۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہے۔ اس لیے میں دس سالہ بچے کے سوال کو پی گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ مجھے افسوس تھا۔ اداس سر جھکائے چلا جا رہا تھا، میرے پاؤں تھک گئے تھے۔

دوپہر سے شام ہونے کو آ گئی تھی۔ سُرمئی اندھیرے کا جنم ہونے والا تھا کہ میری نظر چوک کے ایک کوٹھے پر گئی، جہاں شہر کی مشہور رنڈی منّی بائی بالکونی میں کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ منّی بائی کے سامنے اڈے پر اس کا طوطا دائیں بائیں گردن گھما گھما کر جھوم رہا تھا وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی جا رہی تھی اور طوطے کو پڑھاتی بھی جا رہی تھی۔

میں چپکے سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اس کے کمرے کو عبور کر کے بالکونی میں عین منّی بائی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ وہ میری آمد سے مطلق بے خبر طوطے کو پڑھانے میں محو تھی۔ ''بولو میاں

مٹھو، نبی جی روزی بھیجو............"

مٹھو نے اڈے کے دائیں اور بائیں جانب رکھی ہوئی دونوں پیالیوں کو گردن گھما کر دیکھا، پھر ایک پیالی پر جھک کر ہری مرچ کو کتر کر منی بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "نبی جی روزی بھیجو........."

"نبی جی روزی بھیجو........."

"نبی جی روزی بھیجو۔" طوطے نے اسی طرح اکڑ کر کہا۔

"سو میں آ گیا۔" اس کے پیچھے کھڑے، میں نے آہستہ سے کہا۔ "منی بائی سن کر چونک اٹھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے گھورا، ذرا دیر کو سہم گئی۔ پھر ڈپٹ کر بولی۔ "تم کیسے آئے جی، کون ہو؟"

"سیڑھیوں سے جی، مجھے نہیں پہچانا۔ منی بائی، مجھے نبی جی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

منی بائی یہ سن کر ہنس پڑی۔ "اچھا اچھا جی، چلو ادھر بیٹھو تخت پر۔" اس نے کنگھی کے دانتوں سے سنہرے بالوں کا گچھا نکالا۔ اسے گولی بنا کر اس پر تھوکا، پھر نیچے سڑک پر پھینک دیا۔

"بڑی طوطا چشم ہو منی بائی۔" ذرا سے میں طوطے کی طرح رنگ بدلتی ہو۔" جواب میں منی بائی نے ایک اور رنگ بدلا اور مسکرا پڑی۔

تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کے قدموں پر چودہ روپے کے ایک ایک کے نوٹ رکھ دیئے۔

آج میرے پاس اتنے ہی ہیں جی، تمہارے نبی جی نے آج بڑے غریب آدمی کو ادھر بھیجا۔"

"نہیں جی یہ بھی کیا کم ہیں........ ہم تو اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا جانتے ہیں۔" لیکن بہت دیر ہو گئی اور میں نے منی بائی سے کوئی خدمت نہیں لی تو وہ جھلا گئی۔

"یہاں کاہے کو آئے ہو جی.... اور یہ روپے کیوں دیے.....؟"

"منی بائی، برا نہ مانو، میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ تم سے بھی پوچھ دیکھوں، تم کیا کہتی ہو۔"

"کاہے کے بارے میں؟"

''یہ جو آج کل ہر روز دوپہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے، اس کو دیکھتی ہو؟''

''ہاں دیکھتی تو ہوں کبھی کبھی......''

''تو تمہیں کیسا لگتا ہے......؟''

''اچھا جی......اچھا لگتا ہے......پیلے پیلے، لال لال خوبصورت شیشوں میں سے پرندے چمکتے ہوئے بہت بھلے دکھتے ہیں۔

''بہت دور سے دیکھتی ہونا......جتنی دور سے تمہیں چاہنے والے دیکھتے ہیں۔''

''ہاں جی، اس بالکونی سے......''

''منی بائی، کسی دن نیچے جا کر قریب سے دیکھو......''

''وہ کیوں؟ مجھے اتنی فرصت نہیں ہے جی''۔ منی بائی نے ناگواری سے میری اور دیکھا، پھر غالباً اسے میرے چودہ روپے کے نوٹ یاد آ گئے تو وہ مسکرا پڑی۔ ''تم مجھے ذرا قریب سے دیکھو نا جی......!''

''سو تو دیکھ ہی رہا ہوں منی بائی، اور تم بھی دیکھ لو گی جس دن گاڑی والے تمہارے طوطے کو پکڑ لے جائیں گے۔''

''میرے طوطے کو کیوں لے جانے لگے جی۔'' منی بائی نے کڑک کر برجستہ کہا۔ ''یہ کوئی سڑکوں پر پھرنے والا آوارہ پرندہ ہے؟ یہ تو پالتو ہے میرا ہیرامن۔''

''ہاں منی بائی، پہلے تو وہ سڑکوں پر ملنے والے پرندوں کو پکڑیں گے۔ پھر......کچھ دنوں بعد......لال لال، پیلے پیلے خوبصورت شیشوں کے پیچھے سے اور پرندوں کے درمیان یہ تمہارا ہیرامن طوطا دیکھنے میں کتنا اچھا لگے گا۔ تم دیکھو نہ دیکھو، سڑک پر چلنے پھرنے والے لوگ باگ اور دوکان میں سودا سلف بیچنے والے بنیے ضرور دیکھیں گے۔ اور سڑک پر، جو پرندے پکڑنے والی گاڑی والے دونوں آدمی سکے پھینک دیتے ہیں، ان سکوں کو اور لوگوں کے ساتھ تم بھی چننے لگو گی۔ اور یہ بھول جاؤ گی......کہ......''

''کیا بھول جاؤں گی جی......؟ بہت سے سکے مل جائیں تو ہیرامن کو کون روتا ہے؟ گاڑی والے اگر ڈھیر سارے سکے پھینک دیں تو میں سب چن لوں گی......اور بازار سے نیا طوطا لے آؤں گی!''

’’ارے منّی بائی، ہوش کے ناخن لو، یہ دنیا ہے۔ اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے۔ مان لو...... بازار میں طوطا نہ ملا اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا، اور پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر......‘‘

منّی بائی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی:

’’واہ بہت اچھا بولتے ہو جی، کہاں رہتے ہو...... کیا کام کرتے ہو؟‘‘

’’کہانیاں لکھتا ہوں منّی بائی، رہنا وہنا کیا، جہاں پایا، رہ لیا، جہاں چاہا سو لیا۔‘‘

’’اے کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا، لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گزرے ہو... تمہارا زمانہ تو ہمارے زمانے سے بھی گیا گزرا لگتا ہے...... کیوں جی؟‘‘

ہاں منّی بائی، تم تو ذرا سے میں اکٹھے چودہ رپے رکھوا لیتی ہو اور مجھے چودہ روپے حاصل کرنے کے لیے آٹھ کہانیاں لکھنا پڑتی ہیں۔ دو روپے فی کہانی کے حساب سے خریدنے والے دیتے ہیں۔‘‘

’’دو روپے فی کہانی...... یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔‘‘ منّی بائی نے مایوسی سے کہا، اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی۔ ’’دو روپے فی کہانی کے حساب سے آٹھ کہانیوں کے سولہ روپے بنتے ہیں...... باقی دو روپے بھی نکالو جی...... جلدی کرو......‘‘

’’ہاں جی، بنتے تو سولہ روپے ہیں، مگر ایک کہانی تو ناپ تول میں چلی گئی۔‘‘

’’ناپ تول میں؟ ارے واہ۔‘‘ منّی بائی پھر ہنسی۔ ’’ناپ تول میں کیسے چلی گئی؟‘‘

’’وہ ایسے کہ جب جریدے والے کے پاس پہنچا اور اسے آٹھوں کہانیاں پڑھوائیں تو وہ جھٹ اندر سے ترازو لے آیا۔‘‘

’’ترازو! کہانیاں کیا تول کر بکتی ہیں؟‘‘

’’خدا کا شکر ہے منّی بائی، ابھی تک تو تول کر بکتی ہیں کچھ دنوں بعد دیکھنا بے تولے بیچنا پڑیں گی۔‘‘

’’اچھا اچھا۔ پھر وہ ترازو لے آیا؟‘‘...... منّی بائی نے دلچسپی سے کہا۔

’’ہاں، ترازو لے آیا۔ ڈنڈی ملائی تو ایک طرف پاسنگ تھا۔ اس نے جھٹ آدھی کہانی نوچ لی اور دوسری طرف والے پلڑے پر رکھ دی۔ جب پاسنگ برابر ہو گیا ایک طرف وزن کے سات پتھر رکھے اور دوسری طرف ساڑھے سات کہانیاں۔‘‘

میں نے کہا۔ ''وزن کے ساتھ ہی پتھر رکھے گئے ہیں۔ دیکھو تو، کہانی والا پلڑا کتنا جھک آیا ہے —— آدھی کہانی تو تم نے پہلے لے لی......''

''پہلے لے کر آدھی کہانی کیا میں کھا گیا؟ پاسنگ نہ ملا تا ترازو کا!'' جریدے والے نے چڑھ کر کہا۔

''بات سچ تھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ تم سچ کہتے ہو، پر دوسری طرف کا پلڑا جو اتنا جھک آیا ہے۔'' منّی بائی، یہ سن کر جریدے والا بگڑ گیا۔ ترشی سے کہا، ''اتنا جھک گیا تو دم نکل گیا تمہارا۔ کیا سونا تول رہے ہو، کہانیاں ہی تو ہیں۔''

''سچ ہی کہا تھا جریدے والے نے۔'' منّی بائی نے میری طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے دل برداشتہ دیکھ کر منّی بائی نے دکھ سے کہا۔ ''واقعی ہمارا دھندہ تمہارے دھندے سے، بہت اچھا ہے۔''

''ہاں منّی بائی، بہت اچھا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کاغذ قلم پھینک کر تمہارا والا دھندہ ہی شروع کر دوں۔'' یہ سن کر منّی بائی بے ساختہ ہنس پڑی اور جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔

''اللہ، ایسا نہ کر بیٹھنا جی، ورنہ مفت میں ہماری روٹی ماری جائے گی......''

بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد جب منّی بائی تھک گئی تو اسے کچھ یاد آیا۔

''اچھا جی، ایک کہانی ہم پر بھی لکھو......''

''نہیں منّی بائی، تم پر تو بہتوں نے کہانیاں لکھی ہیں، میں تو تمہارے طوطے پر ایک اچھی سی کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔''

''لکھو جی، ضرور لکھو...... میرے طوطے پر ہی لکھو......'' منّی بائی نے مسرت سے کہا۔ ''مگر کیا لکھو گے؟''

''یہ لکھوں گا کہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے، اور اب، جب کہ بازار کے سارے پرندے ختم ہو چکے ہیں، رنگین شیشوں سے گھری ہوئی گاڑی والے دونوں زہریلی آنکھوں والے آدمی چاروں اور گھوم گھوم کر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی پرندہ ہاتھ آجائے، کہیں سے کوئی گوریا، قمری، بلبل، کہیں سے کوئی کرک، نیل کنٹھ، کوئی مینا، کوئی طوطا

دکھائی پڑے۔ اتنے میں ان کی چاروں زہریلی نگاہیں تمہارے طوطے پر پڑتی ہیں اور وہ دونوں کھل اُٹھتے ہیں۔ پھر لمبے بانس والا آدمی بڑھتا ہے اور چپکے سے طوطے کے بائیں بازو پر لسدار رطوبت والے گچھے کو چھوڑ دیتا ہے۔ طوطا پھڑ پھڑاتا ہے، تھرتھراتا ہے، اڑنے کی کوشش کرتا ہے اور برسوں کے اڈے کو غیر محفوظ جان کر بالکونی کی ریلنگ کا سہارا لینا چاہتا ہے، مگر نہیں لے پاتا اور تڑپتا ہوا نیچے آرہتا ہے، یہاں وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے، وہ لپک کر طوطے کو اٹھاتا ہے کہ طوطا........چیں........ں ں........کی آواز سے زور سے چیختا ہے، پھڑ پھڑاتا ہے۔ پھر پتہ نہیں اس کی ساتھ چھوڑتی ہوئی قوتِ پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے۔ وہ ذرا اوپر اڑتا ہے لیکن پھر گر پڑتا ہے۔''

''وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی والی رسی بندھی ہوتی ہے، اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے مسکرا دیتا ہے، جس کے جواب میں اس کا رفیق پہلے اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے، پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے اور آہستہ سے آگے بڑھ کر طوطے کو اٹھانے کے لیے جھکتا ہے۔''

''لیکن دفعتاً طوطا اس کی گرفت میں آنے کے بجائے تڑپ کر اچھلتا ہے اور اس کی کنپٹیوں پر جھپٹتا ہے اور گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔''

اس آدمی کے منہ سے چیخ نکلتی ہے جسے سن کر اس کا دوسرا ساتھی لپکتا ہے اور طوطے کی گردن پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا ہے کہ طوطا گھور کر دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور ان میں لہو اتر آتا ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت کو سمیٹتا ہے اور دبل کر دوسرے آدمی پر حملہ کرتا ہے اور اس کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ آدمی بھی اٹھتا ہے، اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے طوطے کو خود سے الگ کرتا ہے اور اسے زور سے زمین پر پھینک دیتا ہے۔''

''اب دونوں، طوطے کے اطراف کھڑے اسے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور طوطا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کبھی پہلے آدمی کی طرف جاتا ہے، پھر اسی اطمینانِ خاطر سے ٹہلتا ہوا دوسرے آدمی کی طرف لوٹ جاتا ہے، اور دونوں کو اپنی خون آشام نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے........''

........اور اتنے میں منّی بائی جلدی سے کہہ اٹھتی ہے۔ ''میں لپک کر جاتی ہوں اور اپنی

چادر طوطے پر ڈال دیتی ہوں، اس کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں اور اس سے بہت سے............"

"........جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی.......؟"

منی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے اور تھوک دیتی ہے۔" ایسے ہی کہانی لکھی جاتی ہے.......جی؟"

جواب میں میں منی بائی کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ اڈے پر ادھر سے ادھر ہوتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہوں اور پھر ایک بار پلٹ کر طوطے کو دیکھتا ہوں.......

"پھر گاڑی والے منی بائی کے نبی جی سے۔" روزی بھیجو" کی منت کرنے والے طوطے کو بھی لے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ شہر سونا ہو جاتا ہے۔ کہیں کوئی پرندہ، کوئی گوریا، کوئی بلبل، مینا، طوطا، کوئی مرغ، کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔"

"شام ڈھلے، درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی۔ لاجوردی آسمان پر سفید بگلے، توازن سے اڑنے والے بگلے بھی دکھائی نہیں دیتے، بھری دوپہری خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی کہاں، مینا کی ٹُوٹیں ٹُوئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھو گئی ہے۔"

لیکن بازار اور رونقِ بازار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خرید و فروخت جاری ہے۔ شور شرابہ، یکے والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں، لمبی اور خوبصورت کاریں زوں زوں کر کے گزر جاتی ہیں، آمد و رفت جاری ہے۔ کاروبار بدستور ہے، خریدنے والے اسی طرح بازار کی دوکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے۔ ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔"

"پھر دن ڈھلتا، رات آتی ہے اور اپنے تمام تر چھوٹے بڑے، کھرے کھوٹے، بچے جھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے۔ پھر رات بھی چلی جاتی ہے، صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔"

☆

اب پرندہ پکڑنے والی گاڑی کم آتی ہے۔ دو چار دنوں میں، آٹھ دس دنوں میں یا پندرہ بیس دنوں میں ایک بار آتی ہے۔ رنگین شیشوں میں سے ایک آدھ پرندہ حیرت سے بازار والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ گاڑی والے ادھر اُدھر تیز نگاہوں کا جال پھینکتے، پھر سمیٹتے اور چاروں اور متجس نظروں سے دیکھتے، ڈھونڈتے ڈھانڈتے آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کچھ ملتا ہے کبھی کچھ نہیں ملتا۔ کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ایک ایسا ہی دن تھا، دھوپ بہت سخت تھی، ہوا گرم تھی، فضا میں دھول اڑ رہی تھی، جھکڑ چل رہے تھے، جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح گرم گرم ہوا پھینک رہی تھی کہ گاڑی آگئی۔

گاڑی آگئی۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آگئی.......

گاڑی عین چوک پر کھڑی ہوگئی۔ رنگین شیشوں کے اندر ایک ہی پرندہ تھا، جو ادھر ادھر سہمے سہمے قدم پُھدک رہا تھا۔ سفید سا، اس کی دُم مور کی طرح کھلی تھی اور آنکھوں میں افسردگی جھلک رہی تھی۔ ابھی گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ دوڑتا ہوا وہ دس سالہ بچہ آپہنچا۔ اس نے پہلے گاڑی والوں کو دیکھا، پھر شیشے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ذرا دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً اس نے لپک کر شیشے کے چھوٹے سے دروازے کو کھول دیا۔

اتنی ہی پھرتی سے بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ پھر دروازے کو بند کر دیا۔ اور جیب سے بہت سارے سکے نکال کر سامنے اچھال دیے۔ لڑکے نے سکوں کی طرف دھیان بھی نہیں دیا۔ انس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ایک طرف دھکا دے دیا اور پھر سکے اچھال دیے۔ لڑکے نے سکوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ گاڑی تیزی سے چلنے لگی اور اس کے پیچھے پیچھے بانس والا آدمی تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ پھر گاڑی اور تیز ہوگئی، آدمی کے قدم بھی تیز ہوگئے۔ اب وہ دوڑنے لگے۔

لڑکا کچھ دیر خاموش، حیرت اور افسردگی سے تکتا رہا۔ پھر جانے کہاں سے اس کے قدموں میں بجلی کی سی جھپٹ آگئی اور اس نے دہل کر بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، پھر دوڑتے ہوئے اسے جالیا۔ وہ شیشوں پر زور سے گھونسہ مارنے والا ہی تھا کہ بانس والے آدمی نے اس کے وار کو اپنے ہاتھ پر روک لیا اور بچے کو زور سے....... بہت زور سے، دھکا دیا۔

لڑکا گیند کی طرح سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کے سر اور گھٹنوں پر سخت چوٹ آئی تھی۔

اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور دیر تک وہ سڑک کو تاکتا رہا۔ پھر جب اس کی بینائی پر چھایا ہوا اندھیارا ہٹا اور اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی دور ڈھلان پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے صرف دھول ہی دھول تھی۔

لڑکے نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کے گھٹنوں کی تکلیف نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ اور وہ تلملا کر سڑک پر گر گیا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ گاڑی میں لگی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی سحر زدہ آواز کانوں سے اوجھل ہوگئی اور بہت دیر ہوگئی...... بہت...... بہت دیر......

جب بہت دیر ہوگئی تب وہ لڑکا سڑک پر سے اٹھا۔ پہلے اس نے اپنے لہولہان گھٹنوں کو دیکھا، پھر کپڑوں کی دھول جھاڑی، اس کے بعد اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چل کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

''بھائی جان لقا کبوتر بھی گیا......'' اس نے گویا اپنے آپ کو اطلاع دی۔

''ہاں میاں، لقا بھی چلا گیا۔'' میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

ذرا دیر تک وہ سڑک کی اور دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں ڈھلان کی طرف دوڑ گئیں، جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے نیکر کی اس ابھری ہوئی جیب پر ہاتھ پھیرا جس میں ماچس کی ڈبیہ تھی۔

''بھائی جان...... وہ اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نا؟''

''..............''

''اگر تتلیاں چلی گئیں تو کیا بچے کا شہر میں؟؟؟''

میں جواب میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تا حال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ لڑکا چونکا اور اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''بھائی جان، بھائی جان، وہ دیکھیے......''

عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہوڑائے بیٹھا تھا...... میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں دیر تک پتھر کے اس پرندے پر لگی رہیں۔

OO

فوٹو گرافر

قرۃ العین حیدر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آ جاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹو گرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آ پہنچتا ہے تو فوٹو گرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹو گرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹو گرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹو گرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے نہ جانے اور کہیں جا کر اپنی دوکان کیوں نہیں سجاتا، لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید ہول ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جعادری عہدے دار، ان کی

میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا، دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے تھے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلاکار جو تنہائی چاہتے ہیں ایسے لوگ جو برسات کی شاموں جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں، کیوں کہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے، فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آوک جاوک جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے، وہ اپنا سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی چھتری اور اوورکوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا۔" لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارہ سا تھا کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آرہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرا لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آگئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا، باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹو گرافر جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا، چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

''سیاح اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پُر اسرار مشرق کے ایک پُر اسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پُر اسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے!'' لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم آگئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا، رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا ——''اب سونا چاہیے۔''

''تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔'' نوجوان نے فکر سے کہا۔

''ہاں شب بخیر ——'' لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی، پچھلا گلیارہ گھپ اندھیرا پڑا تھا۔ کمرا بے حد پُر سکون، خنک اور آرام دہ تھا، زندگی بے حد پُر سکون اور آرام دہ تھی۔ لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کر دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ ''مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا —— !'' لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا، اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گل دان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا

ایک گچھا تھا۔

مالی نیچے کھڑا ہے، اس نے یہ گلدستہ تمہارے لیے بھجوایا ہے۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اسے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

''ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے، اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟''

نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی، مگر اس جگہ پر کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان اس لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتہ کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا۔

''فوٹو گراف لیڈی ـــــ؟''

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ ''ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔''

''لیڈی ـــــ'' فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے، لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا ـــــ ادھر آیئے۔''

''بڑا لسان فوٹو گرافر ہے۔'' لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر

ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی وہ اور اس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیے اس نے ذرا مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک.........کلک.........تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی.....تھینک یو لیڈی.....تھینک یو سر......" فوٹو گرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرا گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹو گرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا۔

"چھوٹو گرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔ اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتہ کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہی اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی، کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹو گرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے روانہ ہو گئی۔

وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئر پورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آ کر پھاٹک میں داخل ہوئی ان میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹک کر انھوں نے فوٹو گرافر کو

دیکھا، جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی مُمن کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گل دان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے اور ڈرائنگ ہال کے دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نو وارد خاتون درمیانی بیڈروم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر کھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا، وہ پھر پلنگ پر آ لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا، وہ پھر آ کر لیٹ رہیں، کمرا بہت سرد تھا۔

صبح کو اٹھ کر انھوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونا نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انھوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم صم اس تصویر کو دیکھتی رہی پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا، اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

''کمال ہے پندرہ برس میں کتنی بار سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔'' پھر ان کی آواز میں جھلاہٹ آ گئی--- ''اور یہاں کا انتظام کتنا

خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کا کروچ ہی کا کروچ۔''

فوٹو گرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر البم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں ـــــ ان کی آواز بھی بدل چکی تھی، چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑ چڑا پن اور بے زاری اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

''میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا، میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے۔ یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔''

''اور......اور......آپ کے ساتھی؟'' فوٹو گرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

''آپ نے کہا تھا نا کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔''

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

''اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی ــــــ اچھا خدا حافظ۔'' خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئی۔

والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔ صرف کا کروچ باقی رہیں گے۔

OO

ہزار پایہ

خالدہ حسین

میں نے دروازہ کھولا۔ اندر کے ٹھنڈے اندھیرے کے بعد، باہر کی چکا چوند اور تپش پر میں حیران رہ گیا۔ دروازہ، جس کا رنگ سلیٹی اور جالی مٹیالی تھی، اسپرنگوں کی ہلکی سی آواز سے بند ہو گیا۔ اس بند دروازے کے اندر ٹنکچر آیوڈین اور اسپرٹ کی بُو تھی اور چمڑے منڈھے لمبے بنچوں اور پالش اتری کرسیوں پر لوگ بیٹھے اخبار اور رسالوں کے ورق بے دلی سے الٹتے تھے ـــــ مگر 'نوائے وقت'، 'پاکستان ٹائمز' اور کمرے سے باہر چبوترے پر میں کھڑا تھا۔ میں ابھی چند لمحے پہلے اندر تھا اور اب باہر ـــــ اس چبوترے سے آگے، جہاں میں اس وقت کھڑا تھا، ایک چھوٹا سا لان تھا ـــــ اور اس کے گرداگرد کھٹے کی گھنی باڑ۔ یہاں سے سامنے کی طرف ایک آدھ کیاری نظر آ رہی تھی۔ جس میں بے حد سرخ، لہو ایسے گلاب کھلے تھے اور چھوٹے چھوٹے کٹورے کی مانند کچھ زرد پھول، جن کا نام میں نہیں جانتا۔ اور اس لان کے ساتھ ساتھ کچا راستہ تھا جو لکڑی کے سفید پھاٹک پر ختم ہو جاتا تھا۔ میں چبوترے کی پانچ سیڑھیاں اتر کر کھٹے کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گیٹ تک آیا۔ اسے کھولا۔ اس کی چولیں بھی ہولے سے چرچرائیں۔ پھر اس گیٹ کے باہر ایک گنجان سڑک پھیلی تھی۔

باہر نکلتے ہی میں نے پل بھر کو آنکھیں بند کیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ سرخ اندھیرا ہولے سے سبز اندھیرا بنا۔ پھر زرد زرد روشنی کے دھبے، کبھی سیاہی مائل نیلے، کبھی سفید ہونے لگے۔ کچھ چیزوں کے خطوط جلتے بجھتے رہے۔ ان جلتے بجھتے

اندھیروں کے ساتھ پھر میرے گلے میں وہ پھندا آن پڑا اور ہولے ہولے میرے جبڑے سُست پڑنے لگے۔ منھ خود ہی کھل گیا۔ میں نے دانتوں کو باہم بھینچنے کی کوشش کی اور میری مٹھیاں اس کوشش میں دکھنے لگیں۔ مگر اوپر تلے کے دانت ایک دوسرے سے جدا ہی رہے۔ آخر میں نے جیب سے وہ شیشی نکالی اور ایک گولی منھ میں رکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے اندر ایک ہزار پایہ پل رہا ہے۔ لمبے لمبے پنجوں والا کیڑا جو رفتہ رفتہ اپنی بے شمار شاخیں پھیلا رہا ہے، میری رگوں میں گاڑ رہا ہے۔ مگر معلوم ہونے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ ابھی اس کمرے کے اندر ڈاکٹر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ مگر میں سوچتا ہوں میرے اندر کیڑا کیوں پل سکتا تھا؟ یہ مجھے قطعی ناممکن لگتا ہے۔

گولی میرے منھ میں گھل گئی اور میرے جبڑے دھیرے دھیرے باہم ملنے لگے۔ میں نے اپنے سامنے پھیلی گنجان سڑک کو پھر دیکھا۔ انسانوں، رکشاؤں، ٹیکسیوں، سائیکلوں اور اسکوٹروں کا ایک دریا بہتا تھا۔ سامنے 'حمید جنرل مرچنٹس' کی دوکان میں ایک آدمی موٹی سی سیاہ فریم والی عینک لگائے اخبار دیکھ رہا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنے بال سہلائے جاتا تھا۔ اس کے برابر چوڑی چپٹی ناک اور بے حد سیاہ بالوں اور جھکے کندھوں والا ایک لڑکا، ایک برقعہ پوش عورت کے سامنے، کاؤنٹر پر کریموں کی رنگین ڈھکنوں اور لیبلوں والی بوتلیں رکھے جا رہا تھا اور دوکان کے شیشوں میں بے شمار چمکتے رنگ برنگ، ڈبے سجے تھے۔

'حمید جنرل مرچنٹس' —— مجھے حیرت ہوئی کہ بیسیوں مرتبہ یہاں سے گزرنے کے باوجود میں اس دوکان کو آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ اس دوکان کے بعد 'سلمان شوز، امین ڈرگ اسٹور، اور کنگز ہیئر کٹنگ سیلون' تھا۔ ایک نوجوان حجامت والا ایپرن پہنے، سر میں چمپی کروا رہا تھا اور چمپی کرنے والے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کنپٹیوں کی نیلی اُبھری رگیں پھول گئی تھیں۔ ریڈیو پر زاہدہ پروین کافی گا رہی تھی۔ زاہدہ پروین کی آواز اور بہت سے گانے والوں کی آواز، میں بڑے بڑے ہنگاموں میں، بہت دور کھڑا ابھی پہچان لیتا ہوں اور مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ مثلاً میرے دوست ہی آوازوں کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے۔

'سلمان شوز' سے ایک دبلا پتلا آدمی چھوٹے سے بچے کی انگلی تھامے باہر نکلا۔ بچے کے ہاتھ میں ڈوری سے بندھا جوتے کا ڈبہ تھا اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس پر مجھے اچانک خیال آیا کہ میں گھر سے مخالف سمت پر نکل آیا ہوں۔ اس لیے میں گھوم کر رکشا اسٹینڈ پر

پہنچا۔ تین رکشا ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دو خالی۔ ایک میں ڈرائیور اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پیتا تھا۔ آج میں نے پہلی بار دیکھا کہ رکشا عجیب جاندار شکل رکھتا ہے۔ اور مجھے لگا گویا میں رکشا کو نہیں کسی اور جاندار چیز کو دیکھتا ہوں اور یہ چیز چلتے چلتے منہ موڑ کر مجھے دیکھے گی اور کراہے گی۔ جس طرح کبھی میرے اندر پلنے والا ہزار پایہ منہ موڑ کر مجھے دیکھے گا اور کراہے گا۔

ڈرائیور نے ایک بار لمبا کش لے کر میری طرف دیکھا۔ ''کہاں جاؤگے، میاں جی؟'' اس نے بے دلی سے پوچھا۔

''سمناباد۔''

''آجایئے''۔ رو کے زمانہ چاہے رو کے خدائی۔'' اس نے میٹر چلا کر رکشا اسٹارٹ کیا۔

اس رکشا کی سیٹوں پر نیا نیا سرخ اور سبز پھول دار پلاسٹک چڑھا تھا۔ سامنے ڈرائیور کی پشت پر ایک چھوٹے سے جنگلے میں آئینہ جڑا تھا اور دائیں بائیں دروازوں کے ساتھ رنگ برنگے ریشمی پھندنوں کی ڈوریاں جھولتی تھیں۔ ہوا بہت گرم تھی اور اس میں پٹرول اور مٹی کی مہک گھلی تھی۔ اس ملی جلی مہک پر مجھے ایک دم اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں سمناباد جا رہا ہوں۔ سمناباد کیا ہے؟ سمن آباد —— میں نے دل میں تلفظ کو صحیح کیا۔ اور تب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ میں چیزوں کے نام بھولتا جا رہا ہوں اور چیزوں کے نام کھو جائیں تو چیزیں مر جاتی ہیں۔ اور میں یہ نام گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے راستے کے ہر بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کی۔ 'گہوارۂ ادب' شیخ عطاء اللہ ایڈووکیٹ، تتلی مارکہ نکی، شبنم گرم مصالحہ، تعویذ محبت، سنگدل محبوب کھنچا چلا آئے، مگر بہت سے بورڈ اور دیواروں کے اشتہار تیزی میں گزرتے گئے، جنھیں میں پڑھ نہ سکا۔ اس لیے میں نے اپنے قریب کی چیزوں کے نام یاد کرنا شروع کیے۔ رکشا میں بہت سی چیزیں تھیں اور میرے پاس —— میرے اندر۔ میرے ساتھ بہت سی چیزیں تھیں۔ قمیص، ٹائی، ٹائی پن، قلم، بٹوہ، نوٹ، پیسے۔ مگر معلوم نہیں کیوں چیزیں اپنے ناموں سے الگ ہو چکی تھیں اور میں ان ناموں کو محفوظ کرنے کے درپے تھا۔ تب سے میں ہر چیز کا نام دل میں لیتا ہوں۔ دراصل میں اب لفظوں میں چیزیں دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے اکثر میرے ذہن میں اسموں کی ایک لمبی فہرست مرتب ہوتی رہتی ہے، جیسے یہ فہرست مجھے جا کر کہیں سنانی ہو۔

ناموں کی یہ لگن روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کبھی مجھے اپنے اردگرد کے لوگوں سے

حسد ہونے لگتا ہے۔ پھر یہ حسد نفرت بن جاتا ہے اور نفرت ایک سیاہ جنون کی طرح مجھے گھیر لیتی ہے۔ میرے ارد گرد پھیلے ان لوگوں کے پاس بہت سے ایسے نام ہیں جو میرے پاس نہیں، جو کبھی میری یادداشت کا حصہ نہیں بنیں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بہت سے نام چھپا چھپا کر اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اس پر مجھے ان انسانوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ یہ ناموں کی خواہش عجب ہے کہ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ گویا میں کچھ لکھوں گا۔ دراصل اب سے پندرہ بیس برس پہلے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کاغذوں کا ایک دستہ خریدا اور اپنی میز پر لکھنے کا سامان سجایا۔ مگر جب میں نے قلم اٹھایا تو مجھے لگا کہ شاید میں لکھنا نہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ ابھی لکھنے کا وقت نہیں آیا، کبھی آئے گا۔ اس لیے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر چند سطریں پڑھ کر مجھے لگتا کہ اب میں لکھوں گا۔ میں قلم اٹھاتا مگر لکھ نہ پاتا۔ دراصل مجھے کوئی ایسی چیز لکھنی تھی، جس کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اس لیے میں قلم پھر رکھ دیتا اور پڑھنے لگتا۔ پھر کچھ عرصے بعد ہی میں نے جانا کہ میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں نے پڑھنا بند کر دیا۔ پندرہ برس کے بعد اب ——— عجیب بات ہے کہ اب یکدم مجھے یوں لگا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں اور لکھ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے کاغذوں کا دستہ خریدا اور لکھنے کا سامان اپنی میز پر سجایا۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور بہت گھنٹوں تک لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ میری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی، قلم تپنے لگا اور انگلیوں میں جلن ہونے لگی۔ مگر لکھ چکنے پر میں نے دیکھا کہ کاغذ پر صرف چیزوں کے نام ہیں۔ تو دراصل میں یہ لکھنا چاہتا تھا، محض چیزوں کے نام۔ وہ تمام چیزیں جنھیں میں جانتا ہوں، جنھیں میں نے دیکھا ہے، جنھیں میں دیکھتا ہوں۔ اور اگر میں ان تمام چیزوں کے نام لکھ سکوں تو یقیناً سینکڑوں صفحے بھر جائیں گے مگر مجھے اپنے اس کام کے لیے فراغت کہاں ملتی ہے۔ دن بھر میں کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود رہتا ہے۔ میری دکھ بھال کو، مجھے دوا کھلانے کے لیے۔ حالانکہ میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ میں دوا خود کھاؤں گا۔ میرے پاس گھڑی ہے جس میں سیکنڈوں کی سوئی بھی لگی ہے۔ پھر بھی یہ لوگ ہر دم میرے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں اور میں ابھی اپنی اس تصنیف کا راز کسی پر کھولنا نہیں چاہتا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ میں نے اپنے ایک لکھنے والے دوست کو بس ذرا سا اشارہ ہی دیا تھا کہ مسلسل عبارت کوئی چیز نہیں۔ لکھنے والے کو صرف اسم جمع کرنا چاہئیں۔ ہر انسان کو اپنے الگ اسم ڈھونڈ کر یکجا کر دینے چاہئیں اور بس ——— اس پر میرا وہ دوست ہنس دیا۔

"پھر تو ڈکشنریاں دنیا کا عظیم ترین ادب ہیں۔"

اور اس کی نافہمی پر مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ ڈکشنری میں تو محض لفظ ہوتے ہیں، نام نہیں۔ نام دراصل چیزیں ہیں جو انسان کے ساتھ ہیں، اس کے اندر ہیں۔ اور خوف یہی ہے کہ مبادا انسان اپنے حصے کی ان چیزوں کے نام فراموش کرے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنا علم اپنی چیزیں محفوظ کر لینی چاہئیں۔ مگر یہ سب کچھ میرا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ اور اب میں راتوں کو چوری چھپے اپنی تصنیف پر کام کرتا ہوں۔ مگر جوں جوں یہ نام کاغذ پر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں، میں انھیں بھولتا جا رہا ہوں؟ جیسے کوئی چیز میرے اندر سے نکل کر باہر آتی ہے اور باہر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ تو کیا میں چیزوں کو ختم کر رہا ہوں؟ اپنی جلد، اپنے لہو، اپنی ہڈیوں سے نوچ نوچ کر پھینک رہا ہوں۔ تو پھر چیزوں کو محفوظ کرنے، علم کو پانے، زندہ رکھنے کا اور کیا راستہ ہوگا؟ کہ ہم چیزوں کو پا کر انھیں مار ڈالتے ہیں۔ اسی لیے راتوں کو اکثر سوتے سوتے میں شعوری طور پر کچھ شکلیں اپنے سامنے لاتا ہوں اور پھر ان پر ان کے نام چسپاں کرتا ہوں۔ مگر بنا ناموں کے چیزوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مجھے آدھی آدھی رات کو اپنی تصنیف کے ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں مجھے اپنے گرد بسنے والے انسانوں سے سخت پرخاش ہوتی ہے۔ یہ لوگ نام اپنے سینے میں دبائے ہیں اور ناموں کی اس امانت کے بوجھ کا علم نہیں رکھتے۔ اور اس لیے ان کے سینے سانسوں کے درمیان کشادگی اور فراغت کے ساتھ پھیلتے سکڑتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے اپنی تصنیف سے میرا جی اکتا گیا ہے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب مجھے اپنے اندر لمبے لمبے پنجوں اور سرسراتی شاخون کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ اور میری شہ رگ میں پھندا سا لگ جاتا ہے۔ میرے جبڑے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور گندا لعاب منھ میں بھر آتا ہے۔ جو نہ ہی اندر جاتا ہے نہ ہی باہر —— اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن کچھ ایک جانب کو ڈھیلا پڑنے لگتا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی تصنیف بے کار محسوس ہونے لگتی ہے۔ نہ صرف یہ تصنیف، بلکہ ہر چیز کہ پنجے پھیلاتے اس ہزار پائے سے بڑھ کر کوئی نام کوئی چیز زندہ نہیں۔ یہ تمام نام، تمام لفظوں کا بڑھتا، پھیلتا، کاٹتا، نگلتا سچ ہے۔ یہ خود مفہوم ہے۔

مگر میری بیوی فوراً شیشی کھولتی ہے اور گولی نکالتی ہے۔

"لو جلدی کرو —— دیکھو آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا۔"

میں چاہتا ہوں کہ گولی نہ کھاؤں۔ مگر بولتے بولتے میری آواز بھی بدل جاتی ہے اور کبھی کبھی تو میری آواز مر بھی جاتی ہے۔ ایسے میں مجھے وہ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی کہانی یاد آجاتی ہے اور میں اپنے آپ کو اس بدلتے لمحے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر میں اکثر آئینے سے دور رہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے کمرے میں کوئی آئینہ ہے ہی نہیں۔ اب ایک عرصے سے حجام میری شیو بناتا ہے اور جب غسل کے بعد میں آئینے کے سامنے بالوں میں کنگھی کرتا ہوں اس وقت یہ بدلتا لمحہ موجود نہیں ہوتا۔ آخر ایک رات میں نے آئینہ اپنے پاس رکھا اور پھر اپنی تصنیف میں مصروف ہو گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے تمام نام ختم ہو گئے ہیں۔ اب میں روز کے تین چار نام بھی نہیں لکھ سکتا اور قلم لے کر دیر تک بیٹھا رہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک طرح سے ناموں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ میں انھیں اپنے سے باہر لے آیا ہوں اور باہر آ کر یہ لفظ بن گئے ہیں۔ اسی لیے میں اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتا ہوں، سوائے ان چند لمحوں کے جب میرے اندر جان بھری شاخیں پھیلتی، رگوں کو چوستی، کلبلاتی ہیں۔ تو اس رات میں قلم لے کر بیٹھا رہا۔ گھڑی کی سوئی ڈیڑھ پر پہنچنے والی تھی اور اس وقت الارم کو بجنا تھا۔ میری بیوی رات کو دو دو گھنٹے کا الارم لگا کر سوتی ہے اور مجھے دوا کھلاتی ہے۔ مگر آج میں نے ہاتھ بڑھا کر الارم کا بٹن بند کر دیا، پھر رفتہ رفتہ میرے جبڑے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے پپوٹے نیچے گرنے لگے۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے دانت ملانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں میں پسینے سے تر ہو گیا۔ پھر میرے گلے اور سینے میں کسی چیز نے کروٹ لی۔ یہ وہی کیڑا ہے جو میرے اندر پل رہا ہے۔ اس کیڑے نے اپنے لمبے لمبے پنجے میری شہ رگ میں گاڑ دیے۔ مفہوم محض کا سیال اندھیرا سامنے امڈا۔ عین وقت پر میرے ہاتھ نے بڑھ کر آئینہ اٹھایا اور اس آئینہ کو دیکھ کر مجھے ناموں کے بے فائدہ ہونے کا یقین آیا۔ میں خود اپنے ساتھ برسوں سے زندہ تھا اور اب تک محض نام سے اپنے آپ کو پہچانتا تھا۔ مگر یہ پہچان اوپری تھی۔ اس اوپری پہچان کے اندر ایک اور پہچان تھی۔ سخت چھلکے کے اندر بیج کا گودا۔ اور اس گودے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اس لیے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی اس کی ایک پہچان ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا اور بھک سے کچھ میری کنپٹیوں میں جل اٹھا۔

"ارے —— دو بج گئے!" میری بیوی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور پانی کا گلاس میری میز پر لے آئی۔

''لو جلدی کرو، اتنی رات تک جاگ رہے ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے مرتی آواز میں کہا —— ''دیکھو میرا اجزا ئیز ھا ہو رہا ہے۔'' میں نے اپنی بیوی سے کہا اور میری بیوی نے تیزی سے منھ پھیر لیا۔ پھر دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی، مگر مجھے معلوم تھا وہ رو رہی ہے۔

''نہیں۔ دوا کو دیر ہوگئی ہے، اور کوئی بات نہیں ہے۔''

مگر اس روز کے بعد اپنی تصنیف سے میرا دل بالکل اچاٹ ہو گیا۔ ہر چیز کے اوپر ایک خول چڑھا تھا اور خول کے اندر ایک گرم دھڑکتا گوودا، ایک ہزار پایہ تھا۔ ہر چیز شاخیں پھیلائے، رگیں مسلتے ہزار پایے چھپائے تھی۔ نام کے بے جان خول کے اندر۔ اس لیے اب اکثر چیزوں کے نام میری یادداشت نے ٹھکرا دیے۔ اب میں کم سے کم ناموں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو بہت ضروری چیزوں کے نام بھی میری زبان پر نہ آتے اور میرے بچے منھ پھیر کر آنسو پونچھتے اور پھر میرے سامنے مسکراتے اور خوش دلی سے باتیں کرتے۔

لہٰذا اب مجھے ناموں کا نہیں، ٹھوس چیزوں کا خیال رہنے لگا۔ اصل وجود چیزوں کا اپنا تھا۔ ٹھوس چیزیں اور ان چیزوں کو بنا ناموں کے اپنی یادداشت میں لانا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے گھر کی مختلف چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے کوئی پرانی، بہت پرانی چیز یاد آ جاتی۔ مثلاً ایک رات اچانک مجھے اپنا پرانا تمباکو پینے کا پائپ یاد آیا۔ میں سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ضروری تھا کہ میں اپنی اس چیز کو دیکھتا، چھوتا —— اور معلوم نہیں وہ برسوں سے کہاں رکھی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اسے یاد دلایا کہ آج سے چھ سات برس پہلے جو پائپ میں پیتا تھا وہ کہاں ہے۔ میری بیوی نے آنسو بھری آواز میں کہا۔ ''سو جاؤ۔ سو جاؤ'' مگر میں اصرار کرتا رہا اور اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ میری بیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں۔ میں اٹھ کر سارے گھر میں پائپ ڈھونڈتا رہا۔ صندوق، الماریاں، دراز اور آخر وہ مجھے ردّی کاغذوں کے بکس میں پڑا مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا، چھوا اور پھر وہیں ڈال دیا۔ اب مجھے معلوم تھا کہ وہ موجود ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو پھر ——؟ یہ خیال ہی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

مگر رفتہ رفتہ مجھے خاص چیزوں کا خیال آنا بند ہو گیا۔ اب میں کسی چیز کی نہیں یونہی چیزوں کی تلاش میں رہنے لگا۔ چیزیں بے شمار چیزیں۔ ایک روز میز کی دراز میں بہت سے

کاغذوں، پنسلوں اور چھوٹے چھوٹے پرزوں تلے زرد زرد کاغذ میرے ہاتھ آئے۔ زرد کاغذ جن کے اندر سرمئی چکنے ایکس رے تھے۔ مجھے یاد آیا، کچھ مہینے پہلے میں نے یہ ایکس رے کروائے تھے۔ میں نے ان چکنے سرمئی کاغذوں کو روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھا۔ گول گول پسلیوں کا خول۔ جس کے بیچوں بیچ کنکھجورے کی سی شاخ چلی جاتی تھی۔ اور پسلیوں کے اندر اندھیرا ابھرا تھا اور خالی پن —— پھر خطرے کا نشان یاد دلاتی کھوپڑی۔ جس کے ساتھ وہی کنکھجورے کی سی شاخ چلی جاتی تھی اور چوکور جبڑے ماتھے میں کھدے گڑھے —— اور ان گڑھوں کے اندر اندھیرا ابھرا تھا اور خالی پن —— ان دونوں کاغذوں پر نیچے میں کونے میں ایک نام لکھا تھا جو میرا تھا۔ تب میں نے جلد میں ڈھکی اپنی پسلیوں اور بالوں میں ڈھکے اپنے سر کو دیکھا، محسوس کیا، پھر اس گول گول پسلیوں کے خول کو —— اور وہ ہزار پایہ میرے اندر اپنے پاؤں پھیلا کر رینگنے لگا۔ میری رگوں کو مسلتا اور مجھے یوں لگا کہ وہ ہزار پایہ میری طرف منہ موڑ کر دیکھے گا —— اور کراہے گا۔ اور یہ مفہوم محض کا سیال اندھیرا ہوگا —— اٹل، پھیلنے والا، زندہ رہنے والا۔ ہر چیز کا اولین اور آخریں، واحد مفہوم۔

"—— دیکھو، دراصل میں یہ ہوں۔" میں نے اپنی بیوی سے کہا اور سرمئی کاغذ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

"ہاں —— اب تو یہ ایکس رے کام کے نہیں —— کہیں ڈال دیجئے۔"

اس وقت میں نے جانا یہ کہ یہ صرف میں نہیں —— میری بیوی ہے اور بچے —— دوست آشنا اور سڑکیں، بستیوں، اجاڑوں میں گھومنے والے سب انسان اور تمام کا تمام وجود —— آخر میں اس کی کوئی پہچان نہیں۔ سوائے کونوں میں لکھے اس نام کے۔ اور نام جب آدمی سے باہر آجائے تو ختم ہو جاتا ہے۔ مگر نام کے ختم ہونے پر بھی ہر ایک کا الگ خالی پن ہے۔ یا بہت سے خالی پن ہیں اور اپنے اندر ہم اپنے خالی پن کو پہچانتے ہیں۔ گو بظاہر ہماری نظر ہمیں اطمینان دلائے کہ ہماری کوئی پہچان نہیں۔

اس لیے اس کے بعد میری تمام تر توجہ اپنے اندر پلنے والے اس ہزار پایہ پر مرکوز ہوئی۔ میں اسے جاننا، دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ کسی ایکس رے میں نہیں آسکتا کہ وہ ایک جان ہے۔ پھیلتی۔ جبڑوں بھری۔ سرسراتی جان۔ ایک روز میں کاغذوں کا ایک پلندہ سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ جس پر بے شمار لفظ لکھے تھے۔ مگر میں ان میں سے ایک لفظ کو بھی نہیں

پہچانتا تھا کہ اچانک اس کلبلاتی جان نے میرے اندر یوں پھیلنا شروع کر دیا کہ میں نے جانا گویا پھٹ جاؤں گا —— کچھ میرے اندر پھیل رہا تھا۔ ہر ایک کا لہو چوستا۔ میں نے سانس سنبھالنے کی کوشش کی اور میری پیشانی سے ٹپ ٹپ پسینہ بہنے لگا۔ میری بیوی نے جلدی سے میرا منھ کھول کر دوا اندر رکھی۔ مگر میرے منھ میں زبان کی جگہ بے شمار سوئیاں بھری تھیں۔ دوا بھی ایک سوئی تھی کہ سب سوئیوں میں مل گئی —— کوئی چیز میرے اندر بڑھ رہی تھی پھیل رہی تھی —— میری جلد پھٹنے کے قریب تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اب اس کراہ کا وقت آن پہنچا ہے، جو پہلا اور آخری لفظ —— پہلی اور آخری آواز ہے۔

مگر میں نے ڈاکٹر کو کہتے سنا۔ "اس ہزار پایے کو ختم کر دو۔ اسے ہلاک کر دو"۔

نہیں نہیں —— میں نے کہنا چاہا —— یہ زہریلا دھڑ کتا گودا —— یہ جڑوں بھرا میرے اندر —— ہر مقام پر، میرے مسام پر اور دنیا کے ہر لفظ پر حاوی ہے۔ میں نے کہنا چاہا۔ مگر مجھے یاد نہیں، میں نے کیا کہا۔ کچھ کہا بھی یا نہیں کہ آواز مر چکی تھی۔ اور اب مجھے لے جا رہے ہیں۔

میں جانتا ہوں، یہ مجھے لے جا رہے ہیں۔ کہیں باہر —— ویرانے میں۔ اندھیرے اور گھنے سناٹے میں۔ یہاں میرے ہزار پایے —— اس پہلی اور آخری آواز، اس پہلے اور آخری لفظ کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ اندھیرے اور گھنے سناٹے میں........

OO

کونپل

انور سجاد

بھرے بھرے چہرے پر جابرانہ انداز میں کھنچی کھنچی آنکھیں، بھنچے ہوئے ہونٹ، سیاہ نکٹائی کی امریکی گرہ میں پھنسی دوہری گردن، سیاہ کوٹ کی دائیں طرف، سینے کی جیب میں ریشمی رومال جس کا سرخ رنگ وقت کے ساتھ ساتھ فیڈ ہوتا اب پیازی سا معلوم ہوتا ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے دیوار پر کیل سے لٹکے اس پورٹریٹ کے فریم کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں پڑتا ہے۔ تصویر لمحہ بھر کے لیے لرزتی ہے۔ کوٹ کا کالر کے کاج پر ایک سنہری پتنگا بیٹھا ہے جو بلب کی روشنی میں بالکل کسی تمغے کی طرح لگتا ہے۔ چھپکلی اس کی گھات میں وہیں جم جاتی ہے۔

دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ، پتنگا، ایک ہی حقیقت کے انگ دکھائی دیتے ہیں۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس، اس علاقے کا انچارج میز پر جھکا، بے ضابطے کی کارروائی سرکاری سیاہی چوس کر سرکاری سیاہی سے تحریر کرتا ہے۔ سیاہی چوس پر پہلے ہی سے بنے چند اور کیڑے مکوڑوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کی گردن اور بھی تن جاتی ہے۔ اسے وہاں کھڑے جانے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ اسے ہلنے تک کی اجازت نہیں، اس کے بالکل پیچھے ایک قدم ہٹ کے دو سیاہ پوش دائیں بائیں بید لیے کھڑے ہیں۔ جب بھی وہ تھک کر اپنا پورا بوجھ دونوں میں سے کسی ایک ٹانگ پر ڈالنا چاہتا ہے، ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے بید زناٹے سے ہوا کو چیرتے ہیں۔ اس کی

مضبوط پنڈلیوں پر پڑے اچھلتے ہیں، جبڑوں کے تمام پٹھے تن جاتے ہیں، نظریں سامنے کوٹھری کے دروازے کی سلاخوں سے پار، تاریکی کو چیر کے کھڑکی کے راستے سے راہ پاتی ہیں۔

"—— میں ابھی لوٹ آؤں گا۔"

وہ اپنے بچے کو سینے سے ہٹا کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ بیوی گم صم اسے دیکھتی ہے۔ بچہ بھاگ کر صحن میں چلا جاتا ہے۔

—— تم نے کیا جرم کیا پتر؟

اس کی ماں کے سفید بال صحن میں آتی ہوئی سرد ہوا سے کانپتے ہیں۔

"—— ہمارے خاندان میں آج تک کوئی —— تم نے کیا کیا ہے؟"

بیوی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، بچہ سردی سے بے پروا بے حد خوش چوکڑیاں بھرتا صحن سے واپس آتا ہے۔

"—— ابا، ابا، وہ۔"

بچہ باہر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے بتاتا ہے کہ جو بیج اس نے اپنے بیٹے کو بونے کو دیا تھا، اس کی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔

کچے صحن کے عین وسط میں چھوٹے سے دائرے کی صورت چنے ہوئے کنکروں کے درمیان گوڈی شدہ زمین میں ایک ننھی منی کونپل منوں مٹی کو اپنی تیز کٹاری سی نوک سے چیر کے ابھری ہے۔

ہاں بیٹے وہ، اس میں ایسے ایسے موہنے لٹکتے، سرخ سرخ فانوسوں کی صورت میں کھلیں گے۔ وہ بچے کو پھر سینے سے لگا کر بھینچتا ہے۔ الگ کرتا ہے، بیوی کو بھرپور نظروں سے دیکھ کر ماں کو یقین دلاتا ہے۔

"—— ماں! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جانے مجھے کیوں بلانے آئے ہیں۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔"

"—— باہر سردی ہے بیٹے، سوئٹر پہن لو۔"

بچہ چارپائی پر کھڑا ہے۔ بیوی کا ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھتا ہے۔ دروازے کا سہارا لے کر ماں کا دل سسٹولی میں رکتا ہے۔ وہ ان سب کو تابلو میں چھوڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتا باہر سڑک پر آجاتا ہے۔ وہ سیاہ پوش عملاً اسے اٹھا کر جیپ میں پھینک دیتے ہیں۔ جیپ

چل پڑتی ہے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ انچارج بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے چار سیاہ پوشوں نے اپنے گھٹنوں کے درمیان رائفلوں کو جیپ کے فرش پر کھڑا کر کے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا ہے۔ وہ ان کے درمیان پھنسا بیٹھا اس قدر وی۔ آئی۔ پی۔ ٹریٹ منٹ پر حیران ہوتا ہے۔ جیپ تیزی سے شاہراہوں پر گہری ہوتی ہوئی شام کی سیاہی پھیلاتی بھاگنے لگتی ہے، آسمان پر پھیلتے تاریک بادل ونڈ اسکرین کے فریم میں مہیب صورتوں میں اٹھتے ہیں۔ اسے فوراً خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو بتا کر کیوں نہیں آیا کہ تند ہوا اور تیز بارش اس کی کونپل کے لیے قاتل ہیں۔ جب تک یہ کونپل درخت نہیں بن جاتی اور اس پر موہنے مہکتے، سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں نہیں جھومتے، تب تک ——

مجھے اس کو بتا کر آنا چاہیے تھا۔

اس کی نظریں کوٹھری کی کھڑکی سے پلٹتی ہیں۔ پورٹریٹ کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں اسی طرح جما ہوا ہے۔ آنکھیں پتنگے پر گڑی ہیں۔ چھپکلی کی دم کا آخری سرا دیوار پر ایک ملی میٹر سرکتا ہے۔ پورٹریٹ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دیوار کی کیل پر تنی رسی، جس سے یہ پورٹریٹ لٹکتا ہے، ذرا سی تنتی ہے۔ کیل پر محیط رسی کے نچلے زنگ آلود، بوسیدہ حصے کے چند تاگے ٹوٹتے ہیں۔

انچارج اپنی کلائی گھما کر وقت دیکھتا ہے، سردی کو دونوں ہاتھوں میں رگڑتا ہے، دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ ایک کونے سے مبہم سی آواز آتی ہے۔

وہیں، اسی جگہ کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں خودبخود کونے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اس کا لہو اس کے جسم میں رک جاتا ہے۔ آنکھیں وہیں گڑ جاتی ہیں۔ پتلیاں پھیل جاتی ہیں۔ کونے میں بنچ پر بیٹھی اس کی ماں اور بیوی اس کو تکنے جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا قدم ان کی جانب بڑھنے کے لیے اٹھتا ہے۔ شاڑ، شاڑ، بید ہوا کو چیرتے اس کے جسم پر برستے ہیں۔ وہ پھر وہیں جم جاتا ہے۔ اسے ملنے کی اجازت نہیں۔

"—— انہیں یہاں کون لایا ہے؟"

اسے کوئی جواب نہیں دیتا۔ انچارج اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر پورٹریٹ کو دیکھنے لگتا ہے۔ پورٹریٹ مزید دو سوت نیچے سرک چکا ہے۔ پتنگا کوٹ کے کاج پر اسی طرح جما بیٹھا ہے۔ چھپکلی کے دونوں اگلے پیر اب فریم کو پار کر

چکے ہیں۔ اس کا بایاں پچھلا پیر فریم کے کونے کے قریب ہے۔ دائیں ٹانگ دم کی سیدھ میں کھنچی ہے۔

''—— بچے کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں؟''

وہ بیدوں کے پے بہ پے وار سہتا، بنچ پر بیٹھی ہوئی عورتوں سے تشویش بھرے لہجوں میں پوچھتا ہے۔

''—— اس کے پاس ماسی کو چھوڑ ——''

'' —— میں نے کہا تھا تم بولو گی نہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بھی بولا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔''

انچارج کی نظریں پتنگے کے پروں کا سونا چاٹنے کی خواہش میں پلٹ کر بڑی بیدردی سے کاٹتی ہیں۔ ماں بیوی سہم جاتی ہیں۔

''—— یہ بڑی زیادتی —— ان شریف عورتوں کو یہاں کیوں ——''

''—— شریف عورتیں!''

انچارج کے گلے میں قہقہوں کا جھاگ ابلتا ہے۔ وہ چاروں اور ماں بہنوں کی گالیاں تھوکنے لگتا ہے۔ اس کے بدن کے لہو میں طوفان آ جاتا ہے۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ وہ بڑھ کر انچارج کو ——

لیکن دونوں سیاہ پوش اسے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ تیسرا ایک نیم روشن کونے سے بر آمد ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اس کی قمیص کو گریبان سے پکڑ کر پھاڑ دیتا ہے۔ پھٹی ہوئی قمیص سے اس کے صحت مند تندرست سینے پر سردی کی سنسناہٹ پھیلتی ہے۔ اس کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انچارج سر سے اشارہ کرتا ہے۔

تیسرا سیاہ پوش اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔ باقی دونوں اسے دھکیلتے ہیں۔ ماں بیوی اسے دیکھتی ہیں پر چپ ہیں۔ تینوں سیاہ پوش اسے کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک، اس کی قمیص کے رہے سہے چیتھڑے بھی اتار پھینکتا ہے۔ کھڑکی سے آتی ہوئی تیز سرد ہوا اس کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر سر اٹھاتی ہے۔ وہ جسم سے اٹھتی کپکپی کو جسم میں دبا دیتا ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں ہتھیلیاں جما کر سینہ پھلاتا ہے۔ لمبا سانس بھرتا

ہے۔اب آسمان پر بادل پوری طرح جم چکے ہیں۔ مدھم مدھم کومل سرمئی سی روشنی جو تاریک سے تاریک رات میں بھی کہیں سے آجاتی ہے، کڑکتی کوندتی برق کے سامنے ہر لمحہ غائب ہوتی ہے اوران لمحوں کے بیچ کے لمحے میں پھر آسمان کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس درمیانی لمحے کو وہ اپنے سارے وجود میں سمیٹ کر مسکراتا ہے، پلٹتا ہے۔نظروں ہی نظروں میں ماں اور بیوی کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔

"—— آپ مجھے یہاں کیوں لے کرآئے ہیں؟"

وہ بے صبری سے پلٹ کرسوال کرتا ہے۔

"—— آپ مجھے جانے دیں گے یا نہیں؟ میرا بچہ گھر میں تنہا ہے۔"

ایک سیاہ پوش ہاتھ میں پلاس لیے اس کی طرف بڑھتا ہے، یکا یک اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر پینترا بدلتا ہے۔اس کا بازو اپنی بغل میں لے کرسختی سے دبالیتا ہے۔باقی سیاہ پوش اس کی طرف جھپٹتے ہیں۔اسے زمین پر گرا کر قابو میں لے لیتے ہیں۔ پلاس والا اس کی شہادت کی انگلی کا ناخن پلاس کے دانتوں میں دبا کر آہستہ آہستہ کھینچتا ہے، کھینچتا ہے۔حتیٰ کہ ناخن جڑ سے اکھڑنے لگتا ہے۔درد کی تمام حسیات سمٹ کر اس کے ناخنوں میں آجاتی ہیں۔اس کے اندر کا ایک ایک خلیہ تناؤ میں جھنجھنا اٹھتا ہے۔لیکن وہ اپنے چہرے پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں آنے دیتا۔انچارج غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

وہ خود دل ہی دل میں حیران ہوتا ہے۔اگر چہ وہ پہلے کبھی جسمانی اذیت سے دو چار نہیں ہوا تھا۔اب یہ کیسی شناسائی ہے کہ اذیت اجنبی محسوس نہیں ہوتی۔شاید جسم اور دماغ کے ہم آہنگ ہونے پر دونوں حقیقتیں، دونوں اذیتیں ایک ہو جاتی ہیں۔انچارج، سیاہ پوش سے پلاس چھین کر دیوانہ وار اس کا ہر ناخن کھینچتا ہے۔کھینچتا ہے۔اس کے ناخنوں کے کناروں پر خون کی لکیریں ابھر کے محیط ہو جاتی ہیں۔انچارج تھک کر لرز جاتا ہے۔ پلاس تان کر اس کے پیٹ پر مارتا ہے۔گالیاں دیتا ہوا سیاہ پوشوں کے ساتھ کانفرنس کرنے کے لیے پرے ہٹ جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں سن کر ماں اور بیوی کے سر اور بھی جھک جاتے ہیں۔

وہ اپنی اذیت رسانوں کو مصروف دیکھ کر یکدم کروٹ بدلتا ہے۔فرش پر پنجوں اور ہتھیلیوں کے بل چپکے سے چلتا ہوا ماں اور بیوی کے قدموں میں جا پہنچتا ہے —— "بچہ تو محفوظ ہے نا؟ بوڑھی ماسی اس کا خیال ——"

ماں اور بیوی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔ وہ کولہوں کے سہارے بیٹھ کر جلدی سے اپنے ہاتھ بغلوں میں داب لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جلتے پانی کی لکیر دوڑ جاتی ہے۔

''بچہ تو محفوظ ہے ـــــــ''

☆

عین اسی وقت آسمان سے بارش کے پہلے قطرے کا فائر ہوتا ہے۔ بارش مشین گنوں سے نکلتی ہوئی گولیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بچہ اپنے لحاف کو ذرا سا اٹھا کر دوسری چارپائی کی اور دیکھتا ہے۔ بہتر سال کی بوڑھی ماسی لحاف میں دبکی نیند میں غائب غلا ہے۔ بچہ بہت محتاط، چارپائی کی چرچراہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے بس میں کرتا ہے۔ دبے پاؤں چل کر دیوار سے لگا اسٹول اٹھاتا ہے۔ بند دروازے کے سامنے رکھ کر اس پر چڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ کنڈی کھولتا ہے۔ دوسری چارپائی پر قبر سی بنی لحاف کی نیند میں غائب بہتر سال کی ماسی کو دیکھتا ہے۔ کنڈی کھول کر وہ جلدی سے نیچے اتر کر اسٹول کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکتا ہے۔ دیواروں سے اچھلتی ہوئی بوچھار اس پر پڑتی ہے۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا اس کی ناک کی پھننگ سے ٹکراتی ہے۔ بچہ بڑی مشکل سے چھینک کو دباتا ہے۔ اسے صحن میں کونپل نظر نہیں آتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تیز بارش کا پردہ ہے۔ کارپوریشن کے کھمبے پر جلتے بلب کی روشنی نے بارش کی چادر پر پھیل کر اسے اندھا شیشہ بنا دیا ہے۔ بچے کے جسم میں سردی کی سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اس کو چھینک آ ہی جاتی ہے۔ دوسرے بستر پر بنی قبر میں جنبش ہوتی ہے۔ بچہ روہانسا ہو کر فوراً اپنے بستر میں دبک جاتا ہے۔ لحاف کی اوٹ سے ماسی کو دیکھتا ہے۔ ماسی پھر اپنی نیند میں گم ہو چکی ہے۔

بچے کا دل مسلسل دھڑکے جاتا ہے، جانے باہر تیز بارش اور تند ہوا میں اس کے ننھے نویلے بوٹے کا کیا حال ہوگا۔ اگر اس بوٹے کو کچھ ہو گیا تو؟ اس سے رہا نہیں جاتا۔ وہ بے چینی میں اٹھ کر اپنی تمام حرکات دہراتا ہے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اندھے شیشے کے پار دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ دیواروں سے ٹوٹتی پھوار اسے شرابور کر دیتی ہے۔

☆

اب ہوا کا رخ کھڑکی کی طرف ہے۔ جہاں اسے پھر کھڑا کر دیا گیا۔ تیز ہوا اس کے جسم پر بارش کی چاند ماری کرتی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے جسم کے انچ انچ کو کئے ہوئے بلیڈ چھیدتے ہیں۔ پھر جلد ہی اس کے جسم اور دماغ کی حقیقتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے سُن جسم پر بلیڈوں کے وار سہتا ہے۔

ماں اور بیوی میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ ان دونوں کی نظریں پورٹریٹ پر گڑی ہیں۔ ان کے چہروں پر نفرت اور حقارت، غم و غصے کے تاثرات ہیں۔ چھپکلی پوری کی پوری پورٹریٹ کے فریم کے شیشے پر آچکی ہے۔ بال چھدرے ہوتے ہوتے ماتھے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چھپکلی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ اگلا دایاں پاؤں بڑھائے، پچھلی بائیں ٹانگ دم کی سیدھ میں تان کر گھات لگا لیتی ہے۔ کیل کے اوپر بوسیدہ زنگ آلود رسی کے چند اور تاگے ٹوٹ جاتے ہیں، پورٹریٹ چار سوت کششِ ثقل کی طرف کھسکتی ہے۔

اذیت خانے کا داخلی دروازہ کھٹکے سے کھلتا ہے۔ انچارج اور تمام سیاہ پوش اٹینشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کھڑکی سے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص برساتی اوڑھے ہوئے کار سے اتر کر دو سیاہ پوشوں کی معیت میں داخل ہوتا ہے۔ برساتی اتار کے ایک سیاہ پوش کو تھما دیتا ہے۔ کوٹ کی جیب سے پائپ نکال کر منھ میں دباتا ہے۔ اس کے سامنے چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر گیس لائٹر سے پائپ سلگاتا ہے۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے بادل اس کے منے سے نکلتے ہی کھڑکی سے آتی ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔

کونے سے رونے کی دبی دبی آواز آتی ہے۔ اس کی بیوی اپنے رومال کو منھ میں ٹھونسے، تھک ہار کر چھلکتے صبر کے پیمانے کو چھلکنے سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ پائپ والا منھ سے پائپ نکال کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔

”—— گڈ——“

انچارج بڑے فخر سے اپنی کارگزاری سناتا ہے۔ پائپ والے کا چہرہ مطمئن ہے۔
وہ پائپ والے کی طرف لپکتا ہے۔ دو سیاہ پوش فوراً بڑھ کر اسے پکڑ لیتے ہیں۔

”—— میرا جرم —— میرا جرم —— ؟ یہ لوگ——“

انچارج کی تیز زبان اسے کاٹتی ہے۔ ماں بہن کی گالیاں۔ ماں بیوی کے سر زمین پر جھکے اٹھ نہیں پاتے۔ انچارج کے اشارے پر ایک سیاہ پوش کونے میں پڑے کڑوے تیل کے

کنستر میں ڈوبا ہوا کوڑا نکالتا ہے۔ وہ بڑھ کر اسے گھسیٹ کے تاریک کوٹھری کے جنگلے کے ساتھ اس کی کلائیاں اور پیر باندھ دیتے ہیں، کچھ اس انداز میں جیسے یسوع مسیح کو سولی پر باندھا گیا تھا۔

سیاہ پوش کوڑے سے زائد تیل نچوڑ کر پائپ والے کو اجازت طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ پائپ والا منہ میں پائپ رکھ کر کش لیتا ہے۔ سیاہ پوش کوڑا لہراتا ہے۔

پہلا وار ——

اس کے دانت اور آنکھیں بھنچ جاتے ہیں۔ پشت کے ریشے لمحہ بھر کے لیے سن ہو کر تڑپتے ہیں۔ وار کے بعد اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں جنگلے کے باہر کوٹھری کے اندھیرے میں شعلے چھینکتی ہیں۔

دوسرا وار، تیسرا، چوتھا ——

اب اس کی پیٹھ کے پٹھوں کے تمام ریشے تناؤ میں ہیں۔ اس کی آنکھیں مسلسل بھنچی ہوئی ہیں، جن کے سامنے سے مرکز سے سرخ نقطہ ابھرتا ہے۔ افق سے افق تک تنتا ہی چلا جاتا ہے۔ چیخیں ہر وار پر اس کے گلے میں آ کے اٹک جاتی ہیں۔ پائپ والا حیران ہے کہ اتنی اذیت کے باوجود یہ چیختا کیوں نہیں۔ اس کی ماں اور بیوی اس منظر کی تاب نہ لا کر بنچ پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں میچ لیتی ہیں۔ ماں دوسرے ہاتھ سے اپنی گرم چادر کے دامن میں بہو کے سر کو بھی چھپا لیتی ہے۔

کوڑے مارنے والا ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس کے پٹھوں کا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ جس طرف دیکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے مرکز سے ابھرتا سرخ نقطہ تاریکی کو روشن کرتا افق سے افق تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تھکاوٹ سے چور جنگلے سے بندھا لٹک جاتا ہے۔

پورٹریٹ تین سوت اور نیچے لٹک گیا ہے۔ دو ایک تاگوں کے سوا رسی کے زنگ آلود حصے سے تمام تاگے ٹوٹ گئے ہیں۔ پورٹریٹ کے ماتھے پر چھپکلی اور پتنگے کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

ایک سیاہ پوش آگے بڑھ کر اس کی کلائیوں اور ٹخنوں سے رسیاں کھولتا ہے۔ وہ بے جان فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انچارج اپنے فل بوٹ کی نوک اس کی پیٹھ سے لگا کر زور سے دھکیلتا ہے۔

پائپ والا پلٹ کر اسٹول پر پڑی دہکتی کوئلوں کی انگیٹھی پر، جو اس عرصے میں ان میں سے ایک لا کر رکھ گیا ہے، اپنے ہاتھ سینکتا ہے۔ انچارج میز سے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے کرتا ہے۔ پائپ والا پائپ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتا، کاغذات کا سرسری مطالعہ کرتا ہے۔ انچارج کو شاباش دیتا ہے۔ انچارج سیلوٹ کرتا ہے۔ اس کا جی بار بار سیلوٹ کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ صاحب بُرا نہ مان جائے، ایک ہی سیلوٹ پر اکتفا کرتا ہے۔

''—— یہ لوگ مجھے بلاوجہ گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔''

پائپ والا مڑ کر اسے دیکھتا ہے۔ وہ فرش پر گھسٹتا اس کے قریب آتا ہے۔ چند قدم پرے رُک کر ہانپنے لگتا ہے۔ انچارج اور سیاہ پوش اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پائپ والے کے ہاتھ کے اشارے سے رُک جاتے ہیں۔

''—— بہت ڈھیٹ ہے۔''

انچارج کے لہجے میں خفت ہے۔ پائپ والا خاموشی سے فرش کو دیکھتا ہے۔ ''—— آپ —— آپ —— پڑھے لکھے ہیں۔ افسر تو بعد میں بنے۔ مجھے یاد ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ بھی ——''

''—— شٹ اپ، تم میرے بارے میں اتنا جانتے ہو!''

پائپ والے کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ پیٹ کا سارا لعاب پل بھر کے لیے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ پائپ کا کش لے کر وہ اس کیفیت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے وہ دیوانہ وار قہقہے میں فرش پر جھک جاتا ہے۔ پائپ والے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔

''—— خاموش!''

''جی اچھا۔ بہت بہتر و بہت مناسب —— یہ بتایئے، میں چور ہوں، بدمعاش ہوں، غنڈہ، جواری، زانی، شرابی، قاتل، ڈاکو یا اسمگلر، جو مجھے یہاں لایا گیا ہے؟''

پائپ والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ بات اس کی ذات پر خود ہی سمٹ گئی ہے۔

''—— یا میں اپنے وطن کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوں، جو آپ لوگ مجھے اذیتیں دے کر سازش کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

انچارج ایک طرف کھڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ صاحب خواہ

مخواہ اسے بکنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ وہ ابھی چند سیکنڈ میں اس کی زبان بند کر سکتا ہے۔ لیکن پائپ والا اپنے ہر حکم کو جواز دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ جواز نہ بھی دے تو بھی اس شخص کو، جو فرش پر بیٹھا اپنے آپ کو شریف اور معزز شہری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"—— میری ماں، میری بیوی کی بے حرمتی ——"

وہ تقریباً روہانسا ہو جاتا ہے۔

"—— تمہارا صرف ایک جرم ہے۔ تم کسان ہو، مزدور ہو، کلرک ہو، شاعر ہو، خطرناک قسم کے بلڈی پوئٹ۔"

"—— میں، بیک وقت یہ سب کچھ!"

"ایک عرصے سے تم یہ سب کچھ ہو۔ تمہاری فائل کہتی ہے۔ آج دوپہر تم نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔"

"—— میں نے کچھ ثابت نہیں کرنا چاہا تھا۔"

"—— تو پھر تم ہجوم کے درمیان چبوترے پر کھڑے کیا بک رہے تھے؟"

"—— آواز کی آرزو میں، وہ خواہش، وہ خیال، وہ لفظ جنھیں میں نے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا، آج ان کی نجات کا دن تھا۔ اور میں ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔ ہم آزاد ہیں، غلام نہیں۔"

"—— تم واقعی خطرناک شاعر ہو۔"

"—— میں یہاں ایک ہوں۔ اگر خواہشوں، خیالوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے تو باہر سارا ہجوم، سارا شہر، سارا ملک، ساری کائنات خطرناک ہے۔ انھوں نے اپنے مقدر پر لگی ہوئی جبر و استبداد کی مہریں توڑ ڈالی ہیں۔"

پائپ والا بڑے اضطراب سے پائپ کو منھ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جماتا ہے۔

"—— آپ کی بدنصیبی ہے کہ آپ نے مہریں لگانے والی مشین کا پُرزہ بننا پسند کیا۔"

پائپ والا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ وہ میز کا سہارا لے کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے۔ میز کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔

"—— تم بہت بولتے ہو۔"

پائپ والا جلدی سے پلکیں جھکا کر کہتا ہے۔ سر کے اشارے سے انچارج کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ انچارج کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھتا ہے۔

دو سیاہ پوش اسے وہیں میز کے پاس فرش پر پھر سے گرا دیتے ہیں، دو اور ساتھ مل کر اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ انچارج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کو اس کے جبڑوں کے دونوں طرف جما کر پوری قوت سے دباتا ہے۔ وہ مدافعت کرتا ہے۔ لیکن اسے منھ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ پائپ والا ایک چھوٹا سا دہکتا ہوا انگارہ پنڈ کے کلپ میں انگیٹھی سے اٹھا کر اس کے قریب لاتا ہے۔ انگارے کی حدت اور سرخی سے اس کی آنکھوں کو سکون پہنچتا ہے۔

''—— تم واقعی بہت بکواسی ہو۔''

پائپ والا اس کے کھلے منھ کے راستے دہکتا ہوا انگارہ اس کی زبان پر رکھ دیتا ہے۔ کونے میں گرم چادر کے نیچے ماں اور بیوی ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔ وہ سیاہ پوشوں کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے۔ چیختا ہے۔ ماں، بیوی کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ پائپ والا انگارے اٹھا کر پھر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے منھ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پرے پھینک کر بڑے اطمینان سے اٹھتا ہے، سوچتا ہے —— اب یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا۔

عین اسی وقت پورٹریٹ کی رسی کا ایک اور تاگا ٹوٹتا ہے۔ پورٹریٹ چند سوت اور کشش ثقل کی جانب سرکتی ہے۔ اب صرف ایک اور تاگا رہ گیا ہے، جس کے سہارے پورٹریٹ کیل پر ٹنگی ہے۔ جھبکا، اگلا دایاں پاؤں اٹھائے ماتھے کے تمغے، سنہری پتنگے پر اب جھپٹنا ہی چاہتی ہے۔ وہ فرش پر لیٹا ہوا اپنے جسم کے تشنج پر قابو پا کر حواس مجتمع کرتا ہے۔ اجتماع میں پھڑکتی جلی زبان سے ان تمام لفظوں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے، جو آج دوپہر ہجوم کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے تھے۔ درد، اذیت اور غصے میں، جلتی ہوئی زبان سے لکنت میں ابھرتے الفاظ، پائپ والے اور دیگر سیاہ پوشوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔

''—— یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا۔'' اپنی دانست میں ان بے معنی آوازوں کو سنتے ہوئے پائپ والے اور اس کے حواریوں کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔

قہقہے، کونے سے ابھرتی ماں اور بیوی کی سسکیاں، اس کی جلی ہوئی لکنتاتی زبان سے دیوانہ وار نکلتے ہوئے لفظ، اور باہر کڑکتی بجلی سرو دندناتی ہوا پر تیز بارش کا موسیقی تڑ۔

☆

کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے، اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچے کو یکدم ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر جلدی سے مڑتا ہے۔ پل بھر کے لیے دوسرے بستر پر تنفس سے ابھرتی، ڈوبتی رضائی کی قبر کو دیکھتا ہے۔ اپنی چارپائی کے پاس آ کر جلدی جلدی جُوتا پہنتا ہے۔ پُوری قوت سے اپنے بستر کا لحاف اٹھا کر اوڑھتا ہے۔ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ صحن کے عین وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس ننھی منی کونپل کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیتا ہے، جو منوں مٹی کو اپنی تیز کٹاری نوک سے چیر کے ابھری ہے اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے موہنے، مہکتے، سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت جھولیں گے۔

○○

شہرِ افسوس

انتظار حسین

پہلا آدمی اس پر یہ بولا کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے کہ میں مر چکا ہوں۔

تیسرا آدمی یہ سن کر چونکا اور کسی قدر خوف اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ مگر دوسرے آدمی نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حرارت سے خالی سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''تو کیسے مر گیا؟''

پہلے آدمی نے اپنی بے روح آواز میں جواب دیا۔ ''وہ اک سانولی رنگت والی لڑکی تھی، ماتھے پر لال بندی، زلفیں کمر کمر۔ ایک سانولا نوجوان اس کے ساتھ تھا۔ میں نے نوجوان سے پوچھا، یہ تیری کون ہے۔ بولا کہ یہ میری بہن ہے۔ میں نے کہا کہ تو اسے برہنہ کر۔ یہ سنا تو لڑکی پہ دہشت طاری ہوئی۔ بدن مثل بید کے لرزنے لگا۔ نوجوان نے فریاد کی کہ ایسا مت کہہ کہ یہ میری بہن ہے۔ مجھ پر بھی وحشت سوار تھی۔ میں نے نیام میں سے تلوار نکالی اور چلّایا کہ تو اسے برہنہ کر۔ برہنہ تلوار کو دیکھ کر نوجوان خوف سے تھرایا۔ پھر ایک تامل کے ساتھ اس کے لرزتے ہاتھ بہن کی ساڑھی کی طرف بڑھے اور اس سانولی لڑکی نے ایک خوف بھری چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ لیا.......اور ان لرزتے ہاتھوں نے میرے سامنے......''

''تیرے سامنے؟......ہیں......اچھا؟'' تیسرے آدمی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

دوسرے آدمی نے تیسرے آدمی کی حیرت کو یکسر فراموش کیا اور اپنے اسی جذبے سے معرا لہجہ میں پوچھا۔ ''پھر تو مر گیا؟''

''نہیں۔ میں زندہ رہا۔'' اس نے بے رنگ آواز میں کہا۔

''زندہ رہا؟......اچھا؟''......تیسرا آدمی مزید حیران ہوا۔

''ہاں، میں نے یہ کہا اور میں زندہ رہا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہا کہ اس نوجوان نے وہی کیا جو میں نے کیا تھا۔ دہشت میں بھاگتی ہوئی ایک برقعہ پوش کو اس نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی نے زاری کی اور چلایا کہ اے جوان ہماری آبرو پہ رحم کر۔ سانولے نوجوان نے لال پیلی نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا، یہ تیری کون ہے؟ وہ بوڑھا بولا کہ بیٹے، یہ میری بہو ہے۔ اس پر سانولے نوجوان نے دانت کچکچائے اور چلایا کہ بوڑھے تو اسے برہنہ کر۔ یہ سننا تھا کہ وہ لرزتا کانپتا بوڑھا آدمی ایک دم سے سن ہو گیا اور دہشت میں اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تب نوجوان غصے سے دیوانہ ہوا اور بوڑھے کی گردن پکڑ کے چلایا کہ بوڑھے اپنی بہو کو برہنہ کر......اس نے یہ کہا اور میں........''

''اور تو مر گیا؟'' تیسرے آدمی نے جلدی سے بے چین ہو کر کہا۔

''نہیں، میں زندہ رہا۔''

''ہاں میں زندہ رہا۔ میں نے یہ سنا، میں نے یہ دیکھا اور میں زندہ رہا۔ اس خوف سے کہ وہ سانولا نوجوان مجھے پہچان نہ جائے، میں نے وہاں سے راہِ فرار اختیار کی۔ مگر میں آگے پہنچ کر نرغے میں آ گیا۔ میں تلوار پھینکنے لگا تھا کہ ایک پریشان حال شخص مجمع چیر کر میرے روبرو آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ تلوار مت پھینک۔ یہ آئینِ جواں مردی کے خلاف ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ میں اسے تکنے لگا اور وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جا رہا تھا۔ پھر میری نگاہیں جھک گئیں۔ میں نے ہار کر کہا زندہ رہنے کی اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کلام سے اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ اس نے حقارت سے میرے منہ پر تھوکا اور واپس ہو لیا۔ عین اسی وقت ایک تلوار اس کے سر پر چمکی اور وہ تیورا کر زمین پر گرا۔ میں نے اسے اپنے گرم لہو میں لت پت دیکھا اور اپنے چہرے سے اس کا گرم لعاب پونچھا اور......''

''اور تو مر گیا۔'' تیسرے آدمی نے اپنی دانست میں اس کا فقرہ مکمل کیا۔

''نہیں، میں زندہ رہا۔ میں نے اپنی تلوار ناچار رکھ دی اور میں زندہ رہا۔ مگر نہ جانے کس طرف سے وہ سانولا نوجوان پھر نمودار ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ قریب آ کر مجھے گھورنے

لگا، پھر غرا کر پوچھا کہ کیا تو وہی نہیں ہے۔ میں نے بصد تامل اعتراف کیا کہ ہاں میں وہی ہوں۔ یہ سن کر وہ تیزی سے رخصت ہوا اور میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آیا، اس رنگ سے، کہ ایک لڑکی کو کھینچتا ہوا میرے سامنے لایا۔ اس خاک میں اٹی بکھرے بالوں میں چھپی صورت کو میں نے غور سے دیکھا تو سناٹے میں آ گیا۔ ادھر اس نے مجھے دیکھا تو اس درد سے روئی کہ میرا جگر کٹ گیا۔ سانولے نوجوان نے زہر بھری آواز میں مجھ سے پوچھا۔ یہ تیری کون ہے۔ میں نے تامل کیا۔ آخر بتایا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ سانولے نوجوان نے شقی القلب بن کر کہا۔ پھر تو اسے برہنہ کر۔ یہ سن کر خوف سے اس معصوم کی گھگھی بندھ گئی اور ادھر میں ڈھے گیا اور........''

''اور تُو مر گیا؟'' تیسرا آدمی بے تاب ہو کر بولا۔

''نہیں......'' وہ رکا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''میں زندہ رہا۔''

''زندہ رہا؟.....اس کے بعد بھی.....اچھا؟.....'' تیسرا آدمی سکتہ میں آ گیا۔

''ہاں اس کے بعد بھی۔ میں نے کہا۔ میں نے سنا۔ میں نے دیکھا، میں نے کیا، اور میں زندہ رہا۔ میں وہاں سے منہ چھپا کر بھاگا۔ چھپتا چھپاتا خراب وخستہ ہو کر آخر اس کوچے میں پہنچا جہاں میرا گھر تھا۔ اس کوچے میں خوف کا ڈیرا تھا۔ اب دونوں وقت مل رہے تھے اور یہ کوچہ کہ شام پڑے یہاں خوب چہل پہل ہوتی تھی، بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میری گلی کا کتا بیچ گلی میں منہ اٹھائے اور سامنے نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر غرایا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ آگے جب گلی میں داخل ہوتا تھا، وہ ایک مانوس ادا کے ساتھ دم ہلاتا تھا۔ آج مجھے دیکھ کر عجب طور سے چوکنا ہوا۔ بال سارے جسم کے کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ غرایا اور عناد بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ خوف کی ایک لہر میرے بدن میں تیرتی چلی گئی۔ میں اس سے ذرا بچ کر کسی قدر چوکنے پن کے ساتھ گذرا چلا گیا اور اپنے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا، لگتا تھا کہ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں نے تعجب کیا اور کسی قدر زور سے دستک دی۔ پھر وہی خاموشی۔ ایک بلی برابر کے مکان کی پست منڈیر پر گزرتے گزرتے ٹھٹھکی، اجنبی دشمن بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک دم سے سٹک گئی۔ میں نے اس مرتبہ دستک دینے کے ساتھ آہستہ سے آواز بھی دی۔ ''کھولو'' اندر سے سہمی سی نسوانی آواز آئی۔ ''کون؟'' یہ میری منکوحہ کی آواز تھی۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ آج اس نے

میری آواز کو نہیں پہچانا۔ میں نے اعتماد کے ساتھ کہا کہ میں ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر سہمی آواز میں بولی۔ ''تم؟'' میں نے دھیمی ہوئی آواز میں کہا ''ہاں۔ میں۔'' میں اندر آیا۔ گھر بھوت کر رہا تھا۔ اندر باہر اندھیرا تھا۔ برآمدے میں ایک مدھم لو والا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ وہاں مصلّے بچھا تھا اور میرا باپ خاموشی سے تسبیح پھیر رہا تھا۔ میری منکوحہ آہستہ سے بولی۔ ''میں سمجھتی تھی کہ شاید میری بیٹی واپس آ گئی ہو۔'' میں نے گھبرا کر اسے دیکھا کہ کیا اسے خبر ہوگئی ہے۔ وہ مجھے تکے جا رہی تھی اور مجھے تکتے تکتے جیسے اس کی پتلیاں ٹھہر گئی ہوں۔

میں اس سے آنکھ بچا کر برآمدے میں باپ کے پاس پہنچا اور مصلّے کے برابر زمین پہ دو زانو بیٹھا۔ باپ نے دیا ہاتھ میں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔ ''تو؟'' ---ہاں۔ میں۔'' اس نے مجھے سر پہ سے پیر تک حیرت سے دیکھا۔ ''تو زندہ ہے؟'' ہاں۔ میں زندہ ہوں۔'' وہ اس چراغ کی مدھم روشنی میں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر بے اعتباری کے لہجے میں بولا۔ ''نہیں ——ہاں۔ میرے باپ، میں زندہ ہوں۔'' اس نے تامل کیا، آنکھیں بند کیں۔ پھر بولا ''اگر تو زندہ ہے تو پھر میں مرگیا۔'' اس بزرگ نے ایک لمبا سا ٹھنڈا سانس لیا۔ اور مرگیا۔

تب میری منکوحہ میرے قریب آئی۔ زہر بھرے لہجہ میں بولی۔ ''اے اپنے موئے باپ کے بیٹے اور اے میری آبرو لٹی بیٹی کے باپ، تو مر چکا ہے۔'' .....''تب میں نے جانا کہ میں مرگیا ہوں۔''

دوسرا آدمی نے یہ کچھ سننے کے بعد پہلے آدمی کو گھور کر دیکھا اور دیکھے گیا، اس کے احساس سے عاری چہرے کو، اس کی چمک سے محروم آنکھوں کو۔ پھر روکھے لہجے میں اعلان کیا کہ ''بیان صحیح ہے۔ یہ آدمی مر چکا ہے۔''

تیسرا آدمی، کہ پہلے ہی سے حیرت زدہ تھا، مزید حیرت زدہ ہوا۔ پہلے آدمی کو حیرت اور خوف سے دیکھا کیا، پھر اچانک سوال کیا۔ ''تیرے باپ کی لاش کہاں ہے؟''

''باپ کی لاش؟'' پہلے آدمی کے لیے یہ سوال شاید غیر متوقع تھا۔ وہ جھجکا پھر بولا۔ ''وہ تو وہیں رہ گئی۔''

''لایا کیوں نہیں؟''

''دو لاشیں کیسے لے آتا۔ مت پوچھ کہ اپنی لاش کس خرابی سے لے کر آیا ہوں۔''

دوسرا آدمی، جس نے اب تک سب کچھ بے حسی سے کہا اور سنا تھا، یہ بات سن کر

چونکا۔ ''ارے ہاں، میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ میری لاش تو وہیں رہ گئی ہے۔''

''تیری لاش؟'' تیسرے آدمی کی حیرت زدہ نظریں پہلے آدمی کے چہرے سے ہٹ کر دوسرے آدمی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

''ہاں میری لاش۔'' پھر وہ بڑبڑانے لگا، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو، ''لاش لے کر آنا چاہیے تھا۔ جانے وہ اس سے کیا سلوک کریں!''

''تو کیا تو بھی مر چکا ہے؟'' تیسرے آدمی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اچھا؟'' تیسرے آدمی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''مگر تو کیسے مرا؟''

''جو مر گیا ہے وہ کیسے بتائے کہ وہ کیوں مرا اور کیسے مرا۔ بس میں مر گیا۔'' دوسرا آدمی چپ ہو گیا۔ پھر خود ہی اپنی بے لہجہ آواز میں شروع ہو گیا۔ ''اس شہر خرابی میں آخر وہ ساعت آ گئی جو سروں پر منڈلا رہی تھی۔ میں چھپتا پھرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کیا اب ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوگا جو ان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ایک بازار سے گزرتے گزرتے ٹھٹھکا —— کیا دیکھا کہ ایک سانولی لڑکی ہے۔ ساڑھی لیر لیر ایسی کہ سارا پنڈا کھلا ہوا۔ بال پریشان، خاک آلود، ماتھے کی بندی مسلی ہوئی۔ دبلی پتلی مگر پیٹ پھولا ہوا۔ وحشت سے ادھر ادھر دیکھتی، دوڑنے لگتی، پھر ٹھہر جاتی۔ میرے قریب سے گزری تو میں ٹھٹھک گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی۔ ارے، یہ تو وہی لڑکی ہے جسے میں نے ...... اور میں اتنا سوچ پایا تھا کہ اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے چیخ ماری۔ ''نہیں، نہیں۔'' اور خوف زدہ ہو کر بھاگ پڑی۔

میرے اندر خون جمنے لگا۔ یہ لڑکی مجھے پکڑوائے گی۔ میں منہ چھپا کر بھاگا۔ بہت بھاگتا پھرا، کبھی اس کوچے میں کبھی اس گلی میں۔ مگر ہر گلی اندھی گلی تھی اور ہر کوچہ بند کوچہ تھا۔ شہر خرابی سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جا نکلا لاشیں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ جیتا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند، رستے سنسان، گلیاں ویران، کسی کسی مکان کے بالائی دریچے کے پٹ اتنے کھلتے کہ دو سہمی سہمی آنکھیں نظر آتیں اور پھر جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔ عقل حیران تھی کہ یہ کیسا نگر ہے۔ لوگ ہیں، مگر گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔ آخر ایک میدان آیا، جہاں دیکھا کہ ایک خلقت ڈیرا ڈالے پڑی

ہے۔ بچے بھوک سے بلکتے ہیں —— بڑوں کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں۔ شاداب چہرے مرجھا گئے ہیں، گوری عورتیں سنولا گئی ہیں۔ میں وہاں پہنچا کہ اے لوگو کچھ بتاؤ کہ یہ کیسی بستی ہے اور اس پہ کیا آفت ٹوٹی ہے کہ گھر قید خانے بنے ہیں اور گلی کوچوں میں خاک اڑتی ہے؟ جواب ملا کہ اے کم نصیب، تو شہر افسوس میں ہے اور ہم سیہ بخت یہاں دم سادھے موت کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے یہ سن کر ایک ایک کے چہرے پر نظر کی۔ ہر چہرے پہ موت کی پرچھائیں پڑ رہی تھی اور ہر پیشانی پر سیہ بختی لکھی تھی۔ مجھے انھیں دیکھ کر تجسس ہوا۔ پوچھا کہ اے لوگو سچ بتاؤ، تم وہی نہیں ہو جو اس بستی کو دارالامان جان کر دور سے چل کر آئے اور یہاں بسر گئے۔ انھوں نے کہا اے شخص تو نے خوب پہچانا۔ ہم انھیں خانہ بربادوں کے قبیلے سے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ خانہ بربادو، تم نے دارالامان کو کیسا پایا۔ بولے کہ خدا کی قسم ہم نے اپنوں کے ظلم میں صبح کی۔ یہ سن کر میں ہنسا۔ وہ میرے ہنسنے پر حیران ہوئے۔ میں اور زور سے ہنسا۔ وہ اور حیران ہوئے۔ میں ہنستا چلا گیا اور وہ حیران ہوتے چلے گئے۔ پھر یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ شہر افسوس میں ایک شخص وارد ہوا ہے جو ہنستا ہے۔

''آج کے دن بھی؟''

''ہاں، آج کے دن بھی۔''

لوگ حیران ہوئے اور خوف زدہ ہوئے۔ یہ متحیر اور خوف زدہ لوگ میرے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے۔ پہلے انھوں نے دور سے ایک خوف کے ساتھ مجھے ہنستے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ہمت کر کے قریب آئے۔ آپس میں سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص تو واقعی ہنس رہا ہے۔

''یہ کون ہے؟......کہاں سے آیا ہے؟''

''اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''کہیں ان کا جاسوس تو نہیں ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو آنکھوں آنکھوں میں دیکھا۔

تب میں نے کہا۔ ''اے لوگو، میں ان میں سے نہیں ہوں۔''

''پھر تو کن میں سے ہے؟''

میں کن میں سے ہوں، میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس آن ایک بوڑھا مجمع میں سے نکل

کر آیا اور گویا ہوا۔ ''اگر تو ان میں سے نہیں تو زاری کر۔''

''کس کے حال پر؟'' میں نے پوچھا۔

''بنی اسرائیل کے حال پر۔''

''کس لیے؟''

''اس لیے کہ جو ہو چکا تھا وہ پھر ہوا۔ اور جو ہو چکا ہے وہ پھر ہوگا۔''

یہ سن کر ہنسی میری جاتی رہی۔ میں نے افسوس کیا اور کہا کہ اے بزرگ، کیا تو نے دیکھا کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں، پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔''

''میں نے دیکھا اور یہ جانا کہ ہر زمین ظالم ہے۔''

''جو زمین جنم دیتی ہے، وہ بھی؟''

''ہاں، جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی۔ اور جو زمین دار الامان بنتی ہے، وہ بھی۔ میں نے گیا نام کے نگر میں جنم لیا اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے اور نروان کی کوئی صورت نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔''

''اور آسمان؟''

''آسمان تلے ہر چیز باطل ہے۔''

میں نے تامل کیا اور کہا کہ ''یہ سوچنے کی بات ہے۔''

''سوچ بھی باطل ہے۔''

''بزرگ، سوچ ہی تو انسانیت کی اصل متاع ہے۔''

وہ دوٹوک بولا، ''انسانیت بھی باطل ہے۔''

''پھر حق کیا ہے؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

''حق؟ وہ کیا چیز ہوتی ہے؟''

''حق۔'' میں نے پورے زور اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

اور اس نے سادگی سے کہا کہ ''جسے حق کہتے ہیں، وہ بھی باطل ہے۔''

میں نے یہ سنا اور سوچا کہ یہ بوڑھا شخص موت کے اثر میں ہے اور یہ بستی فنا کے رستے میں ہے۔ تُو ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ اور یہاں سے نکل چل، کہ تجھے زندہ رہنا ہے۔ سو میں نے اس قبیلے کی طرف سے منھ پھیرا اور اپنی جان بچا کر بھاگا۔ مگر میں ایک عجیب میدان

میں جانکلا، جہاں خلقت امڈی ہوئی تھی اور فتح کا نقارہ بجتا تھا میں نے پوچھا کہ لوگو، یہ کون سی گھڑی ہے اور یہ کیا مقام ہے؟ ایک شخص نے قریب آ کر کان میں کہا کہ یہ زوال کی گھڑی ہے اور یہ مقامِ عبرت ہے۔

''اور یہ کون شخص ہے، جس کے منہ پر تھوکا گیا ہے۔''

اس شخص نے مجھے زہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''تو اسے نہیں پہچانتا؟''

''نہیں۔''

''اے بدشکل آدمی، یہ تُو ہے۔''

''میں؟'' میں سناٹے میں آ گیا۔

''ہاں تُو۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا اور میری پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ سچ مچ میں تھا......... میں نے اپنے آپ کو پہچانا اور میں مر گیا۔''

تیسرا آدمی کہنے لگا۔ ''اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

پہلے آدمی نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا کہ۔ ''اچھا تو وہ تُو تھا جس کے منہ پر تھوکا گیا تھا۔''

''ہاں، وہ میں تھا۔''

''میں سمجھ رہا تھا کہ وہ میں تھا۔'' پہلا آدمی بولا۔

''تُو؟''

''ہاں میرا گمان یہی تھا۔ بہر حال، اب پتہ چل گیا کہ وہ محض میرا گمان تھا۔ جس کے منہ پر تھوکا گیا تھا وہ میں نہیں تُو تھا۔'' یہ کہہ کر پہلا آدمی مطمئن ہو گیا۔ مگر رفتہ رفتہ اسے بے کلی ہونے لگی۔ ایک اذیت کے ساتھ وہ لمحہ اسے یاد آیا، جب اس کے منہ پر تھوکا گیا تھا اور اب، جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی سپاٹ نہیں رہی تھی جتنی پہلے تھی۔ اس نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔ ''میں نے غلط کہا اور تو نے غلط سمجھا۔ وہ میں ہی تھا جس کے منہ پر تھوکا گیا تھا۔''

دوسرے آدمی نے اپنے اسی لہجے سے عاری آواز میں کہا۔ ''میں نے اس شکل کو جس پر تھوکا گیا تھا، بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ بالکل میری شکل تھی۔''

پہلے آدمی نے دوسرے آدمی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ یکا یک ایک لہر اس کے

دماغ میں اٹھی اور اس نے رکتے رکتے کہا۔ ''کہیں تُو میں تو نہیں ہے؟''

''میں، تُو؟..... نہیں، ہرگز نہیں میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے اور اس قسم کے کسی مغالطہ کا شکار نہیں ہو سکتا۔''

''تو نے اپنے آپ کو کیا پہچانا؟'' پہلے آدمی نے سوال کیا۔

دوسرے آدمی نے جواب دیا ''میں وہ ہوں جس کے منھ پر تھوکا گیا ہے۔''

''یہ پہچان تو میری بھی ہے۔'' پہلا آدمی بولا۔ ''اور اس سے مجھے یہ شک پڑا کہ شاید تُو میں ہو''

''مگر کیا ضرور ہے کہ۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ ''ہر وہ چہرہ جس پر تھوکا گیا ہے، میرا ہی چہرہ ہو؟''

''ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ تیرا چہرہ تیرا نہ ہو، میرا ہو۔''

اس پر دوسرا آدمی واقعی وسوسے میں پڑ گیا۔ اس نے شک بھری نظروں سے پہلے آدمی کو دیکھا۔ دونوں نے دیر تک ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھا اور طرح طرح کے وسوسے کیے۔ آخر کو دوسرا آدمی ہار کر بولا کہ ''ہم مر چکے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کیوں کر پہچان سکتے ہیں۔''

پہلا آدمی بولا۔ ''کیا جب ہم مرے نہیں تھے، تب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے؟''

اس پر دوسرا آدمی لاجواب ہو گیا۔ مگر اسی وقت تیسرے آدمی کو ایک لاجواب تجویز سوجھی۔ اس نے پوچھا کہ تم میں سے اپنی لاش کون لے کر آیا ہے؟ پہلا آدمی بولا کہ میں لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا ''پھر ہوا میں کیوں تیر چلاتے ہو، لاش کو دیکھ لو۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

یہ تجویز دونوں فریقوں نے قبول کر لی اور پھر تینوں لاش کے پاس گئے۔ تیسرا آدمی لاش کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''اس کا تو چہرہ ہی مسخ ہو چکا ہے۔ اب کیا شناخت ہو سکتی ہے؟''

دوسرا آدمی بولا۔ ''چہرہ مسخ ہو گیا ہے تو پھر تو یہ طے ہے کہ یہ میری لاش ہے۔ اس لیے کہ جب میرے منھ پر تھوکا گیا تھا تو میرا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔''

''چہرہ تو میرا بھی مسخ ہو گیا تھا۔'' پہلا آدمی بولا۔

''تیرا چہرہ کب مسخ ہوا تھا، میرا چہرہ تو اسی گھڑی مسخ ہو گیا تھا جس گھڑی میں نے لمبے بالوں، لال بندیا والی سانولی لڑکی کو اس کے بھائی کے ہاتھوں برہنہ کرایا تھا۔''

''دونوں اس کی صورت تکنے لگے۔ پھر بیک زبان کہا۔'' اور تو اس مسخ چہرے کے ساتھ اتنے دنوں لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا رہا؟''

''ہاں، میں اپنے مسخ چہرے کے ساتھ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا رہا۔ حتیٰ کہ میرے باپ نے مجھے دیکھا اور آنکھ بند کر لی اور میں مر گیا۔''

پہلے آدمی نے باپ کا ذکر کیا تو دوسرے آدمی کو بھی اپنا باپ یاد آ گیا۔'' میرا باپ بھی کچھ اسی سادگی سے مرا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اس کی شفقتِ پدری کو اکسانے کی کوشش کی اور رقت کے ساتھ کہا کہ اے میرے باپ، تیرا بیٹا آج مر گیا۔ باپ میری مسخ صورت کو تکنے لگا۔ پھر بولا کہ اچھا ہوا کہ تُو میرے پاس آنے سے پہلے مر گیا۔ یہ سب کچھ کرنے اور دیکھنے کے بعد بھی تُو زندہ آتا تو میں تجھے قیامت تک زندگی کا بوجھ اٹھانے کی بددعا دیتا..... یہ میرے باپ کا آخری فقرہ تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔''

پہلا آدمی خشک آواز میں بولا۔'' ہمارے بوڑھے باپ اپنے جوان بیٹوں سے زیادہ غیرت مند تھے۔ اور ہم نے ان کے سامنے کیا کیا۔ میں اپنے مسخ چہرے والی لاش لے کر یہاں آ گیا اور اپنے باپ کی لاش وہیں چھوڑ آیا۔''

دوسرا آدمی یہ سن کر چونکا اور بولا۔'' مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں بھی اپنے باپ کی لاش وہیں چھوڑ آیا۔''

تیسرا آدمی ایک تلخی سے ہنسا۔ کہنے لگا۔'' آگے جب ہم نکلے تھے تو اپنے اجداد کی قبریں چھوڑ آئے تھے۔ اب کے نکلے ہیں تو اُن کی لاشیں چھوڑ آئے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی ہنسی معدوم ہو گئی اور ایک افسردگی نے اسے آلیا۔ اسے اپنا پہلا نکلنا یاد آ گیا۔ ماضی کے دھندلکے میں اسے بہت سی صورتیں نظر آئیں۔ روشن چہروں کی ایک ندی تھی کہ اس کے تصور میں امڈ آئی تھی —— چہرے، جو ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر دکھائی نہیں دیے۔ اور اب یہ دوسرا نکلنا اور اب پھر...... اس نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ دل ہی دل میں کہا کہ یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ میں نکل آیا ہوں یا نہیں نکل آیا۔ مگر بہت سے روشن چہرے پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ کتنے روشن چہرے تب نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ کتنے روشن چہرے اب نظروں سے اوجھل ہو

گئے۔'' اور اسے یہ تصور کر کے تعجب ہوا کہ روشن چہروں پر جو اداسی اس نے اس بار دیکھی تھی وہی اداسی پھر اس بار دیکھی۔ اس نے افسردہ لہجے میں پہلے آدمی اور دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔ ''میں نے غلط کہا تھا۔ دونوں بار ایک ہی واقعہ گزرا۔ یہ کہ ہم اپنے مسخ چہروں کے ساتھ یہاں آگئے اور روشن چہروں کو پیچھے چھوڑ آئے۔''

دوسرا آدمی خلا میں تکتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے لگا تھا کہ دونوں نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہا ہے تو؟''

بولا۔ ''وہاں سے مجھے کم از کم اپنے باپ کی لاش لے آنی چاہیے۔''

''اب وہاں سے کوئی لاش نہیں آسکتی۔''

''کیوں؟''

''سب رستے بند ہیں''

''اچھا؟........ تو گویا میرے باپ کی لاش وہیں پڑی رہے گی۔''

پہلے آدمی نے کہا۔ ''اپنے باپ کی لاش لا کر یہاں تُو کیا کرتا۔ مجھے دیکھ میں اپنی لاش لے کر آیا ہوں اور اسے اپنے کاندھے پہ لیے لیے پھر رہا ہوں۔''

''اسے دفن کیوں نہیں کرتا؟'' تیسرا آدمی بولا۔

''کہاں دفن کروں۔ یہاں جگہ ہے دفن کرنے کے لیے؟''

''تو اب ہمیں یہاں دفن ہونے کے لیے بھی جگہ نہیں ملے گی۔'' دوسرا آدمی کہنے لگا۔

''نہیں، دفن ہونے کے لیے یہ جگہ خوب ہے۔ مگر قبریں یہاں پہلے ہی بہت بن چکی ہیں۔ اب مزید قبروں کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی۔''

یہ سن کر تیسرے آدمی نے گریہ کیا۔ دونوں نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تو نے کیا سوچ کر گریہ کیا؟''

''میں نے یہ سوچ کر گریہ کیا کہ مجھے تو ابھی مرنا ہے۔ اور یہاں نئی قبروں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ پھر میں کہاں جاؤں گا؟''

''تو مرا نہیں ہے؟'' دونوں نے اسے غور سے دیکھا۔

''نہیں۔ میں ابھی زندہ ہوں۔''

دونوں اسے تکنے لگے۔ ''تُو اپنے تئیں زندہ جانتا ہے؟''

''ہاں، میں زندہ ہوں مگر......''

''مگر؟'' دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مگر میں لاپتہ ہوں۔''

''لاپتہ؟''

''ہاں، لاپتہ۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس قیامت میں بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے ہیں۔''

''اور کیا تجھے یہ پتہ ہے کہ۔'' پہلا آدمی بولا۔ ''جو لاپتہ ہوئے ہیں ان میں سے بہت سے قتل ہو چکے ہیں؟''

''مجھے پتہ ہے، مگر میں مقتولوں میں نہیں ہوں۔''

''بہت سے اس طور مرے جیسے ہم مرے ہیں۔''

''میں تمہاری طرح مرنے والوں میں نہیں ہوں۔''

''تجھے، جب کہ تو لاپتہ ہے، یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''بات یہ ہے کہ شہر خرابی میں زندوں کا پتہ نہیں چل رہا، مگر مرنے والوں کی لاشیں روز برآمد ہو رہی ہیں۔ پس اگر میں مرا ہوتا، تو کسی رنگ سے بھی مرا ہوتا، میری لاش اب تک برآمد ہو چکی ہوتی۔''

''اگر تُو مرا نہیں ہے تو تجھے اسیروں میں ہونا چاہیے۔ اور اگر تو اسیروں میں ہے تو سمجھ لے کہ چکر پورا ہو گیا۔''

تیسرا آدمی چکرایا۔ ''چکر پورا ہو گیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''مطلب یہ ہے۔'' دوسرا آدمی بولا۔ ''تو پھر پھر کر اس شہر میں پہنچ گیا ہے جس شہر سے کبھی نکلا تھا۔ ایک رفیق کے ساتھ یہ واقعہ گزر چکا ہے۔ وہ اسیر ہو کر وہیں پہنچ گیا جہاں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا جتن کر رہا تھا تو ساتھی نے کہا۔ رفیق، یہاں سے کیوں بھاگتا ہے، یہ مٹی تجھ سے کیا کہتی ہے۔ وہ رویا اور بولا کہ ''جب میں روزنِ زنداں سے جھانکتا ہوں تو سامنے سرسوں کا کھیت لہلہاتا دکھائی دیتا ہے۔ سرسوں اب پھولنے لگی ہے کہ بسنت قریب ہے۔ جنم بھومی اور اسیری نے اکٹھے ہو کر قیامت ڈھائی۔ بسنت بھی آ گئی تو پھر کیا ہو گا۔ بسنت، جنم بھومی اور اسیری......نہیں ان تین کو اکٹھا نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں بہت اذیت

ہے۔" اور وہ زنداں سے ایک رات سچ مچ نکل بھاگا اور لاپتہ ہو گیا۔"

"لاپتہ ہو گیا" تیسرا آدمی چونکا۔ "کہیں وہ میں تو نہیں تھا...... شاید...... کہ سرسوں میرے شہر میں بھی ایسی ہی پھولتی تھی کہ قیامت ڈھاتی تھی۔"

"نہیں، وہ تُو نہیں تھا۔"

"بسنت، جنم بھومی اور اسیری۔" تیسرا آدمی بڑبڑایا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "نہیں وہ میں نہیں ہو سکتا۔ میں اسیروں میں شامل نہیں تھا۔"

پہلا آدمی کہنے لگا۔ "اسیری کے بہانے جنم بھومی واپس پہنچنا کتنی عجیب سی بات ہے۔"

دوسرا آدمی بولا، "گیا والا آدمی اسیروں میں شامل ہوتا تو آج وہ گیا کی دھرتی پہ ہوتا۔"

تیسرے آدمی نے جھرجھری لی۔ "ہاں واقعی کتنی عجیب بات ہے۔ میری دادی غدر کے قصے سنایا کرتی تھی۔ بتایا کرتی تھی کہ کتنے لوگ ان دنوں روپوش ہوئے تھے۔ اپنے اپنے شہروں سے ایسے گئے کہ پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ اور ایک عورت تھی جو فرنگی سے بہت لڑی۔ پھر گھر اجاڑ کر اپنے خوشبو شہر سے نکلی اور نیپال کے جنگلوں میں نکل گئی۔ جنگل جنگل مثل بوئے آوارہ کے پھری اور کھو گئی۔" یہ کہتے کہتے اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر بولا۔ "آفت زدہ شہر میں لاپتہ ہونے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی گھنے، مہیب جنگلوں میں کھو جائے۔" وہ چپ ہوا اور خیالوں میں کھو گیا۔ اسے اپنا پہلا نکلنا پھر یاد آ گیا تھا۔ دیر تک خیالوں میں کھویا رہا، پھر ایک پچھتاوے کے ساتھ کہنے لگا۔ "کاش میں نے نیپال کے جنگلوں میں ہجرت کی ہوتی۔"

پہلا، دوسرا، تیسرا، اب تینوں آدمی چپ تھے۔ چپ اور بے حس و حرکت۔ جیسے بولنے اور حرکت کرنے کی خواہش سے مکمل نجات حاصل کر چکے ہوں۔ ساعتیں گزرتی چلی گئیں اور وہ اسی طرح گم سم بیٹھے تھے۔ آخر کو رفتہ رفتہ تیسرے آدمی نے بے کلی محسوس کی۔ اس نے پہلے آدمی کو دیکھا۔ دوسرے آدمی کو دیکھا۔ وہ دونوں جامد بیٹھے اپنی بے حرکت پتلیوں کے ساتھ خلا میں تکے جا رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بھی تو جامد نہیں ہو گیا ہے۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ وہ بھی تو جامد نہیں ہوا ہے، اس نے کوشش کر کے جنبش کی۔ لمبی سی جماہی لی اور دل ہی دل میں ایک اطمینان کے ساتھ کہا کہ میں ہوں۔ پھر اس نے پہلے اور دوسرے کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہاں سے اب چلیں۔" وہ اپنے ہونے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔

دونوں نے کچھ قدر تامل کے بعد اپنی بے نور نگاہیں خلا سے ہٹا کر اس پر مرکوز کیں۔

روکھی آواز میں کہا۔ ''کہاں چلیں۔ ہمیں اب کہاں جانا ہے۔ ہم تو مر چکے ہیں۔''

تیسرے آدمی نے ایک خوف کے ساتھ ان دونوں کے مسخ چہروں اور بے حرکت اور بے نور آنکھوں کو دیکھا۔ مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ مبادا میں بھی جامد ہو جاؤں —— وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے اٹھتے دیکھا اور کسی طرح کے لہجے اور جذبے سے خالی آواز میں پوچھا۔ ''تو کہاں جا رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے چل کر دیکھنا چاہیے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔'' وہ رکا، پھر سوچ کر بولا۔ ''کہیں واقعی میں اسیروں میں تو نہیں ہوں اور وہیں پہنچ گیا ہوں۔''

''کہاں؟'' پہلے آدمی نے پوچھا۔

اس نے پہلے آدمی کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ بس دوسرے آدمی کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیں اور پوچھا۔ ''کیا تجھے یقین ہے کہ وہ زنداں سے نکل بھاگا تھا؟''

''ہاں۔ اس نے پھولتی سرسوں کو دیکھا اور اپنے شہر کے زنداں سے نکل بھاگا۔''

''اور کیا تجھے یقین ہے کہ وہ میں نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' دوسرے آدمی نے کہا اور یہ کہتے کہتے تیسرے آدمی کو غور سے دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دوسرے آدمی نے تیسرے آدمی کو اتنے غور سے دیکھا۔ چونک کر بولا۔ ''کیا تو شہرِ افسوس میں نہیں تھا؟''

''تو نے ٹھیک پہچانا۔ میں شہرِ افسوس ہی میں تھا۔''

''میں نے تجھے مشکل سے پہچانا کہ تیرا چہرہ بگڑ چکا ہے۔ مگر جب شہرِ افسوس میں تھا اور موت کا انتظار کرنے والوں کا ہم نشیں تھا تب تو تیرا چہرہ درست تھا۔ تیرا چہرہ کب اور کیسے بگڑا؟''

تیسرا آدمی یہ سن کر محجوب ہوا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''بس یہ سمجھو کہ جب میں نے ان لوگوں سے منھ موڑا تب ہی سے میرا منھ بگڑتا چلا گیا۔''

''تعجب ہے کہ تو وہاں سے نکل آیا۔ شہرِ افسوس کے تو سارے رستے مسدود تھے۔ تو پکڑا نہیں گیا؟''

''پکڑا کیسے جاتا۔ پہچانا جاتا تب پکڑا جاتا۔ مگر میرا تو چہرہ ہی بگڑ کے بدل گیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ۔'' پہلا آدمی بولا۔ ''تیسرا مسخ چہرہ تیرا نجات دہندہ ہے۔''

دوسرا آدمی بولا۔ ''ابھی سے اتنا خوش فہم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو یہی پتہ نہیں ہے کہ

یہ آدمی ہے کہاں۔ اگر وہیں کہیں چھپا ہوا ہے تو آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں پہچانا جائے گا اور پکڑا جائے گا۔"

"یہی تو مجھے دھڑکا لگا ہوا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ جا کر دیکھوں کہ میں ہوں کہاں۔"

"تجھے یہ پتہ چل بھی گیا کہ تو کہاں ہے تو فرق کیا پڑے گا؟" دوسرا آدمی بولا۔

"وہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کروں گا؟"

"نکلنے کی سبیل؟" دوسرے آدمی نے اسے غور سے دیکھا۔ "اے لاپتہ آدمی، کیا تجھے پتہ نہیں ہے کہ سب رستے بند ہیں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آخر کب تک لاپتہ رہوں۔ مجھے اپنا اتا پتا لینا چاہیے اور کیا خبر ہے کہ نکلنے کی کوئی سبیل پیدا ہو ہی جائے۔"

"اے سادہ دل آدمی! تو نکل کے کہاں جائے گا؟" دوسرا آدمی بولا۔

"کہاں جاتا۔ یہیں آ جاؤں گا۔ آخر پہلے بھی تو آنے والے یہیں آئے تھے۔"

پہلے آدمی نے اسے گھور کر دیکھا۔ "یہاں......؟ یہاں اب تُو کہاں آئے گا؟ میں نے تجھے بتایا نہیں کہ میری لاش بے گور پڑی ہے۔"

تیسرا آدمی شش و پنج میں پڑ گیا۔ "یہ تو بڑی مشکل ہے۔ پھر میں کہاں جاؤں گا؟"

دوسرا آدمی دونوں کو دیکھ کر یوں گویا ہوا۔ "اے بدشکلو! کیا میں نے تمھیں گیا کے آدمی کی بات نہیں بتائی تھی۔ ہر زمین ظالم ہے اور آسمان تلے ہر چیز باطل ہے اور اکھڑے ہوؤں کے لیے کہیں اماں نہیں ہے۔"

"پھر؟" تیسرے آدمی نے مایوسانہ پوچھا۔

دوسرا آدمی دیر تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا —— تیسرے کو لگا کہ وہ جامد ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بولا۔ "پھر یہ کہ اے لاپتہ آدمی، بیٹھ جا۔ اور مت پوچھ کہ تو کہاں ہے اور جان لے کہ تُو مر گیا ہے۔"

OO

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم

سُریندر پرکاش

سمندر پھلانگ کر ہم نے جب میدان عبور کیے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیل گئیں۔ میں اک ذرا رکا اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جارہے تھے۔ میں بے پناہ اپنائیت کے احساس سے لبریز ہو گیا—— تب علیحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کی اور میں انتہائی غم زدہ سر جھکائے وادی میں اتر گیا۔

جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سب تھوتھنیاں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بار بار سر ہلا کر وہ اپنی رفاقت کا اظہار کرتے، ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی دھات کی گھنٹیاں ''الوداع'' ''الوداع'' پکار رہی تھیں۔ اوران کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے کونوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میرے ہونٹ شدت سے کانپے، آنکھیں مند گئیں، پاؤں رک گئے مگر پھر بھی میں بھاری قدموں سے آگے بڑھا۔ حتیٰ کہ میں ان کے لیے اور وہ میرے لیے دور افق پر لرزاں نقطے کی صورت اختیار کر گئے۔

وادی میں اونچے اونچے بے ترتیب درخت جا بجا پھیلے ہوئے تھے جن کے جسموں کی خوش بو فضا میں گھل گئی تھی۔ نئے راستوں پر چلنے سے دل میں رہ رہ کے امنگ سی پیدا ہوتی۔ سورج مسکراتا ہوا پہاڑ پر سیڑھی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ میں گرد آلود پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر صاف

شفاف، چکنی سڑکوں پر آ گیا۔ پختہ سڑکوں پر صرف میرے پاؤں سے جھڑتی ہوئی گرد تھی جو میں پگڈنڈیوں سے لے کر آیا تھا —— یا پھر میرے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

چکنی سڑک کی سیاہی دھیرے دھیرے ابھر کر فضا میں تحلیل ہونے لگی اور افق پر سورج کمزوری سے لڑ کھڑانے لگا۔

ابھی جھٹپٹا ہی تھا کہ میں ایک گول کشادہ مکان کے بڑے سے پھاٹک پر آ کر رکا۔ نئے خوبصورت پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور کنجوں میں سے ہوتی ہوئی ایک روش اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے تک چلی گئی تھی جس پر بکھرے ہوئے پتھر دن کی آخری زرد دھوپ میں جھلملا رہے تھے۔ میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا یوں آگے بڑھا جیسے پہلے بھی یہاں کئی بار آ چکا ہوں۔

خاموش، ویران برآمدے میں میری آواز گونجی۔ مجھے تعجب سا ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر آگے بڑھا اور بڑے سے دلندیزی دروازے نے مجھے بانہیں پھیلا کر خوش آمدید کیا۔

دلندیزی دروازوں کے ساتھ ہی قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیاں تھیں اور ان سب پر گہرے کتھئی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے جن کی وجہ سے سارے کمرے میں گہرے دھندلکے کا احساس ہو رہا تھا۔ ماحول کی اس ایکا ایکی تبدیلی نے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی اور میں سہما سہما کھڑا ہو گیا۔

"......... نیند کی جھپکی تھی شاید؟"

نیم تاریک کمرے میں میں سہما سہما صوفے کے گدگدے پن میں دھنستا ہوا پاتال میں اترا جا رہا ہوں۔ آتش دان میں آگ بجھ گئی ہے پھر بھی راکھ میں چھپی بیٹھی چنگاریوں کی چمک گہرے سبز ریشمی قالین پر ابھی موجود ہے۔ کارنر ٹیبل پر رکھے دھات کے گل دان کو میرے بڑے سے ہاتھ نے چھو کر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے جسم کی خنکی ابھی تک انگلیوں پر محسوس ہو رہی ہے۔ گل دان کا اپنا ایک الگ وجود میں نے قبول کر لیا ہے۔ ہاتھ میرا ہے اس لیے احساس بھی میرا ہے۔ لیکن گل دان نے میرے احساس کو قبول نہیں کیا۔

مجھے "اس کا" انتظار ہے۔ "وہ" اندر کاریڈار میں کھلنے والے دروازے سے پردہ سرکا کر مسکراتا ہوا نکلے گا اور میں بوکھلاہٹ میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھوں گا اور پھر ہم دونوں بڑی

گرم جوشی سے ملیں گے۔ وہ بڑا خوش سلیقہ آدمی ہے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ، رنگوں کا انتخاب، آرائشی چیزوں کی سج دھج —— سب میں ایک ''گریس'' ہے۔ نہ جانے وہ کب سے ان کے بارے میں سوچ رہا تھا، ان کے لیے بھٹک رہا تھا —— اور تب کہیں جا کر وہ سب کر پایا ہے۔

آتش دان بلیک ماربل کو کاٹ کر بنایا گیا ہے جس پر جا بجا غیر مسلسل سفید دھاریاں ہیں۔ میں کچھ دیر تک ان دھاریوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دھاریاں ایک طویل و عریض صحرا کے ''لینڈ اسکیپ'' سے مشابہ ہیں۔ بالکل خالی صحرا، اداس، خاموش۔ اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس صحرا میں کھو گیا اور ریت کے جھکڑ نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا۔ اور میں ویسے ہی سہما سہما خوف زدہ سا اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لیے اس صحرا کی طرف بڑھا۔

میں آتش دان پر بنی کارنس پر ہاتھ جما کر جھک کر اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا۔ کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی جو بے دھیانی میں میرا ہاتھ لگنے سے گر گئی۔ میں نے اس تصویر کو اٹھا کر دیکھا: ایک خوش پوش آدمی گود میں ایک ننھی سی بچی کو اٹھائے بیٹھا ہے اور اس کے بائیں کندھے سے کندھا بھڑائے ایک عورت بیٹھی ہے۔ دونوں مسکرا رہے ہیں اور بچی ان کی طرف مڑ کر دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کبھی ایسی ہی تصویر کھنچوانے کے لیے میں بھی بیٹھا تھا اور فوٹو گرافر نے کہا تھا:

''ذرا مسکرائیے!''

ہم تینوں مسکرائے اور فوٹو گرافر نے کہا: ''تھینک یو'' اور ہم اٹھ کر بکھر گئے۔ ہم ابھی تک بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر اکٹھے ہو بھی جائیں تو مسکرا نہیں سکتے۔ باقی تصویر ویسی کی ویسی کھنچ جائے گی۔

لیکن ''وہ'' تصویر میں مسکرا رہا ہے، اس کی بیوی بھی مسکرا رہی ہے اور بچی بھی شاید، کیوں کہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے ہی مسکراتا ہوا وہ پچھلے دروازے سے وارد ہوگا اور اس کی بیوی پچھلے کمروں میں کسی بیڈ روم میں بیٹھی مسکرا رہی ہوگی۔ اور بچی شاید مکان کے پچھواڑے خوبصورت، پرسکون کنجوں میں تتلیاں پکڑ رہی ہوگی۔

صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر پینے کے لیے کچھ رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں اس تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنے آپ کو صحرا میں کھوج رہا تھا تو کوئی چپکے سے نارنگی کے رنگ کی کسی چیز کا گلاس رکھ گیا تھا۔

''ٹھک......ٹھک......ٹھک''۔ برآمدے سے کسی کے زمین پر لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آرہی ہے: بڑی مسلسل، بڑی متوازن، بڑی باقاعدہ۔ میں دروازے کا پردہ سرکا کر سر باہر نکال کر دیکھتا ہوں۔ کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے کے خم سے مڑ گیا اور اب اس کی پشت بھی غائب ہوگئی ہے اور لاٹھی ٹیکنے کی آواز ہر لحظہ دور ہوتی جارہی ہے۔

''سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے؟'' ''ہاں، ہاں سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے!'' میں واپس کمرے میں آتے سوچتا ہوں۔ نمکین ہواؤں کا جھونکا سب چیزوں کو چھیڑتا ہوا، سب چیزوں پر سے گزر گیا۔

''سمندر سے میرا تعلق ہے؟ میں سمندر کے بارے میں اتنا فکرمند کیوں ہوں؟''

میرے ذہن میں سمندر اپنی بے کرانی، اپنی گہرائی اور اپنے مدوجزر کے ساتھ پھیلتا چلا گیا اور میں محسوس کرنے لگا کہ یہ واقعی سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے اور میں ایک کمزور سی، نحیف سی چھوٹی سی کشتی کی طرح ہچکولے کھاتا ہوا، ڈولتا ہوا کھڑکی تک پہنچا اور جھٹ سے پردہ ہٹا دیا۔

''باہر شاید برف گر رہی ہے۔'' ''ایک ایک گالا''۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ کھڑکی سے باہر فضا میں دھیرے دھیرے کبھی سیدھا کبھی الٹا حرکت کرنے لگا مگر ایک گالا بھی اس پر نہ گرا، ایک ذرا سی خنکی بھی اس پر محسوس نہ ہوئی۔

''قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکی!'' میں پٹر پٹر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''برف کہاں ہے؟'' ''نہیں، کہیں نہیں!'' میں خود ہی سوال کرتا ہوں اور پھر خود ہی جواب دیتا ہوں، مگر اس سوال اور جواب کی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی، صرف محسوس ہوتی ہے ایک اداس، پُر اسرار سرگوشی —— اور میں اس احساس سے خوف زدہ ہو کر پھر اس گل دان کی طرف پلٹتا ہوں جس نے سب سے پہلے اس کمرے میں میرے احساس کو بیدار کیا تھا۔

بڑا سا گول گل دان جس پر بڑی ترتیب سے نقش و نگار بنائے گئے تھے بالکل بے حرکت پڑا ہے اور اس میں شروع جاڑوں کے پھول سجے ہوئے ہیں۔ یہ پھول کس ہاتھ نے سجائے ہیں؟ گل دان سے ہٹ کر میرا ذہن کچھ ہاتھوں کے بارے میں سوچتا ہے جن میں پھول ہیں۔ پھر ہوا کھڑکی کے پردوں کو چھیڑتی ہے، دروازے کا پردہ بھی سرسراتا ہے اور میں بالکل تنہا ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اور پھر غم زدہ ہو جاتا ہوں۔ بے وجہ کا غم، بے بنیاد اکیلا پن۔

ایک سانپ میرے ذہن میں پھن پھیلا کر اپنی تیز تڑپتی ہوئی سرخ زبان نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے، پھر آہستہ سے نیچے قالین پر اتر جاتا ہے اور تیزی سے چلتا ہوا پیچھے والے دروازے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ میں خوف زدگی کی انتہائی کیفیت میں چیخ اٹھتا ہوں اور میری نظروں کے سامنے بیڈ روم میں بیٹھی ہوئی، مسکراتی ہوئی ایک عورت انگڑائی لیتی ہے اور تتلیاں پکڑتی ہوئی ایک بچی زقند بھرتی ہے اور میں صوفے کی پشت کو مضبوطی سے تھام لیتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ سارا منظر کہیں دور اندھیرے میں آہستہ آہستہ گم ہو جاتا ہے۔

وہ ابھی نہیں آیا، رات باہر لان میں اتر آئی ہوگی۔'' لاٹھی ٹیکنے کی آواز پھر قریب آتی محسوس ہوتی ہے۔ میں تیزی سے بڑھ کر دروازے کا پردہ ہٹا دیتا ہوں۔ ایک اندھا، ادھیڑ عمر آدمی لاٹھی کے سہارے بڑھ رہا ہے —— نپے تلے قدموں کے ساتھ لاٹھی کی باقاعدگی سے ابھرتی ہوئی آواز کے ساتھ۔ اس سے پیشتر کہ میں اسے بڑھ کر روکوں، وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور خاموشی سے برآمدے کے خم سے مڑ جاتا ہے۔ ایکا ایکی پلٹ کر میں کمرے کے خالی پن کو گھورتا ہوں۔ بڑا خوبصورت کمرہ ہے۔ دیوار پر بارہ سنگے کا ایک سر ٹنگا ہوا ہے اور اس کے نیچے ایک بڑا ہی مرصع تیر کمان آرائش کے لیے لٹکا ہوا ہے۔ کھڑکی اور دروازے کے درمیان والی دیوار کے خالی پن کو بھرنے کے لیے چوڑے سنہری چوکھٹے والی ایک بڑی سی تصویر ٹنگی ہے جس میں ہزاروں رنگوں والی ان گنت جنگلی چڑیاں پھدکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔

''سب خوب ہے! ہر چیز جاذب ہے! تمام کچھ اپنانے کو جی چاہتا ہے۔ کاش! اے کاش! یہ سب کچھ میرا ہوتا۔ یہ صوفہ، کارنر ٹیبل پر پڑا ہوا گل دان، بک کیس میں پڑی ہوئی کتابیں، کارنس پر رکھی ہوئی تصویر، گہرے سبز قالین کا گدگدا پن، آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیاں، دلندیزی دروازے پر سرسراتے ہوئے پردے، بیڈ روم میں مسکراتی عورت، تتلیاں پکڑتی ہوئی بچی اور ان تمام چیزوں کے اپنا ہونے کا ہمہ گیر، بھرپور احساس۔''

مگر نہیں —— یں۔ یں۔ ں!'' اف! میری آواز اس قدر بلند کیوں ہے!'' مجھے اپنے چلانے پر ندامت محسوس ہوتی ہے۔ ندامت، خوف اور اجنبیت کے احساس سے میں گزر جاتا ہوں اور پھر مجھے اپنا وجود گہرے سبز قالین پر اوندھا پڑا محسوس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آدمی قالین کو اپنی انگلیوں میں بھر لینے کی کوشش میں تڑپ رہا ہے، رو رہا ہے اور پھر اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔

''خاموش ہو جاؤ —— خاموش!'' میں گہرے غم میں ڈوب کر اسے کہتا ہوں اور میرے اپنے آنسو ڈھلک کر میرے رخساروں تک آ جاتے ہیں اور میں اسے ویسے ہی خاموشی سے تڑپتا ہوا دیکھتا ہوں۔

''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک۔'' میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔

''رک جاؤ...... و...... و...... و!'' میں دہاڑتا ہوں۔ اندھا بالکل میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ اس پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں لپک کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ناکام رہتا ہوں۔ (یہ میری زندگی کی بہت سی ناکامیوں میں سے ایک ناکامی ہے۔ میں اسے پہلے دن سے ہی پکڑنے میں ناکام رہا ہوں۔) وہ برآمدے کے موڑ سے اوجھل ہو گیا ہے۔

اندر وہ قالین پر اوندھا پڑا ابھی تک بسور رہا ہے۔ پیچھے کھلنے والے دروازے پر ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی۔ سانپ کے مکان میں گھس جانے سے ذرا بھی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ (اف کتنے بے حس لوگ ہیں؟)

اسی دروازے کے قریب پتائی پر کانسے میں ڈھلا ایک بوڑھا بیٹھا بڑی بے فکری سے ناریل پی رہا ہے۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔''

''چلتا ہوں؟'' سوال اور جواب دونوں ہاتھ پھیلائے نظریں ایک دوسرے پر گاڑے کھڑے ہیں اور میں آہستہ سے سرک کر اس مجمع کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

''پانی تو پی لیجیے۔'' ایک بڑی ہی میٹھی آواز کمرے میں گونجی۔

''نہیں، بس اب میں چلتا ہوں، بہت دیر ہو گئی۔'' میں پلٹے بغیر، اس عورت کو دیکھے بغیر ہی جواب دیتا ہوں۔

''لیکن کہاں؟'' آواز پھر ابھری اور پھیل گئی۔ (سوال اور جواب نے مل کر شرارت کی ہے شاید! اور اب میں ان کے درمیان کھڑا ہوں اور میرے لیے ان کی فتح مند نظروں کی تاب لانا مشکل ہو رہا ہے اور میں سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہوں۔)

یہ سب کچھ اگر نہ ہو سکے تو بھی کوئی بات نہیں۔ مگر اتنا تو ہو ہی سکتا ہے کہ میں اس بوڑھے کی طرح بے فکری سے بیٹھا تمبا کو پیتا رہوں؟

''پہلے کانسے میں ڈھلنا پڑے گا!'' قالین پر اوندھے پڑے آدمی نے کہا اور اٹھ کر آتش دان پر بنے صحرا میں گم ہو گیا۔

''کیا کوئی مجھے کانسے میں ڈھالے گا؟'' میں نے مجسمے کو مخاطب کر کے کہا۔ بوڑھے نے تمباکو کا ایک لمبا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔ قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیوں کے پردے سرسرائے اور بڑی سی تصویر میں ہزار رنگوں والی جنگلی چڑیوں نے پھدک کر اپنی اپنی جگہیں بدل لیں۔ میں خوف زدگی کے انتہائی احساس سے لڑکھڑاتا ہوا سائیڈ ٹیبل تک پہنچا اور غٹاغٹ سارا گلاس چڑھا گیا۔

''ابھی اسے صحرا میں کھوجنا ہے۔ شاید اس شدید برف باری میں بھاگ کر جانا پڑے۔ یا پھر سمندر کنارے کے شہر میں۔'' (کشتی بہر حال ساحل تک پہنچنی چاہیے)

(ایک بپھرا ہوا سمندر، ایک ریت اڑاتا صحرا اور ایک برف کا طوفان اور میں اکیلا آدمی! میں کیا کچھ کر لوں گا!) میں دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دیتا ہوں جو یہ سب کچھ سوچتی ہے مگر نظر نہیں آتی اور مجھ نحیف، کمزور، بے سہارا.....کو بھٹکاتی پھرتی ہے۔

''ٹھک.....ٹھک۔'' وہ پھر گزر گیا۔ میں اسے پکڑ نہیں سکتا، اس سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ گونگا، بہرہ، اندھا۔ ذہن میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی لاٹھی کی آواز۔

''چلو بھائی چلو۔'' دروازے پر کسی نے دستک دی ہے۔

''مگر وہ تو ابھی آیا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب نہیں پھر سہی، دیکھو دیر ہو رہی ہے۔'' آواز باہر لان میں سے گونج کر آ رہی ہے۔

''ذرا سنو! پھر کب آنا ہوگا؟'' میں نے پلٹ کر ڈرائنگ روم میں چاروں طرف نظریں گھمائیں جو مجھے انتہائی پسند تھا —— پرُسکون، آرام دہ، ''کوزی''

جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ شاید وہ میری حریص نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

لاٹھی ٹیکنے کی آواز بڑی جلدی جلدی دروازے پر سنائی دی۔ شاید اسے بھی جلدی ہے! باہر صرف آواز تھی۔ ایک اس کے قہقہے کی آواز، دوسری اندھے کی لاٹھی کی آواز۔ اور رات باہر لان میں اتر کر سارے میں پھیل گئی تھی —— شروع جاڑوں کی اندھیری رات۔

''یہ سب تمہارا ہی تو تھا۔ مگر اب اس سے زیادہ نہیں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔''

اس کی آواز پھر گونجی، پھیلی اور سمٹ کر پھر باہر واپس چلی گئی۔

میں کسی انجانی چیز کے کھو جانے کے غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' میں چیخا۔ ''کم از کم پچھلے دروازے سے اندر جا کر ان میں ایک لمحے کے لیے بیٹھ تو جاتا۔ ان کی چاہت، ان کی اپنائیت کی گرمی سے اپنی آغوش کے خالی پن کو آسودہ تو کر لیتا۔ یہ ظلم ہے —— سراسر ظلم!''

''ہا —— ہا —— ہا۔''

میں نے خالی قالین کو ایک نظر دیکھا اور پھر بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں بھر لینے کے لیے اس پر اوندھا لیٹ گیا اور میرے پشیمانی کے آنسوؤں سے اس کا دامن بھیگنے لگا۔ اور پھر صحرا میں بھٹکا ہوا آدمی آہستہ سے چل کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کانسے میں ڈھلے ہوئے بوڑھے نے ایک اور گہرا کش لیا اور تمباکو کا دھواں میری طرف اُگل دیا۔ میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھنا چاہا: ''دیکھ رہے ہو؟ یہ سب دیکھ رہے ہو نا؟'' ایکا ایکی میں نے اپنی بے چارگی پر قابو پایا اور بازو لہرا کر کہنا چاہا: ''سنو! تم سب سن لو۔ سمندر کنارے کے شہر کا پتا ہے نا؟ اگر کبھی کوئی کمزور، نحیف، بے سہارا کشتی ساحل سے آ کر لگے تو سمجھ جاؤ کہ وہیں میں ہوں!''۔

OO

ماچس

بلراج مین را

جب اس کی آنکھ کھلی وہ وقت سے بے خبر تھا۔
اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔
سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔
ماچس خالی تھی۔
اس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔
خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔
اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔
بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچس الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔
اس نے باری باری سب کو دیکھا۔
سب خالی تھیں۔
اس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔
دو بج رہے تھے۔
فرش برف ہو رہا تھا۔
ابھی دو بجے ہیں، میں وقت سے بے خبر تھا، میں سمجھ رہا تھا صبح ہونے کو ہے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟

ایک بار آنکھ کھل جائے تو پھر نہیں لگتی۔

اس نے کمرہ چھان مارا۔

کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلون کی جیبیں، جیکٹ کی جیبیں --- ماچس کہیں نہ ملی۔

کمرے کی بری حالت ہو گئی تھی۔

کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں، کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، ٹرنک کھلا ہوا تھا۔

کوئی آ جائے اس سمے۔

رات کے دو بجے —— کمرے کی یہ حالت؟

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے۔

ماچس کہاں ملے گی؟

ماچس نہ ملی تو کہیں..........

تو کہیں..........

کہیں میرا دھڑکتا دل خاموش نہ ہو جائے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟

میں وقت سے بے خبر تھا —— ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی۔

ماچس کہاں ملے گی؟

اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی کی حکومت اور خاموشی کا پہرہ۔

کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔

جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستے سے بے خبر تھا۔

رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دُور دُور تاحدِ نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیمپ پوسٹوں کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور چوراہے پر اس کے

قدم رک گئے۔

یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا ٹیوبیں چمک رہی تھیں لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔

اس نے حلوائی کی دوکان کی جانب قدم بڑھائے۔

ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے، دہکتا کوئلہ، دم بہ لب کوئلہ!

حلوائی کی دوکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھری بنا سو رہا تھا۔

وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھری کھل گئی۔

کون ہے؟ کیا کر رہے ہو؟

میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

پاگل ہو گیا؟ بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے۔

تو پھر؟

پھر کیا؟ گھر جاؤ۔

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں! مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

تم پاگل ہو! جاؤ۔ میری نیند خراب مت کرو، جاؤ!

تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟

ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی، جاؤ تم۔

وہ پھر سڑک پر آ گیا۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

اس نے قدم بڑھائے۔

چوراہا پیچھے رہ گیا، تیز روشنی پیچھے رہ گئی، کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔

اس کے قدم تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، ان گنت لیمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے —— دھیمی روشنیوں والے لیمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔

یکا یک اس کے قدم رُک گئے۔

سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔

وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔

میں سمجھا۔

کیا سمجھا؟

شاید آپ کے پاس ماچس ہو؟

میرے پاس ماچس نہیں ہے، میں اس علت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں —— تم بھی اپنے گھر جاؤ۔

اس نے قدم بڑھائے۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

وہ دھیمے دھیمے قدم بڑھا رہا تھا کہ تھک گیا۔

وقت سے بے خبر، اس کے تھکے تھکے قدم اٹھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ آتا، مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔

پھر لیمپ پوسٹ، مدھم روشنی اور پھر سیاہی۔

وہ لبوں میں سگریٹ تھامے، دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا۔

اس کی دور، اندر پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہو گئی تھی۔

اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

شب خوابی کا لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔

وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا، وقت سے بے خبر، لیمپ پوسٹوں سے بے خبر، ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔

سامنے پل تھا، مرمت طلب پل۔

حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچوں بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

اس نے لال ٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ۔

کون ہے؟

وہ خاموش رہا۔

سیاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سپاہی اس کی طرف لپکا۔

کیا کر رہے تھے؟

کچھ نہیں۔

میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟

آپ کے پاس ماچس ہے؟

میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو، ماچس ہے......کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے آپ کے پاس ماچس ہو تو........

تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟

میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا........آپ کے پاس ماچس ہو تو........

تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن۔

اور تمھیں ماچس چاہیے........ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو........ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دور، دور تا حدِ نظر، سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ، تھانے تک......ماڈل ٹاؤن......؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے......ماچس چاہیے نا! تھانے میں مل جائے گی۔

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔

تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔
وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔
کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔
سگریٹ پی رہے تھے۔
میز پر سگریٹ کی کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔
صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔
کیوں بے؟
اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں...... مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔
کہاں رہتے ہو؟
ماڈل ٹاؤن! کیا آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟
کون ہو تم؟
میں اجنبی ہوں! کیا میں ماچس.......
ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟
تین ماہ! ماچس........
ماچس.........ماچس کا بچہ.........اجنبی............جاؤ اپنے گھر.........ورنہ بند کردوں گا.........ماچس.............
جب وہ تھانے سے باہر آیا وہ بری طرح تھک چکا تھا۔
اس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کردیا۔
اس کی ناک سُوں سُوں کرنے لگی تھی اور ان کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔
سگریٹ پینا ایک علت ہے۔
میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے۔
ماچس کہاں ملے گی؟
نہ ملی تو؟

وہ وقت سے بے خبر تھا، لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا، سڑک سے بے خبر تھا۔ اپنے بدن سے بے خبر وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔

دم بھر کو رکا اور سنبھلا۔

سنبھلا اور اس نے قدم بڑھانا ہی چاہا کہ ——

سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رکا۔

اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟

ماچس کے لیے تو میں ………

وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

آگے، جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔

آگے، جدھر سے وہ آیا تھا۔

○○

راستہ بند ہے

جیلانی بانو

راستہ بند ہے

بڑھتے ہوئے جرائم اور بے روزگاری کو کم کرنے کے لیے اب چیف منسٹر، منسٹروں کی تعداد بڑھانے اسمبلی کی طرف جانے والے ہیں۔

اس لیے راستہ بند ہے۔

الیکٹریکل پول کی سرخ بتی کسی راکشس کے دیدوں کی طرح چمک رہی ہے۔

اب راستہ کب کھلے گا ——؟

ٹریفک کا شور بڑھتا جا رہا ہے —— چاروں طرف سڑکوں پر کاروں، اسکوٹر، آٹو رکشا اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم ہے۔ لوگ بے صبری سے راستہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسکول جانے والے بچے بیگس سنبھالے کھڑے ہیں۔ سر پر اینٹوں کا ٹوکرا اٹھائے مزدور۔ گھر کا سامان لے جانے والی عورتیں۔ لاٹھی کے سہارے کھڑے ہوئے بوڑھے لوگ۔ ''منّی نو بجے ہمارا امتحان شروع ہو جائے گا۔'' ایک بچہ گھبرا کے اپنی بہن سے کہتا ہے۔

''ٹیچر ہمیں پیپر نہیں دیں گی۔'' منّی رونے لگتی ہے اور پھر بھائی کا ہاتھ پکڑ کے کہتی ہے۔

''آؤ —— اپن آگے چلے جائیں گے۔''

سب بچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے ہیں۔ ٹریفک کانسٹبل ڈنڈا مار

کے انہیں پیچھے ڈھکیل دیتا ہے۔

''اُدھر دیکھو ــــــ لال بتی نظر آرہی ہے ـــــ؟''

''مگر ہمارا ایگزام ہے انکل ـــــ'' بچے رونے لگتے ہیں۔

ان بچوں کو جانے دو یار لمبے بالوں والا ایک نوجوان کہتا ہے اس کے ہاتھ میں گٹار ہے ''دس بجے میرا ٹی وی پروگرام ہے۔'' مجھے بھی اب جانے دو۔

وہ آگے بڑھا تو کانسٹبل نے ڈنڈا مار کے پیچھے ڈھکیل دیا۔

اسکوٹر پر سوار ایک نوجوان سب کو ہٹا کر تیزی سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر کانسٹبل نے اسے ڈنڈا مار کر گرا دیا۔ اسکوٹر اس کے اوپر گر گئی۔ اس کے سر سے خون نکلنے لگا۔ سب لوگ جمع ہو گئے ــــ چیخ و پکار ہونے لگی۔ کچھ لوگ کانسٹبل کو مارنے دوڑے مگر اس نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو اکھٹا کر لیا اور زخمی نوجوان سے سو روپے جرمانہ لے کر اسے آگے جانے دیا۔

''دس بجے اے پی ایکسپریس چلی جائے گی۔ مجھے دہلی جانا ہے جانے دو بھائی'' آٹو میں سوار ایک نوجوان نے بلک کر کہا۔

''آپ سب کہیں نہیں جائیں گے۔ چیف منسٹر کے آنے تک کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

کانسٹبل نے سیٹی بجا کر سب کو روک دیا۔

''یہ راستہ کدھر جاتا ہے ــــ؟ ہونڈا کار سے منھ باہر نکال کر ایک صاحب نے رکشا والے سے پوچھا۔

''ابھی تو کدھر بھی نہیں جاتا صاحب۔'' رکشا والے نے بیزار ہو کر کہا۔

''چیف منسٹر کے جانے کے بعد معلوم ہو گا کون سا راستہ کدھر جاتا ہے؟''

''بھائی صاحب ہمیں جانے دو۔'' آٹو رکشا میں بیٹھی ایک عورت رو رو کر کانسٹبل سے کہہ رہی تھی۔

''میری بیٹی کے بچہ ہونے والا ہے اسے جلدی سے ہاسپٹل لے جانا ہے۔''

''بس کرو ماں بچے پیدا کرنا ــــ'' اسکوٹر والے ایک نوجوان نے بیزار ہو کر کہا۔

''سامنے اتنے بچے کھڑے ہیں۔ انھیں آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔''

او بابو۔ اس لنگڑے لاچار کو ایک روپیہ دے دو۔ صبح سے بھوکا ہوں۔ اللہ آپ کو ہزار

روپے دے گا۔'' ایک صاحب نے جلدی سے پرس کھولا۔ بھکاری کو ایک روپیہ دے دیا اور بھکاری اس کو بے شمار دعائیں دینے لگا۔

ان صاحب کے پاس ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی اماں سے پوچھا۔

''اماں۔ کیا اللہ میاں بھکاری کی دعا سن لیتے ہیں؟ تو پھر وہ اپنے لیے اللہ میاں سے ہزار روپے کیوں نہیں مانگ لیتا ــــ؟''

''افوہ ــــ مجھے تو چکر آ رہا ہے ــــ جانے راستہ کب کھلے گا ــــ میرا پریشر بڑھ گیا ہے۔''

ایک بوڑھے سے صاحب نے گٹار والے نوجوان کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

''آپ کا گھر کہاں ہے صاحب ــــ؟ میں آپ کو پہنچا دوں گا ــــ'' ان کے قریب کھڑے ہوئے آٹو رکشا والے نے بڑی ہمدردی سے انہیں دیکھا۔

''میرا گھر کہاں ہے ــــ؟ تیس برس ہو گئے یہ سوچتے ہوئے کہ کیا وہ میرا گھر ہے ــــ؟ تم کیسے پہنچا دو گے وہاں جانے کا راستہ تو میں بھی نہیں جانتا ــــ'' انھوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''پاگل بڈھا ہے'' ــــ آٹو رکشا والا گٹار والے لڑکے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

آخر راستہ کب کھلے گا۔ ہم یہاں کب تک کھڑے رہیں گے ــــ؟

اسکول جانے والے بچے بیزار ہو رہے تھے۔ انھوں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک بڈھے سے پوچھا۔ اس کے سر پر اینٹوں کا ٹوکرا تھا۔ ہاتھ میں بندھی ہوئی رسی تھی۔

''جانے راستہ کب کھلے گا بیٹے۔ مجھے دیکھو! اتنا بوجھ اٹھائے کب سے کھڑا ہوں۔''

''لڑکے نے بڑے غور سے بوڑھے کو دیکھا اور پاس کھڑی اپنی بہن سے بولا۔

''منّی ــــ کیا ہم بھی کہاں کھڑے کھڑے اس آدمی کی طرح بوڑھے ہو جائیں گے ــــ؟''

''ہمیں پیچھے لوٹ کر دوسری سڑک پر بھی نہیں جانے دے رہے ہیں۔'' ایک سائیکل سوار نے کہا۔

''چیف منسٹر آنے والے ہیں۔ اس لیے سڑکوں کے کنارے والی پھلوں ترکاریوں کی ٹرالی۔ فٹ پاتھ پر سونے والے اندھے اپاہج فقیروں کو ہٹا کر وہاں صفائی کی جا رہی ہے۔''

''آج سڑکوں پر اتنی صفائی کیوں ہو رہی ہے ممی ——؟ کیا منسٹر کے آنے سے کوئی بیماری پھیل جاتی ہے ——؟'' ایک بچے کے اس سوال پر آس پاس کھڑے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔

پھر ایک ویگن۔ آ کر سب کو ہٹاتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ کانسٹبل سیٹی بجا کر اس کی طرف دوڑا —— کار والے نے کانسٹبل کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کچھ دے دیا —— اور کار آگے بڑھ گئی۔

اس کار کے آگے جاتے ہی ہجوم کو ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجاتی ایک اور میڈم آگے بڑھنے لگیں۔ کانسٹبل نے سیٹی بجا کر انہیں روکا۔

میڈم جی راستہ بند ہے۔ اوپر نہیں دیکھا۔ آپ نے ——؟

''لیکن مجھے ابھی ایک پارٹی میں جانا ہے۔ ہنو تم نہیں جانتے میں کون ہوں ——! میں ایک پارٹی کی ممبر ہوں۔ میٹنگ میں جا رہی ہوں۔ لو دیکھو میرا وزیٹنگ کارڈ ——''

''مگر چیف منسٹر نے آپ کا راستہ بند کر دیا ہے تو اب سوچ لو میڈم جی کہ آپ کس پارٹی کی دعوت میں جائیں گی اب؟''

گٹار والے لڑکے نے ہنس کر کہا تو آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

کانسٹبل پھر میڈم جی کی کار کے اندر جھانک کر کچھ بولا۔ میڈم نے اس کے ہاتھ میں کچھ تھما دیا اور کار آگے چلی گئی۔

''یا اللہ —— میرے اللہ راستہ کھول دے۔ اتنا بوجھ اٹھائے کب تک کھڑی رہوں میں ——؟''

سر پہ لکڑیوں کا بوجھ اٹھائے گود میں بچے کو سنبھالے ایک عورت رونے لگی۔

''اتنی زور سے کیوں چلا رہی ہے اماں'' —— گٹار والے لڑکے نے اس سے کہا اور اس کے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

''کیا تمہارے پکارنے سے اللہ میاں راستہ کھولنے آ جائیں گے ——؟''

''ارے اللہ میاں کسی نیک بندے کو بھیج دیں جو آ کر راستہ کھول دے۔'' عورت نے بیزار ہو کر کہا۔

''ذرا سنئے مولوی صاحب۔ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے'' —— گٹار والے کے پاس

کھڑے ایک نوجوان نے مولانا سے کہا۔

''ہاں —— اب اللہ یاد آرہا ہے تجھے —— ؟'' مولانا نے غصہ میں عورت کی طرف دیکھا۔ ''سالے شراب پیتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں گالیاں بکتے ہیں —— کبھی نماز نہیں پڑھتے۔ اللہ کو یاد نہیں کرتے —— '' اپنے آس پاس اتنے لوگوں کو دیکھ کر مولوی صاحب نے وعظ شروع کردیا ——

''ارے چپ بیٹھو مولوی صاحب —— '' عورت کے پیچھے کھڑے ایک مزدور نے غصہ میں کہا۔

''پیٹ بھر کے کھانا کھا لیتے، وضو کرنے کو پانی مل جاتا ہے اچھے کپڑے پہن کر آپ نماز پڑھتے ہیں —— ہم کیا کرتے ہیں —— ؟ آکر دیکھو نا —— دن بھر پتھر پھوڑتے ہیں۔ اینٹوں کے ٹوکرے سر پر رکھ کر تین منزل والی بلڈنگ پر جاتے ہیں۔ رات کو اسی بلڈنگ کے نیچے پتھر کا تکیہ بنا کر سو جاتے ہیں ہم۔''

''چپ رہ بھائی —— اس وقت لڑائی جھگڑا رہنے دے کھڑے کھڑے پاؤں تھک گئے''۔ ایک صاحب نے بور ہو کر کہا۔

''ہم کیوں لڑائی کریں گے۔ مولوی صاحب؟''

''بلڈنگ بن گئی ہے تو بلڈر صاحب ہماری جھونپڑی توڑ رہے ہیں وہاں سے چلے جاؤ بول رئیں......''

ہم کہاں جائیں —— سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے بچوں کا ہاتھ تھامے ایک مزدور عورت پوچھ رہی تھی۔

اس کے پیچھے سر پر سامان کے ٹوکرے اٹھائے تین چار بچے کھڑے تھے۔

''تو پھر کیا بلڈنگ بنانے کے بعد اس بلڈنگ میں رہنے کا ارادہ تھا تمہارا —— '' مولوی صاحب نے ہنس کر پوچھا۔

''بلڈنگ بنانے کے لیے ہماری جھونپڑیاں توڑ دیے ہمارا سامان اٹھا کر پھینک دیے، کہیں بھی چلے جاؤ۔ بول رئیں اب دوسری بلڈنگ میں کام ملنے تک ہم کہاں رہنا صاحب —— ؟

بہت سے مزدور عورتیں بچوں کو گود میں اٹھائے سروں پر سامان رکھے پریشان ہو رہی ہیں۔ مردوں نے زیادہ وزنی سامان سروں پہ رکھ لیا تھا۔ سر پر لکڑیوں کا بنڈل اٹھائے ایک

بوڑھی مزدور عورت کو ڈھکیل کر آگے بڑھنے لگی۔

''بیٹے —— کورٹ جانے کا راستہ کدھر ہے ——''اس نے گٹار والے نوجوان سے پوچھا۔

''کورٹ —— ؟ کورٹ کیوں جا رہی ہو ماتا جی —— ؟''ایک اسکوٹر والے نے بوڑھی عورت کو ہنس کر دیکھا۔

''میں اب وہاں جاؤں گی۔ ہمارے گھر توڑ دیے سامان پھینک دیے کیا ہم سڑکوں پر رہیں گے اب میں وہاں جا کر پوچھوں گی جہاں انصاف ہوتا ہے'' —— بوڑھی عورت زور زور سے رونے لگی —— گٹار والے لڑکے نے اسے تھام لیا ——

''آپ کے لیے وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ماں جی جہاں انصاف ہوتا ہے۔ آگے راستہ بند ہے۔''

مرسیڈیز کار میں بیٹھنے والے صاحب مسلسل ہارن بجائے جا رہے تھے۔

وہ اپنے پاس بیٹھے دوست سے باتیں کر رہے تھے۔

''آپ کے اوپر تو کئی کروڑ کے Scam کا کیس چل رہا ہے —— ؟''

''ہاں۔ میں اسی پرابلم پر بات کرنے چیف جسٹس کے پاس جا رہا ہوں''انھوں نے لاپروائی سے کہا۔

''کیا وہ آپ کی بات سنیں گے —— ؟ان کے دوست نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں ہاں ——''دوست نے لاپروائی سے کہا۔

''میں ان سے پہلے بھی مل چکا ہوں انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ گورنمنٹ کے ڈپارٹمنٹ میں کروڑوں روپے کا Scam کیسے ہوتا ہے —— ؟ مجھے چیف جسٹس صاحب کے سوال پر ہنسی آ گئی۔ میں بولا ——

''بہت مشکل کام ہے سر آپ جیسے لوگ نہیں کر سکتے۔ اسی کرسی پر بیٹھو اور ہم سے لے کر موج مناؤ ان کو غصہ آ گیا —— آج مجھے بلائے ہیں۔''

''ارے —— اب کیا ہوگا —— ؟''ان کے دوست نے گھبرا کے کہا۔

''اب ان کے پی اے سے بات کر لیں گے۔ صاحب کے ساتھ کوئی بات ہو جائے گی۔''

انھوں نے لاپروائی سے کہا۔

"منسٹر صاحب کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ وہ کیا کر رہے ہیں انکل —— ؟ایک لڑکے نے گٹار والے سے پوچھا۔

"بہت کام کرنا پڑتے ہیں منسٹر کو —— "گٹار والے نے بچے کو سمجھایا۔

"میٹنگ میں جانے سے پہلے انھیں میک اپ روم میں جانا پڑتا ہے —— آج کس پارٹی کا کلر چہرے پر لگانا ہے۔ پھر سوچنا پڑتا ہے۔ کون سی پارٹی والا ڈریس بدلنا ہے؟ اور پھرٹی وی پر جو کہنا ہے ویسا ہی میک اپ کرنا پڑتا ہے۔"

ہٹو ہٹو —— بھاگو بھاگو —— راستہ کیوں بند کر دیے۔ چیختے چلاتے روتے ہوئے مردوں عورتوں کا ہجوم آگے بڑھنے لگا۔

اچھا؟ غریبی ختم کرنے کے لیے منسٹر جن غریبوں کو ختم کرنے کا پلان بنا لیتے ہیں شاید آج وہی اعلان ہونے والا ہے۔"

"مسجد میں بم پھینک دیے تو ہماری بستی میں پولیس والے آکر لوگوں کو مار رہے ہیں۔" کتنے لوگ مر گئے صاحب" وہ سب رو رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔"

"پولیس کو یہ کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ میڈیا میں ٹی وی پر سرکار کے کام کا تماشہ کسے دکھائیں گے اور پھر —— "

مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بہت سے روتے چلاتے آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ سب کو ہٹا کر آگے بڑھنے لگے اور پولیس والوں کی لاٹھی کی مار سے رونے لگے۔

"دیکھو —— وہ ہمیں مارنے آرہے ہیں —— ؟

"وہ تمھیں کیوں مار رہے ہیں —— ؟ کیا تم مسلمان ہو —— ؟

"نہیں —— اب ہم آگے والے مندر میں چھپ جائیں گے۔"

"اس لیے تو بچ گئے آج" —— ایک شیروانی والے مولانا نے کہا۔

"اچھا؟ کیا مندر کے اندر چلے جاؤ گے۔" گٹار والے نے ہنس کر کہا۔

"پہلے پجاری کو بتانا پڑے گا کہ تم برہمن ہو —— شودر ہو —— تمھارے ہاتھ میں کتنے بم ہیں —— ؟ اب بھگوان کے سامنے جانے سے پہلے سیکوریٹی گارڈ تلاشی لیتا ہے پجاری۔"

''او چھوکرے —— اپنی زبان بند کر۔ بہت دیر سے تیری بکواس سن رہا ہوں'' ایک صاحب نے غصہ سے کہا ''لوگ پریشان ہیں تو ٹی وی کا کامیڈی پروگرام کر رہا ہے —— ؟
چیف منسٹر آنے والے ہیں۔ آپ لوگ شانت رہیے۔ ہم ان کا راستہ روک دیں گے۔
ان سے پوچھیں گے کہ وہ ہمارے لیے کیا کرنے والے ہیں —— ؟ ان صاحب نے پریشان لوگوں کو سمجھایا۔
مجھے معلوم ہے کہ چیف منسٹر کیا کہیں گے —— ؟ گٹار والے لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر سب کے سامنے آ کر —— مسخرے کی طرح گردن اونچی کر کے زور زور سے کہا ——
'' آپ سب کی بپتا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا —— اب میں اعلان کرتا ہوں کہ:
جو ہندو ہیں انھیں آگ میں جھونک دو۔
جو مسلمان ہیں انھیں خاک میں ملا دو —— جئے ہند —— ''

○○

دیوی

ممتاز مفتی

اونہوں! رانگ نمبر! بہت آزما دیکھے۔ بے کار، سب ایک ہی بولی بولتے ہیں۔ آئی لَو یُو ڈارلنگ —— ہُنہ۔ نہ دیکھا، نہ جانا، اور آئی لَو یُو ڈارلنگ، بھلا کوئی بات ہوئی —— سب کو محبت کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ میں تو اکتا گئی۔ بور۔

آج صبح ایک رانگ نمبر کہہ رہا تھا ''فالنگ اِن لَو وِد یُو۔ وہاٹ ام آئی ٹو ڈو؟ آئی کانٹ ہلپ اِٹ'' بے چارا ہلپ لیس۔ سبھی ہلپ لیس ہو جاتے ہیں، لڑکی کی آواز سن کر۔ اور پھر ملنے کا تقاضا —— ہلو، ہلو، ہلو، پلیز۔ ڈارلنگ یُو مسٹ۔

پرسوں ایک اولڈش بول رہا تھا۔ میں نے سوچا ہٹ کر بات کرے گا۔ اونہوں!۔ وہی ایک رٹ، جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو۔

سوچتی ہوں یہ لَو کیا چیز ہے۔ ہر جگہ اسی کا ذکر ہے۔ قصوں میں، کہانیوں میں، شعروں میں، گیتوں میں۔ اور یہ رانگ نمبر کا لَو جو ہے وہ تو خالی گُڈ ٹائم ہے۔ ہلا گُلا۔ ممی تو مجھے گڑیا سمجھتی ہے۔ کہتی ہے: ڈالی، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ کیوں نہیں سمجھتی بھلا؟ سب سمجھتی ہوں۔ چودھویں سال میں ہوں اور پھر جس ماحول میں رہتی ہوں اس کا تو کام ہی یہی ہے —— سمجھانا۔ معلومات بہم پہنچانا۔ اشاروں کنایوں سے نہیں، کھل کر بات کرنا۔ بھرے منہ سے کہہ دینا۔ لاگ لپٹ نہیں۔ ہیرا پھیری نہیں۔ رکھ رکھاؤ نہیں۔ سپاٹ بات کہہ دینا۔ یوں جیسے غصے میں گالی بک دو —— اشتہار میں، اخبار میں، فلمی گیت میں، چیپ ناول میں،

ڈائجسٹ میں، ایک طوفان آیا ہوا ہے ماس میڈیا کا۔ سمجھانے کا۔ انفارمیشن بہم پہنچانے کا۔

ابھی پرسوں کی بات ہے، خالو کہہ رہے تھے کہ آج کا چھ سال کا بچہ جتنا کچھ جانتا ہے، پُرانے زمانے میں اتنا کچھ پچیس سال کا جوان بھی نہیں جانتا تھا۔

پھر بھی ممی مجھے ڈالی سمجھتی ہے۔ ڈالی کہہ کر بلاتی ہے۔ مجھے کبھی اتنا کہہ کر نہیں بلایا۔ وہ سمجھتی ہے، میں کچھ نہیں سمجھتی۔ سمجھتی تو میں سب کچھ ہوں۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لَو کیا چیز ہے۔

ویسے لَو سے تو ہمارا اپنا گھر بھرا ہوا ہے۔ یوں پچ پچ کرتا ہے جیسے گلا ہوا آم ہو۔

ممی اور ڈیڈی اگرچہ اکٹھے رہتے ہیں مگر اکٹھے نہیں رہتے۔ بڑے امیسی پنڈ ہیں وہ۔ آپس میں انڈرسٹینڈنگ پیدا کر رکھی ہے: ڈارلنگ، تم اپنے رستے پر چلو، میں اپنے رستے پر۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر چل رہے ہیں۔ کبھی کبھار ملاپ ہو جاتا ہے۔ شاید ہو جاتا ہو۔ ہم تو صرف ہیلو ہیلو سنتے ہیں۔

ممی کی مشکل یہ ہے کہ اسے علم نہیں کہ وہ پینتالیس سال کی ہو چکی ہے۔ پتا نہیں خود کو بیس کی سمجھتی ہے یا بائیس کی۔ ویسے تو اکثر آئینہ دیکھتی رہتی ہے، پر آئینے میں کبھی خود کو نہیں دیکھا۔ آئینے میں کوئی بھی خود کو نہیں دیکھتا، ورنہ بہت سی مشکلات حل ہو جائیں۔ آئینے میں ہر کوئی وہ دیکھتا ہے جو دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں جو سامنے ہوتا ہے۔

بس ممی خود کو بنانے سنوارنے میں لگی رہتی ہے۔ میک اپ ہو رہا ہے۔ بال کٹوائے جا رہے ہیں۔ گھنگھر بنائے جا رہے ہیں۔ سلمنگ کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ شام کو یوگا، صبح کو ورزشی سائیکل، اور پھر دن بھر ڈائٹنگ۔ پیٹ بھر کر نہ کھاؤ۔ گھنٹے گھنٹے بعد کوئی سنیک، کوئی فروٹ، کوئی سلائس۔ میٹھا؟ اونہوں! گھی! بالکل نہیں۔ اناج؟ کم کم۔ بیچاری ممی —— بھوکی مر رہی ہے۔ پھر بھی پنڈا تھل تھل کرتا ہے —— ہئے! وِد ان کو نیچن رہنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

پھر بھی ممی کامیاب ہے۔ ایک نا ایک فرینڈ ساتھ لیے پھرتی ہے۔ پہلے ڈیوڈ تھا، پھر افضل تھا، اب توقیر ہے۔ ڈیڈی تو اس معاملے میں پاسٹ ماسٹر ہیں۔ ہر وقت ارد گرد کالج والیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ڈیڈی بنتے سنورتے نہیں۔ اپنی ایج کیا فلاج نہیں کرتے۔ بناوٹ، سجاوٹ، ڈریس، ڈیپورٹمنٹ سے بے نیاز ہیں۔ ڈیڈی کو ان باتوں کی کیا پروا۔ انھیں باتیں جو کرنی آتی ہیں۔ مائی گاڈ! کیا باتیں کرتے ہیں۔ سننے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیسی کیسی بات ذہن سے نکالتے ہیں کہ مداری کا چھو منتر شرما کر رہ جائے۔

ڈیڈی بہت پڑھے لکھے ہیں، لیکن کیا مجال کہ بات میں سے کتاب کی بُو آئے یا فلسفے کا پتھر نکلے۔ بالکل نہیں۔ ہلکی پھلکی شگفتہ باتیں۔ سادہ۔ بنی بجی نہیں۔ لفظ نہیں۔ باتیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ اور پھر بات ایسی جیسے پھلجھڑی چل گئی ہو۔ پھر یہ بھی کہ چھوٹے چھوٹے عام سے لفظوں میں بڑی بات کہہ دیتے ہیں۔ اتنی بڑی کہ غوطے لگاتے رہو۔ ویسے نہ لگاؤ تو بے شک خالی اوپر ہی اوپر تیرتے رہو۔

میں جانوں بات میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ خدو خال کی بناوٹ سجاوٹ سے کہیں زیادہ۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڈی کے گرد جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ یونیورسٹی میں بھی، گھر پر بھی۔ نوجوان کھنچے چلے آتے ہیں۔ لڑکے کم کم، لڑکیاں زیادہ۔ لڑکوں میں ذہنی لگاؤ پیدا ہوتا ہے، لڑکیوں میں جذباتی۔ ڈیڈی راجا اندر بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ممی کہتی ہیں: ان کے افیئر ز چلتے ہیں۔ پتا نہیں۔ شاید چلتے ہوں۔ لیکن جسے اتنی واہ واہ ملے، سننے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں، وہ پھر افیئر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بہر حال، یہ تو ہے کہ لڑکیاں ڈیڈی پر مرتی ہیں۔ محبت کے بھبھاکے ضرور اٹھتے ہیں۔ منظر بھیگا بھیگا ہوتا ہے۔ اوس چاہے پڑے نہ پڑے۔ اور پڑ بھی جائے تو کیا مضائقہ۔ ڈیڈی بھی تو بڑے امینسی پیٹڈ ہیں۔

یہ امینسی پیٹڈ محبت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یوں دکھتی ہے جیسے گائے بھینسوں جیسی ہو۔ یہ محبت تو کی جاتی ہے، ہوتی نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے محبت ہو جائے۔ کروں نہیں، ہو جائے۔ ایسی ہو جائے کہ جی چاہے اس بندھن سے چھوٹ جاؤں۔ لیکن چھٹنا محال ہو جائے۔ جان عذاب میں پڑ جائے۔ پتا نہیں میرا جی ایسا کیوں چاہتا ہے؟

میرے گھر والے، ممی، ڈیڈی، میرا سارا ماحول، سکول، سہیلیاں، کزن، مجھے ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ محبت کر۔ کرنے والی محبت کر، اور جی۔

ساری مغربی تہذیب عورتوں کو اسی بات پر مائل کرتی رہتی ہے کہ اٹھ، محبت کر، اور جی۔ یہی زندگی ہے۔ یہی خوشی ہے۔ یہی سب کچھ ہے۔ اہلِ مغرب بھی اسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ کرنے والی محبت میں لت پت ہو رہے ہیں۔ محبوبوں کے کیو لگے ہوئے ہیں۔ کسی کا دسواں محبوب ہے، کسی کا پندھرواں۔ محبوب یوں بدلتے ہیں جیسے جرابیں ہوں۔ پُرانی ہو گئیں تو پھینک کر نئی لے آئے۔ کہتے ہیں، یہ آزادی ہے۔ آزادی تو ہے، پر محبت نہیں۔ محبت تو خود ایک بندھن ہے۔ ایسا بندھن جس سے آزاد ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ اور جی چاہے بھی تو آزاد ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

دیکھ لو کرنے والی محبت اور آزادی نے مغرب کو کیا کر دیا ہے۔ نہ محبت کی توقیر رہی ہے، نہ عورت کی، نہ رشتوں کی۔ بندھن ٹوٹ گئے ہیں۔ زندگی سے دل اُچاٹ ہو گئے ہیں۔ آوارہ گھومو۔ نشہ کرو۔ خوش وقتی۔ تفریح۔

تفریح تو وقتی چیز ہے۔ جو لوگ تفریح کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ خود وقتی بن جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ تفریح میں ادل بدل کے بغیر بات نہیں بنتی۔ تفریح کی سڑک پر چہل قدمی کرو تو پھر بور ہو کر سڑک چھوڑ کر، پگ ڈنڈیوں پر چڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کرنے والی محبت ایسی ہی اک تفریح ہے۔

ہئے! ہو جانے والی محبت کی کیا بات ہے۔ ادھر نکڑ پر جو پھلوں کی ریڑی لگاتا ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا، حمیدا۔ ہو گا تیس پینتیس کا۔ جب گیارہ بجتے ہیں تو وہ اپنی ریڑھی چھوڑ کر ہمارے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ چاہے کڑکتی دھوپ ہو یا بارش ہو رہی ہو۔ دروازے پر کھڑا رہتا ہے۔ کھڑا رہتا ہے۔ اس وقت اسے نہ گاہک کی پروا ہوتی ہے، نہ بکری کی۔ ہمارے گیٹ کے مقابل جو گلی ہے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر وہ خاتون گلی سے باہر نکلتی ہے۔ بس بُت بنا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ اسے بُلاتا نہیں۔ کھنگورا نہیں مارتا، کہ ادھر دیکھ، میں تیری راہوں میں کھڑا ہوں۔ نہ نہ۔ بالکل نہیں۔ اس کا پیچھا نہیں کرتا۔ بس چپ چاپ اداس نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔

وہ اللہ کی بندی بھی چپ چاپ سمٹی سمٹائی گزر جاتی ہے۔ نگاہ اوپر نہیں اٹھاتی۔ اس کی چال میں ٹھمک تک پیدا نہیں ہوتی۔ شاید اسے احساس ہی نہیں کہ کوئی روز بلا ناغہ اسے دیکھنے کے لیے راہ میں کھڑا رہتا ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے اور عورت کو پتا ہی نہ چلے۔ ضرور اسے پتا ہو گا۔ پھر بھی وہ لپٹی لپٹائی یوں گزر جاتی ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ہوتا ہو گا۔ ضرور ہوتا ہو گا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہو گا۔ یہ جاموں میں، بھری ہوتی ہے پر چھلکتی نہیں۔ وہ تو کرنے والی محبت ہوتی ہے جو چھلکتی ہے۔ بھری نہیں خالی چھلکتی ہے۔ صرف چھلکن ہی چھلکن۔ پھر وہ غلام علی کی بات۔

ہئے! کیا بات تھی غلام علی کی بات کی سُن کر میں دو دن سُن رہی تھی۔

غلام علی کی بات چچا شیر محمد نے سنائی تھی۔ جب ورلڈ وار ختم ہوئی تھی تب کی بات ہے۔ ان دنوں ہندوستانی رجمنٹ کا ایک یونٹ فرانس کے ایک گاؤں کے قریب مقیم تھا۔ اس یونٹ میں سارے جوان جہلمی تھے۔ ان میں غلام علی بھی تھا۔ اونچا لمبا شیں جوان۔

غلام علی کو گاؤں کی ایک فرانسیسی دوشیزہ سے محبت ہو گئی۔ پھر غلام علی کا معمول ہو گیا کہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کے وقت اس لڑکی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ کھڑا رہتا، کھڑا رہتا۔ چاہے بونداباندی ہو رہی ہوتی یا موسلا دھار بارش پڑ رہی ہوتی۔ وہ وہاں کھڑا رہتا۔ طوفان آتے، برف باری ہوتی، لیکن غلام علی وہاں کھڑا رہتا۔

غلام علی تب تک وہاں کھڑا رہتا جب تک اتفاق سے دوشیزہ کھڑکی میں نہ آ کھڑی ہوتی۔ اسے دیکھ کر غلام علی اٹینشن ہو کر اسے سلوٹ مارتا۔ جب تک وہ سامنے کھڑی رہتی، سلوٹ کیے کھڑا رہتا۔ چلی جاتی تو وہ اپنے یونٹ کی طرف چل پڑتا۔

گاؤں والے غلام علی کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران ہوتے کہ یہ جوان یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے۔ گاؤں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ پھر جب انھیں پتا چلا کہ اسے فرانس کی بیٹی ماریانہ سے محبت ہے تو وہ اور بھی حیران ہوئے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ مکان کے سامنے کھڑے رہے کہ محبوبہ سامنے آئے تو اسے سلوٹ ماریں! جو محبت ہے تو محبوبہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اندر جاؤ۔ اس کا ہاتھ چومو۔ پاس بیٹھو۔ فرانس والوں کو بھلا کیا پتا تھا کہ ہو جانے والی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بس کرنے والی محبت کو جانتے تھے۔

جب ماریانہ کے باپ کو پتا چلا تو وہ غصہ کھا گیا۔ بولا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اسے اندر بلاؤ۔ اس کی خاطر تواضع کرو۔ پاس بٹھاؤ۔ اس کی دل جوئی کرو۔"

اس پر ماریانہ کا بھائی دوڑا دوڑا غلام علی کے پاس گیا۔ بولا "آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آئیے۔ ماریانہ کے پاس بیٹھیے۔"

اس پر غلام علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولا "میں اندر جاؤں؟ ماریانہ کے پاس بیٹھوں؟ —— میں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" یہ جان کر گاؤں والے بے حد حیران ہوئے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔

ماریانہ تو یہ سن کر حیرت سے تصویر بن کر رہ گئی۔ مائی گاڈ! یہ کیسی محبت ہے، جس کا مقصد مجھے دیوی بنا کر پوجا کرنا ہے، اور بس، اس کے اندر ایک طوفان اٹھا۔ ایسا طوفان جو پہلے کبھی نہ اٹھا تھا۔ چھم چھم آنسو بہنے لگے۔ وہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ اس کے دل میں ایک ان جانا مان بیدار ہوا، جو اس کے انگ انگ میں رچ گیا۔ اور اس مان نے اسے گاڈیس بنا دیا۔

پھر جب غلام علی کے یونٹ نے وہاں سے کوچ کیا تو غلام علی سب سے پیچھے تھا۔

اس کا منہ گاؤں کی طرف تھا، اور وہ الٹے پاؤں چل رہا تھا، جیسے کسی درگاہ سے باہر نکلتے ہیں۔ اور اس کا ہاتھ مسلسل سلوٹ میں تھا۔ ابھر ماریانہ سڑک پر نکل آئی تھی اور مسلسل ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سارے گاؤں والے آنسو بہا رہے تھے۔ گاؤں کی گوریاں ہچکیاں لے رہی تھیں کہ کاش! ہماری زندگی میں بھی کوئی غلام علی آتا۔

ہئے! میں بھی سوچتی ہوں کہ میری زندگی میں بھی —— ہائیں! یہ کیسی آواز ہے —— ذرا ٹھہرو —— ہاں، وہی ہے، وہی —— اس کے سائیکل کی آواز سنکر پتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ میں چونک جاتی ہوں۔ ویسے سامنے کی سڑک پر بیسیوں سائیکل گزرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پتا نہیں اس کے سائیکل کی آواز میں کیا بات ہے کہ میں چونک جاتی ہوں۔ ہمارے مالی کا بیٹا ہے۔ پڑھ رہا ہے۔ ویسے کبھی کبھی اس کا ابا اسے ہمارے گھر میں کام کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عام سے خدوخال ہیں، جیسے ہوتے ہیں لڑکوں کے۔ ہاں، ہونٹ —— ہونٹوں نے ایسی چسکی سی بھر رکھی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سنا ہو۔ اس کے ہاتھ ذرا بھی آرٹسٹک نہیں۔ موٹے بھدے۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ جب وہ کٹائی کا کام کر رہا ہوتا ہے تو میں چوری چوری اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

بہانے بہانے میں اسے اپنے کمرے میں بلا لیا کرتی ہوں۔ اسی لیے تو میں نے اپنے کمرے میں تین گملے سجا رکھے ہیں۔ ایک پام کا، ایک کیکٹس کا اور ایک مشروم کا، جب وہ اندر آتا ہے تو سارا کمرہ اس کی خوشبو سے بھر جاتا ہے۔

جب میں اس سے بات کرتی ہوں تو وہ نظریں جھکائے رکھتا ہے۔ جب میں کسی اور طرف دیکھتی ہوں تو وہ مجھے دیکھتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر، جھوٹ موٹ، دوسری طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

مائی گاڈ! جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے غلام علی سلوٹ مارے کھڑا ہو۔

اس وقت میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ کچھ کچھ طوفان بن کر میرے انگ انگ میں رچ جاتا ہے۔ ایک مان انگڑائی لیتا ہے۔ ایک تفاخر —— ایک پھلجھڑی سی چل جاتی ہے۔ اور، اور مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی نگاہوں نے مجھے دیوی بنا دیا ہو۔

○○

پیتل کا گھنٹہ

قاضی عبدالستار

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور دھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اتر پڑا۔ کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو سامنے دو درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے دیہاتی نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکالی۔ میں اس کی بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا۔

''یہ کون گاؤں ہے؟'' میں نے میناروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یو...... یو بھسول ہے۔''

بھسول کے نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آ گئی۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ کلاسیکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور پورے پائنچے کا پاجامہ اور فرکی ٹوپی پہنے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمت گاروں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بدھیاں لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے گل کھا کر اپنی بنارسی

پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے تلخی سے کہا۔ ''کیا یہ کافی نہیں تھی؟'' وہ میری بات پی گئے، بدھیاں برابر کیں، پھر میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا——— ''اب تشریف لے جائیے۔'' میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں۔

بھسول کے قاضی انعام حسین، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخ نگاہوں پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آ کر کئی بار موقع ڈھونڈ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے۔ لیکن اب تو داماد ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا بگڑی ''بس'' کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا چتے ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا سلسلہ تھا۔ جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں گے، ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اونچے آم کے درخت ٹریفک کے سپاہی کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے۔ جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ وہاں اس وقت نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد، کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈورئیے کی قمیص، میلا پائجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے، ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے ایک دم کھل گئے۔ میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکردار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے، جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر رو کے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی سے چلائے۔ ''ارے سنتی ہو ——— دیکھو تو کون آیا ہے۔ میں نے کہا اگر

صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کرلو جلدی سے۔" لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ دھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس۔ دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ کھڑی تھیں۔ پھر انھوں نے لپک کر الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹے کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کُرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا ہوا پیوند چھپ جائے۔

اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سُکھ اور دُکھ کی گنگا جمنی آواز میں دعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری بات سن رہی تھیں لیکن ہاتھوں سے، جن کی جھریوں بھری کھال جھول گئی تھی، دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو صاف کر رہی تھیں، جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلھیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں، اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ مجھے پلنگ پر بیٹھا کر دوسرے جھولا جیسی پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اٹھا لائیں، جس کے چاروں طرف کالے کپڑوں کی گوٹ لگی تھی اور کھڑی ہوئی مجھ کو اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے پنکھا چھین نہ لیا۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا چولہا بنا تھا۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں، کچھ پیسے، کچھ ڈبے، کچھ شیشے، بوتل اور دو چار اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ دادا نے کونے میں رکھے ہوئے پرانے حقے سے بے رنگ چلم اُتاری اور باورچی خانے میں گھس گئے۔ میں ان دونوں کی گھن گھن کرتی سرگوشیاں سنتا رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے۔ میں نے اپنی شیروانی اتاری۔ ادھر ادھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی۔ نقشین کواڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ ایک جگہ لوہے کی پتی لگی تھی لیکن بیچوں بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام، کتھے اور تیل کے دھبوں میں جگمگا رہا تھا۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں دوڑوں دادا گھڑونچی سے گھڑا اٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے، جس میں ایک بھی کواڑ نہ تھا۔ صرف گھیرے لگے کھڑے تھے۔ جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجرم کی طرح بولے —— "تم بیٹے، اطمینان سے نہاؤ۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ پردے تو میں ڈال دوں گا لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی اور تم کو دق کرے گی۔"

میں گھڑے کو ایک کونے میں اٹھا لے گیا۔ وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے

برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنٹے میں موگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سُوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اس سُوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا۔ اس کے اوپر سات پہلو کا ستارہ تھا۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ عربی رسم الخط میں ''قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ'' کھدا ہوا تھا۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلانِ ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لیے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔
جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے۔ قاضی انعام حسین، جن کی گدی نشینی ہوئی تھی، جن کے لیے بندوق کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا، جنھیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی —— دونوں ہاتھوں پر خدمت گاروں کی طرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں 'لب سوز' لب بند، چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو اُبلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں ہم لوگ بیٹھے نمک پڑی ہوئی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بُوڑھی آواز نے ہانک لگائی:

''مالک!''

''کون؟''

''مہتر ہے آپ کا —— صاحب جی کا بُلاوا آئے ہے۔''

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اپنے بھلے دنوں میں تو اس طرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے ہوں گے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا، ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی۔ دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولہے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔ میں ڈیوڑھی سے ڈبیا اٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات کی باتیں بتاتے رہے اور اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے۔ کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔ بہت سی

ان مِل بے جوڑ اصلی چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چنا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا۔

اگلے دن صبح میں دیر سے اُٹھا —— یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے —— جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا، دادی خاموش کھڑی رہیں۔ جب میں شیروانی پہن چکا اور دروازے پر یکہ آ گیا، تب دادی نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا، ان کے چہرے پو چونا پُتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انھوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں، اور دس کرائے کے۔''

''ارے —— ارے دادی —— آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیا۔

''چپ رہو تم...... تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں، جو جس کا حق ہوتا ہے وہ تو دے دیتے ہیں...... غضب خدا کا، تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں...... میں...... بھیا، تیری دادی تو فقیرن ہو گئی...... بھکارن ہو گئی۔''

معلوم نہیں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ دادا میری طرف پشت کیے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقہ پی رہے تھے۔ مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئیں لیکن منھ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک یکے کے ساتھ چلتے رہے۔ لیکن نہ مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ ایک بار نگاہ اٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی، جہاں سے سیتا پور کے لیے مجھے بس ملتی، ابھی دور تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکے کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکے والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا...... ''میاں، ای شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں، ان کے یکے کا بم ٹوٹ گیا ہے، آپ بُرا نہ مانو تو ای شاہ بیٹھ جائیں؟''

میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔ ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے شاہ جی آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے۔ اور یکے والے نے میرے اور ان کے سامنے 'پیتل کا گھنٹہ' دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے میں مُونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔ دو انگل کے حاشیے پر سوراخ میں سُوت کی رسی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ، کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور یکے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکے والے سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا:

''کا شاہ جی، گھنٹہ بھی خرید لا یو؟''

''ہاں، کل شام معلوم نائی کا وکت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دیہن بلائے کے۔ ای.........''

''ہاں، وقت وقت کی بات ہے.........ساہ جی، ناہیں تو ای گھنٹہ.........''

''اے گھوڑے کی دُم، راستہ دیکھ کے چل''......یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔

میں.........میاں کا بُرا وقت، چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا.........مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں، میری پیٹھ پر پڑا۔

OO

شہرزاد

رضیہ فصیح احمد

ہوٹل کے باہر لان میں ہم بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سرو کے گرد لپٹی ہوئی رنگین بتیوں کی مالائیں جل رہی تھیں۔ حوض میں لگے ہوئے شیشے کے پار سرخ مچھلیاں تیر رہی تھیں اور اس کے اوپر دیوار میں لگے ہوئے رنگین قمقموں نے ابھی ابھی شروع ہونے والی رات کو عجیب سکون دہ روشنی بخشی تھی۔ اس خوب صورت اور پُرسکون ماحول میں ٹیپ ریکارڈ پر ریمکی کورسوکو، کا مشہور نغمہ شہرزاد بج رہا تھا۔ الف لیلیٰ سے متاثر ہو کر لکھا جانے والا یہ نغمہ یوں نیچے، دھیمے سروں میں آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے کہ بمشکل سنائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک آہنگ میں دوسرے سازوا کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لحہ بہ لحہ سُر اور لَے کی آواز تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اس نغمے کو خاموشی سے سنیے تو واقعی الف لیلیٰ کی روح اس میں سموئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بغداد کی پُراسرار راتوں میں بھیس بدلے ہوئے بادشاہوں اور سیاہ فام وحشیوں کے قدموں کی چاپ، خوب صورت ملکہ اور نیم وا آنکھوں والی حسین کنیزوں کی دل فریب ہنسی سیاہ راتوں میں دریائے دجلہ کی روانی اور ہر رات ایک نئے مہمان کے انتظار میں کھڑے رہنے والے ابوالحسن کے دل کی دھڑکن، اشرفی کی تھیلیوں کی جھنکار، ان اطلسی پردوں کی سرسراہٹ جن سے بغداد کے محل مزین تھے اور اس رباب کا ارتعاش جس کی صدا سے خلیفہ ہارون الرشید نیند سے بیدار ہوتے تھے۔ یہ لمبا نغمہ جس کے چار حصے ہیں، الف لیلیٰ کی ان ہزار راتوں کی یاد دلاتا ہے جو ہر رات ایک نئی کہانی کی کڑی میں ایک دوسری سے پیوستہ ہوتی چلی جاتی ہیں جیسے مختلف سازوں کی آوازیں

گھل مل کر دور تک ایک ہوتی چلی گئی ہوں۔

جب یہ نغمہ ختم ہوا اور اس کا سحر ٹوٹا تو میں نے بیگم سیف سے پوچھا، "آپ نے الف لیلیٰ کی کہانیاں تو ضرور پڑھی ہوں گی؟" "نہیں، میں نے نہیں پڑھیں۔" انھوں نے لا پروائی سے کہا اور مجھے ان کے اس جواب سے بے حد مایوسی ہوئی۔ عراق کی رہنے والی، بغداد میں پرورش پانے والی ان خاتون نے الف لیلیٰ تک نہیں پڑھی جب کہ ہمارے ذہن میں بغداد کا ہر تصور الف لیلیٰ کی سحر انگیز کہانیوں ہی سے وابستہ ہے۔ آج ہی کرنل سیف اور بیگم سے ہمارا تعارف ہوا تھا۔ کرنل ایک ملٹری کورس کرنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ تعارف کے بعد کرنل نے ہم سے انگریزی میں بات کی مگر بیگم خاموش رہیں کیوں کہ انھیں انگریزی کے صرف چند الفاظ آتے تھے اور وہ اپنی انگریزی سے شرمسار تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ہم لوگوں سے اتنا گھل مل گئیں کہ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتیں۔ انگریزی کے انھیں الفاظ سے وہ دنیا بھر کے مطلب ادا کر لیتیں، حالاں کہ وہ جملہ بنانے کی الف، بے سے بھی واقف نہیں تھیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ آپس کی گفتگو کے لیے گرامر جاننے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر روز وہ ہمیں اپنے ملک کے نئے نئے قصے سنایا کرتیں۔ اس لیے میں نے ان کا نام شہرزاد رکھ دیا تھا۔ یہ نام انھیں بھی پسند تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں ہم انھیں عربی کے وہ الفاظ بتانے لگے جو ہم اردو میں بھی بولتے ہیں۔ وہ ہمارے تلفظ پر ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ زبان کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ آپ چاہے یوں اپنے شین قاف پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں جب دوسری زبان کے الفاظ کا مسئلہ آتا ہے تو آپ کا تلفظ ہمیشہ مضحکہ خیز ہی ہوتا ہے۔ ایک پُر لطف بات یہ بھی تھی کہ ہم دونوں دو زبانیں بولتے تھے جس کا رسم الخط ایک تھا مگر ایک دوسرے کی بات چیت بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ میرے افسانے بغیر سمجھے پڑھ لیتی تھیں اور میں ان کے وہ عربی رسالے جس میں خوب صورت مصری ایکٹرسوں کی تصویریں ہوتی تھیں۔ سوائے دو چار الفاظ کے میرے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔

"بغداد ویری رچ، ویری بیوٹی فل" ان کا تکیہ کلام تھا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ بغداد میں ان کا ذاتی مکان بہت خوب صورت ہے۔ اس کے ہر کمرے میں الگ الگ رنگ ہے۔ ہر کمرے کی تین دیواروں کا رنگ ایک سا اور چوتھی دیوار کا رنگ جدا ہے کہ یہی تازہ ترین فیشن ہے۔ ان کے پاس دو ٹیلی وژن اور دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ ایک بڑی سی نئی کار ہے۔ وہ خود اسکول

میں پڑھاتی ہیں۔ ان کے گھر میں ایک آیا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایک پاکستانی خانساماں ہے جو بہت اچھا کھانا پکاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں پاکستانی خانساماؤں اور درزیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

کرنل سیف کو اس چیز کا بہت زیادہ احساس تھا کہ دوسرے ملک کی کسی چیز کی برائی نہ کریں مگر شہرزاد کو جو بات پسند نہ آتی، جھٹ سے کہہ گزرتیں۔ اس سے ہم میں دوستی اور بے تکلفی کا ایک خاص رشتہ قائم ہوا جو رسمی طور پر ایک دوسرے کے ملک کی تعریفوں سے بلند تھا۔ شہرزاد کو کوئٹہ کی خاموش زندگی ذرا پسند نہیں تھی۔ وہ اپنے بغداد کی چہل پہل کو یاد کر کے اداس ہو جاتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ان کا دل کوئٹہ تو کوئٹہ کراچی میں بھی نہیں لگا۔ وہ جب بور ہوتیں تو کہتیں، "اب اگر سیف جنت میں بھی کورس کرنے گئے تو میں ساتھ نہیں جاؤں گی۔" دوسری شکایت پاکستان سے انھیں یہ تھی کہ یہاں باہر کی چیزیں نہیں ملتیں۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی کپڑے جن سے ان کی بغداد کی دوکانیں بھری ہوئی تھیں، وہ لپ اسٹک اور نیل پالش جن کے فیشن جیسے ہی پیرس سے نکل کر بغداد پہنچتے وہ چیزیں بھی وہاں پہنچ جاتیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہاں باہر کی چیزیں اس وجہ سے نہیں آتیں کہ ہم پاکستانی مصنوعات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی چیزیں باہر کی چیزوں کا مقابلہ کرنے لگیں گی۔ پاکستان صنعتی لحاظ سے کہیں کا کہیں جا پہنچے گا اور عراق جہاں ہے وہیں رہے گا۔" اس بات کو انھوں نے بہت غور اور دلچسپی سے سنا۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ غیر ملکی چیزیں استعمال نہ کرنے یا نہ منگوانے کی اتنی معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے انھیں کبھی اس بات کی شکایت کرتے نہیں پایا بلکہ میں نے دیکھا کہ پاکستانی مصنوعات میں ان کی دلچسپی روز بروز بڑھنے لگی۔ انھوں نے گھر کی آرائش کے لیے بہت سی چیزیں یہاں سے خریدیں۔ انھی دنوں اتفاق سے کوئٹہ میں صنعتی نمائش ہو گئی۔ اس میں وہ چیزوں کی خرید میں اس قدر محو ہو جاتیں کہ ہم سب کو چھوڑ کر ایک سے دوسری دوکان پر لپک جاتیں اور ہمیں بھیڑ میں وقت سے انھیں تلاش کرنا پڑتا۔ جب بھی وہ ہمیں ملیں کسی نہ کسی دُکان پر چاندی کے زیورات یا کانچ کی چوڑیاں خریدتی ملیں، ان کے ہنس مکھ میاں ان کی اس حرکت پر مسکرا کر صرف اتنا کہتے، "ہر جگہ کی عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔"

انھیں دنوں شہرزاد پر انکشاف ہوا کہ یہاں چیزیں بغداد کے مقابلے میں بہت سستی

ہیں۔ گرم کپڑوں کی سلائی پر تو وہ منھ پھاڑ کر رہ گئیں اور میاں کے احتجاج کے باوجود اپنے اور بچوں کے گرم کپڑے سلوانے شروع کر دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ جتنے پیسوں میں یہاں کپڑے اور سلائی دونوں کا خرچ نکل آئے گا وہاں صرف سلائی بھی اس سے زیادہ ہوگی۔ اب انھیں دوکان داروں سے نمٹنا بھی خوب آگیا تھا۔ چیز کے دام اس قدر کم بتاتیں کہ دکان دار کے ساتھ ہم بھی ان کا منھ دیکھنے لگتے۔ شیشے کے کام کے خوب صورت کشن، پچاس روپے جوڑے کو انھوں نے بیس روپے سے شروع کیا۔ میں نے کہیں دوکان دار سے کہہ دیا کہ یہ تو تمھارے سامان کی پبلسٹی ہو رہی ہے، یہ چیزیں عراق جائیں گی۔ اس بے چارے نے یہ جوڑا انھیں آدھی قیمت پر دے دیا۔ اب تو وہ میری بے دام غلام ہو گئیں۔ ہر ایک سے کہتیں کہ جانے انھوں نے اردو میں کیا منتر پھونکا کہ یہ کشن مجھے سستے مل گئے۔ اب وہ اس کوشش میں رہتیں کہ ہمیشہ شاپنگ میں مجھے اپنے ساتھ رکھیں، میں وہ منتر پڑھتی جاؤں اور انھیں چیزیں سستی ملتی جائیں۔

ان کے دو بے انتہا شریر بچے تھے، سعد اور سنان۔ دو فتنے کہہ لیجیے۔ سعد ڈیڑھ پسلی کا کمزور سا بچہ تھا، کل تین سال کا، مگر کس قدر شریر، کس قدر مضبوط۔ اپنی سے دگنی عمر کے بچوں کو وہ پٹخنی دیتا کہ وہ روتے ہوئے ماؤں کے پاس بھاگ جاتے۔ ہر وقت اپنی عمر سے بڑے بچوں میں گھس کر ان کا کھیل بگاڑا کرتا۔ وہ اس سے چھپتے پھرتے۔ اپنے ٹکٹ اور البم اٹھائے کسی کمرے میں چھپ کر دروازہ بند کر لیتے۔ سعد تلاش کرتا وہاں پہنچ جاتا اور پھر دروازے سے لپٹ کر یوں دھاڑتا کہ سارے ہوٹل کو پتا چل جاتا۔ مجبوراً بچوں کو دروازہ کھول کر اس کی شرارتوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ کبھی کبھی وہ تنہا ہی شرارت پر تل جاتا۔ شرارت بھی کیسی خطرناک! ایک دن جو ہماری نظر پڑی تو آپ چھت کے آگے چھجے پر ایک بڑا ڈنڈا لیے یوں چہل قدمی فرما رہے تھے جیسے کوئی عراقی جنرل اپنی فوج کی کمان دیکھ رہا ہو۔ یہ جگہ اتنی پتلی اور اتنی اونچی تھی کہ حضرت گر جاتے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ سنان صرف ڈیڑھ سال کا تھا مگر اس کی لکڑیوں کی مار سے شاید ہی کوئی بچا ہو اور اس کے ہاتھ سے شاید ہی کسی عورت کی چوٹی بچی ہو۔ چپکے چپکے پیچھے سے آ کر یوں بال پکڑتا کہ جب تک امی آ کر دو چار دھپ نہ لگائیں کیا مجال کہ چھوڑ دے۔ وہ جب پاکستان آیا تو اسے بولنا نہیں آتا تھا۔ اب جو باتیں کرنا سیکھیں تو مادری زبان کا اسے ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ آیا اور بیرے اسے پنجابی سکھا رہے تھے۔ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اردو اور انگریزی کے الفاظ سیکھ رہا تھا، پنجہ سٹ کہنے پر ہاتھ ملاتا تھا۔ مچھلیوں کو مچھی کہتا تھا۔ چلنے کو واکی

واکی۔ آؤ جاؤ وغیرہ بہت سے چھوٹے چھوٹے الفاظ اسے آتے تھے۔ حق یہ ہے کہ سعد اور سنان کرنل سیف اور شہرزاد دونوں سے زیادہ اردو سمجھ لیتے تھے۔

پاکستان میں ہی لیفٹیننٹ کرنل سیف کے فل کرنل ہونے کے احکام آئے اور چند دن بعد شہرزاد کی امی نے کسی کے ہاتھ خالص سونے کے تاج بنوا کر بھجوائے جو وردی میں کاندھوں پر لگائے جاتے ہیں۔ شہرزاد نے فخریہ بتایا کہ ان کے میاں جنرل قاسم کے "رائٹ ہینڈ مین" ہیں۔ انھوں نے ہمیں عراق کے انقلاب کا حال سنایا۔ شاہ فیصل کے سفاکانہ قتل کو تو وہ ضرور ناپسند کرتی تھیں، باقی انقلاب انھیں بے حد عزیز تھا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جس دن جنرل قاسم نے بغداد پیکٹ سے نکلنے کا اعلان کیا، تمام بغداد میں خوشیاں منائی گئیں۔ آدھی رات کو اسکول کے بچے سڑکوں پر گاتے ہوئے نکلے۔ یہ اپنے مکان کی کھڑکی سے سارا منظر دیکھتی رہیں۔ یہ سب اتنا حسین لگ رہا تھا کہ ان کا دل چاہا وہ بھی سڑک پر ان بچوں کے ساتھ گاتی پھریں؟

آج ہم برٹش استعمار سے آزاد ہیں

"برٹش استعمار" جلد ہی ہماری روزمرہ کی گفتگو میں ایک خاص اصطلاحی لفظ بن گیا۔ ہمارے ہاں کی بہت سی باتوں کو وہ "برٹش استعمار" کے نام سے یاد کرتیں، ہم ان کے مغربی طرزِ زندگی اور طرزِ احساس کو "برٹش استعمار" کہتے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر روز یا وہ ہمارے پاس آجاتیں یا ہم تین چار خواتین ان کے پاس چلی جاتیں۔ باہر لان میں بیٹھ کر سوئٹر بنتے ہوئے گپ شپ چلتی رہتی۔ بڑے خلوص سے شہرزاد ہمیں ٹرکش کافی پلاتیں جو زبان دراز عورت کے مزاج سے بھی زیادہ تیز اور تیکھی ہوتی۔ شہرزاد ٹرکش کافی کو شاید دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتی تھیں۔ میرے خیال میں یہ کافی پینا اور لوہے کے چنے چبانا برابر تھا۔ مگر ان کی خاطر ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑتا۔ انھیں دنوں انھوں نے ایک مزے دار قصہ سنایا۔ ان کی امی حج کرنے جانے لگیں تو چھوٹی بیٹی کے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا۔ سب بڑے بہن بھائیوں نے جا کر ماں کو سمجھایا کہ اماں غضب کرتی ہو، یہ اس بے چاری کے حج کرنے کے دن ہیں۔ چنانچہ ماں اس کو ساتھ نہ لے جانے پر راضی ہو گئیں۔ انھوں نے وہ پیسہ جو بیٹی کو حج پر لے جانے کے لیے خرچ ہوتا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جس سے اس نے ایک کار خرید لی اور جب اماں حج سے لوٹیں تو وہ اسی کار میں انھیں لینے گئی۔

''مگر آپ نے اسے حج پر جانے سے کیوں روکا؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ جو عورت حج کر آئے وہ ہماری طرح بغیر آستین کی فراک نہیں پہن سکتی، کھلے گھٹنوں نہیں پھر سکتی۔ اس کے لیے ٹخنے کا لباس، پوری آستین کی قمیص پہننا اور سر ڈھکنا لازم ہو جاتا ہے۔ بھلا اس بچی پر یہ ظلم کرنا اچھی بات تھی۔''

وہ دوڑ کر اندر گئیں اور اپنی چھوٹی بہن کی تصویر لا کر دکھائی۔ یہ بچی ان کے کہنے کے مطابق بیس پچیس سال کے درمیان تھی اور بینک میں ملازم تھی۔ بے حد خوب صورت ناک نقشہ، بال کٹے ہوئے، بغیر آستین کا چست لباس پہنے ہوئے اپنی کار کے نزدیک کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ہفتے میں ایک روز شہرزاد عراقی کھانا پکاتیں اور ہم سب کو بانٹتیں۔ جب ہم ڈائننگ ہال میں پہنچتے تو انگور کے پتوں، ٹماٹر اور پیاز میں بھرے ہوئے ڈھیر سے چاولوں کی پلیٹ ہم سب کی میزوں پر پہلے سے رکھی ہوتی۔ کھانے کے بعد ہم ان کا شکریہ ادا کرتے اور تعریف کرتے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی ساری پلیٹوں کا کھانا بے چارے بیرے ہی کھاتے۔ ہر چیز کی طرح کھانے کی بھی ایک عادت ہوتی ہے، اکثر زبان نئی چیز کے ذائقے کو اتنی جلد قبول نہیں کرتی۔ جب کبھی اتوار کے دن ہم کرنل سیف کو انگور کے پتے توڑتے دیکھ لیتے پہلے ہی سے ایک دوسرے کو خبردار کر دیتے۔ ہفتے میں ایک دن رات کا کھانا وہ لوگ 'فرح' یا 'چائنیز' میں کھاتے۔ یہ شاید ان کے نزدیک بغداد کی سوشل زندگی کا بدل ہو۔ ایک روز جب ہوٹل میں پارٹی ہوئی تو شہرزاد بچوں کی طرح خوش تھیں۔

''آئی لائک پارٹی۔'' وہ بار بار کہتیں۔ رات گئے تک سیاہ شال لپیٹے باہر بیٹھی وہ گانے سنتی رہیں جن کا شاید ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

ایک روز ناشتے کے بعد جب ہمارے کمرے کے آگے محفل جمی تو شہرزاد نہیں آئیں۔ بلوایا گیا تو انھوں نے کہلوا دیا کہ وہ مصروف ہیں، نہیں آسکتیں۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ جانے کیا بات ہے۔ جا کر دیکھا کہ شہرزاد ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی ہیں۔ معلوم ہوا شام میں انقلاب آگیا ہے۔ اس نے مصر سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور وہ تازہ بتازہ خبریں سن رہی ہیں۔ کئی دن تک وہ اسی طرح ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی رہیں اور شام کو ہمیں اہم خبریں سنایا کرتیں۔ انھیں دنوں ایک رات کھانے کے بعد ہم ان کے کمرے میں گئے۔ ہمیں ٹرکش کافی پلائی گئی جو ہم نے ڈھیر سے دودھ کے ساتھ بمشکل منظور کی حالاں کہ وہ

لوگ اس میں دودھ ڈالنا بدمذاقی سمجھتے تھے۔ اس دوران میں سعد اور سنان نے وہ شرارت کی کہ بات کرنا دشوار ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے سارے عربی رسالے، اخبار اور کھلونے فرش پر بکھر گئے۔ آپس کی لڑائی سے فرصت ملتی تو سنان کبھی اپنے گلاس کی کافی بابا کی پیالی میں انڈیل دیتا، کبھی بابا کی پیالی کی کافی امی کی پیالی میں ڈالنے کی کوشش کرتا جو میز پر گر جاتی۔ رات کو ان کی آیا چلی جاتی تھی اس لیے اس وقت ان کو قابو میں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہر زاد تنگ آ کر دونوں کو دوسرے کمرے میں چھوڑنے گئیں تو وہ ان کے واپس آنے سے پہلے پھر یہاں موجود تھے۔ یہ دیکھ کر وہ عربی میں جلدی جلدی بچوں کو برا بھلا کہنے لگیں۔ کرنل بڑے رسان سے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور بچوں کی طرف اشارہ کر کے ہم سے بولے، ”دیکھا آپ نے ہم عربوں کا خون کتنا گرم ہوتا ہے۔ تبھی تو ہمارے ملک میں اتنے انقلاب آتے ہیں۔“

انھوں نے ٹھیک کہا تھا، اس بات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۸ر فروری ۱۹۶۳ء کو عراق میں انقلاب آیا۔ بغداد پر جنگی طیارے اُڑے۔ وزارتِ دفاع پر بم برسائے گئے۔ جنرل قاسم اور اس کے چار ساتھیوں کی نعشیں ٹیلی وژن پر دکھائی گئیں جنھیں ایک بند کمرے میں مقدمے کے بعد شوٹ کر دیا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں چھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ سب سے پہلے جب ریڈیو پر میں نے اس خونی انقلاب کی خبر سنی تو میرا خیال ایک دم کرنل سیف تک پہنچا جو ان کی بیگم کے کہنے کے مطابق جنرل قاسم کے رائٹ ہینڈ مین تھے۔ کیا ان چھ ہزار قاسم کے حامیوں میں کرنل سیف نہیں ہوں گے؟ یہ سوچ کر میرا دل کانپ اٹھا۔ انسانی فطرت بھی کتنی عجیب ہے۔ چھ ہزار افراد صرف ریاضی کا ایک ہندسہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی موت اس ایک کنبے کی موت سے کہیں کم محسوس ہوتی ہے جسے آپ نے نزدیک سے دیکھا ہو جن سے آپ نے محبت کی ہو اور جن کے ساتھ اچھا وقت گزرا ہو۔

مجھے خیال آیا، کاش شہر زاد اس وقت اپنے کنبے کے ساتھ پاکستان میں ہوتیں! یہ ملک ضرور ان کو اپنی پناہ میں رکھتا، یہ ملک جہاں ان کا دل نہیں لگتا، جہاں لوگوں کے دو دو ٹیلی وژن اور ریڈیو سیٹ نہیں ہیں، جہاں ہر روز جشن نہیں ہوتے اور جہاں غیر ملکی چیزوں کے ڈھیر نہیں ہیں وہاں کم از کم ہر ایک کی جان محفوظ ہے، جہاں انقلاب خون کی آندھی اور طوفان بن کر نہیں، سبک رو میٹھی ندی کے مانند چپکے سے آجاتے ہیں۔

میرے پاس ان کا پتا محفوظ ہے اور وہ کارڈ بھی جو کرنل نے ہمارا شکریہ ادا کرنے کے

لیے بغداد سے بھیجا تھا۔ الف لیلیٰ کا بغداد! کارڈ میں دور دریائے دجلہ پر پل جمہوریہ نظر آرہا ہے۔ اس پر سے گزر کر آنے والی سڑک کے ایک طرف نیا بغداد ہے اور ایک طرف پرانا بغداد، ایک طرف نئی عمارتوں میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں نظر آرہی ہیں اور ان کے سامنے میدان میں ان گنت کاریں کھڑی ہیں۔ دوسری طرف پرانی سرائے کے انداز کی ایک عمارت ہے جس کی محرابوں اور ستون کے اندر سے تاریکی جھانک رہی ہے۔ اونچے چپ چاپ کھڑے درختوں کے سائے میں ایک بوسیدہ سی مسجد ہے۔ اس کارڈ میں کرنل کی لکھی ہوئی انگریزی مضحکہ خیز ہے مگر اس سے بوئے خلوص و وفا آتی ہے۔ شہرزاد نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، یہ معاہدہ پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ہم خط و کتابت نہیں کریں گی کیوں کہ شہرزاد نہ انگریزی لکھ سکتی تھیں نہ اردو اور مجھے عربی نہیں آتی۔ میرے پاس ان کی وہ تحریر آج بھی موجود ہے جو چلتے وقت انھوں نے لکھ کر اور خود ہی ترجمہ کر کے مجھے سنائی تھی۔ ''پاکستان کے یہ شب و روز اور پاکستانیوں کا خلوص و محبت کبھی نہیں بھولوں گی۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت اچھے دن گزارے۔ مجھے 'فرح' کی آئس کریم اور 'چائنیز' کا چکن بھی بہت یاد آئے گا اور وہ اکلوتی پارٹی جو ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اور میں پاکستانیوں کا وہ تلفظ بھی کبھی نہیں بھولوں گی جس میں وہ عید الفطر اور عید الضحیٰ کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔''

دل چاہتا ہے اپنا معاہدہ توڑ کر شہرزاد کو خط لکھوں اور ان کی خیریت پوچھوں، پھر سوچتی ہوں کیوں نہ میں یہ تصور کیے رکھوں کہ وہ سب خیریت سے ہیں اور خوش ہیں۔ زندگی بھر اس سے ملنے کا امکان تو یوں بھی نہ تھا۔ پھر کیوں نہ ہم انھیں اپنے حافظے میں زندہ سلامت رکھیں، زندگی کے لیے ضروری تو نہیں کہ جسم بھی ہمارے سامنے ہو۔

○○

خلیق الزماں کی ٹم ٹم

اقبال مجید

میں اسے چھوتی ضرور تھی، لیکن اس کے تصوراتی بھاری بھرکم پن کے ایک پُر اسرار بوجھ کو دل ہی دل میں محسوس کر کے کچھ دہشت زدہ بھی رہ جاتی تھی حالانکہ وہ دیکھنے میں بڑی نازک اور ہلکی تھی۔ اسے اکثر غور سے دیکھنے پر کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں اس شاندار اور نفیس ٹم ٹم کے پر وقار بوجھ کے معنی کو جو مجھے کسی وجہ سے بڑے وسیع محسوس ہوتے تھے دریافت کرنے کے لائق کبھی بن سکوں تو مزہ آجائے۔ اس کا وجود بلا شبہ مجھے کبھی کبھی ایک گہری سوچ میں ڈال دیتا۔ جیسے جیسے میں اپنی مصروف اور بھاگتی دوڑتی زندگی کی شکستوں سے مضحل اور چھوٹی چھوٹی فتوحات سے مسرور ہوتی گئی اور میری آگہی کے جنگل گھنے ہوتے گئے اور صحافت کے مشغلے نے ملک کے اگلے پچھلے سیاسی منظر ناموں کو میری فہم میں اتارا تو اس ٹم ٹم کے اسرار کھولنے اور اس میں سفر کرنے کا جذبہ میرے اندر تندہی سے سر اٹھاتا گیا۔

جب میں کم عمر تھی تو میری دادی ارجمند بانو کی ماضی کی اوڑھنی میں یادوں کے سیکڑوں سلمہ ستارے جڑے ہوئے جھلملایا کرتے تھے۔ انھیں کا بیان تھا کہ یہ ٹم ٹم مسلم لیگ کے لیڈر خلیق الزماں کی ٹم ٹم ہے۔ میرے باپ کا پرانا ملازم اس ٹم ٹم کا چپہ چپہ روز بلا ناغہ جھاڑتا پونچھتا تھا اس کی پیتل کی لالٹین جو منقش تھیں، براسو سے رگڑ کر چمکائی جاتی تھیں۔ کیا مجال تھی کہ ٹم ٹم کے نازک پہیوں کی نفیس تیلیوں پر معمولی سا دھبہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ اس کا پائیدان، گدیاں، پیچھے اردلی کے کھڑے ہونے کی جگہ، اس کے لمبے سڈول اور پالش کیے ہوئے نازک

بم اور اس میں جڑی پیتل کی پھلیاں اور آرائش کا دیگر نقرئی سامان ہر چیز روزِ اول کی طرح نئی اور صاف ستھری آج بھی تھی۔ لیکن میں نے اسے کبھی سواری کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔

جب میں اسے آنکھ بھر کر ڈیوڑھی کی مضبوط چھت کے نیچے جو موٹی موٹی دھنیوں پر ٹنگی ہوئی تھی دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ ٹم ٹم کے ایک ایک حصے سے ایک کہانی چیختی ہوئی نکل سکتی ہے۔ لیکن اپنے صحافتی پیشے میں کھائی ہوئی ٹھوکروں نے مجھے بتایا کہ ایسے وقت میں یہ کام کس قدر دشوار تھا جب قومی اور معاشرتی سطح کے سنجیدہ موضوعات وغیرہ پر لکھنے والے صحافیوں کی تعداد نہیں کے برابر تھی اور 'لیک ے انڈیا فیشن ویک' پر لکھنے والوں کی تعداد سیکڑوں تھی۔

میری نظر جب اس ٹم ٹم کی پشت پر جڑی ایک چمچماتی تختی پر پڑتی جس پر ٹم ٹم بنانے والی فرم کا نام اور تعمیر کا سال ۱۹۳۵ء لکھا ہوا تھا تب مجھے یہ خیال ضرور آتا کہ یہ ٹم ٹم ۱۹۳۷ء کے زمانے میں خلیق الزماں کے پاس ضرور رہی ہوگی۔ جب میں ٹم ٹم کی آرامدہ گدی پر ہاتھ پھیرتی تو مجھے لگتا کہ میرے آبائی وطن لکھنؤ میں یہ ٹم ٹم خلیق الزماں کو راجہ محمود آباد کے پاس نہیں تو راجہ جہانگیر آباد کے پاس ضرور لے کر گئی ہوگی۔ کیوں کہ جہانگیر آباد کے چلتے پُرزے راجہ اس وقت برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور خلیق الزماں خوب جانتے تھے کہ یہ سارے راجے مہاراجے اپنی زمینداری اور اقتدار کو بچانے کی مہم میں دن رات برٹش انڈیا کے اعلیٰ حاکموں کا اٹھنا بیٹھنا حرام کیے ہوئے تھے اور حکومت کی بے اعتنائی پر مسلم لیگ ان کی ضرورت بن سکتی تھی۔ میری دادی کو جو باتیں روزِ روشن کی طرح یاد تھیں، جب وہ انھیں سناتیں تو وہ قصے مجھے اس عہد کی عجیب وغریب داستانوں کی طرح لگتے۔ وہ کہتی تھیں کہ سنا ہے لکھنؤ میں کوئی منشی رجب علی تھے، وہ زمینداروں سے ناراض اور مشتعل کسانوں کے خفیہ طور پر مخبر تھے، رجب علی شاید ریاست نانپارہ کے رجواڑے کے معمولی ملازم تھے۔ ایک بار راتوں رات بیل گاڑی پر بیٹھ، انگوچھے سے سر اور چہرہ ڈھک لکھنؤ کے اطراف کے گاؤں میں یہ خبر دے آئے کہ فلاں فلاں دن خلیق الزماں کی تحریک پر راجہ محمود آباد اور راجہ نانپارہ دیگر راجاؤں کے ساتھ اپنی عملداریاں بچانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے واسطے موجود ہوں گے اس لیے اس موقعے پر کسان لوگ کونسل پر دھاوا بول دیں۔ کیوں کہ کانگریس نے کسانوں کا ساتھ دے کر اس مسئلے پر انگریزوں کو ہلکان کر رکھا ہے۔ پھر کیا تھا ہزاروں کسانوں نے دو چار دن کے اندر ہی لکھنؤ میں کونسل پر دھاوا بول دیا۔ ان غریب کسانوں کا اتنا بڑا مجمع دیکھ کر جواہر لعل آبدیدہ ہو گئے اور کہا

کہ اتنی آگ بھری تھی ان ناداروں میں یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔

میں اس ٹم ٹم کے پائیدان کو کبھی کبھی انگلیوں سے چھوتی تو مجھے لگتا جیسے ابھی ابھی میرٹھ کے نواب اسمٰعیل خاں، خلیق الزماں کے ساتھ اس پائیدان پر پیر رکھ کر ٹم ٹم کی گدی پر بیٹھے ہیں اور کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان برائے حکومت Coalition کی بات ناکام ہونے کے بعد مردہ مسلم لیگ میں جان ڈالنے کے لیے راجہ محمود آباد کی کوٹھی پر عشائیہ کھانے گئے ہیں۔ میری دادی کہتی تھیں کہ اپنی جوانی میں بڑے بڑے دالانوں میں ہم لوگ چادریں باندھ کر حجرہ سا بناتے اور اس میں چھپ کر لیٹتے اور آموں کی کچی کیریاں نمک لگا کر کھاتے تھے۔ آنگنوں میں لہریا دار دوپٹے رنگ کر الگنی پر پھیلائے جاتے تھے پھر ان کو بوڑھی خادمائیں پلنگڑی پر بیٹھ کر دیر تک چٹکیوں سے چنا کرتی تھیں، ہم انھیں اوڑھ کر شاخوں میں پڑے جھولوں پر جب جھولتے تو ہمارے ڈرائنگ روم میں یونین جیک کی محبت میں گرفتار سرخ گالوں والے بہت سے حکیم اور شیخ اور خوشحال مرد جمع ہوا کرتے اور نیشنل ہرالڈ اخبار سن کر اخبار والوں کو کوسا کرتے۔

ایک دن میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی پاکستانی دوست حمیرہ کا ایک مراسلہ اخبار میں پڑھ رہی تھی جو چند برسوں سے پاکستانی صحافت کے میدان میں بے جگری سے کام کر رہی تھیں اور کسی وفد کے ساتھ ہندوستان آنے والی تھی اور ملاقات کے امکان کی خوشخبری بھی فون پر دے چکی تھی کہ میرا ملازم گھبرایا ہوا اندر آیا اور خبر دی کہ شہر کے کسی حصے میں ہندو مسلم تناتنی ہو گئی ہے اور بازار میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ باہر سڑک پر کچھ شور سنائی دیا تو میں کمرے سے باہر ڈیوڑھی میں آئی دیکھا میرا ڈرائیور کوٹھی کا دیو قامت وزنی پھاٹک جسے دو آدمی ڈھکیلتے تھے اکیلے بند کرنے میں لگا تھا۔ ٹم ٹم کے آگے ہی خالی جگہ پر ہماری کار کھڑی تھی میں اس کی آڑ میں زمین پر ٹکی ٹم ٹم کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور حمیرہ کے باقی بچے مراسلے کو ختم کرنے لگی۔ لیکن میرے کان سڑک کی آہٹوں کی طرف بھی لگے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میرے آس پاس کا ماحول کہیں کھو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹم ٹم کی سیٹ پر میرے پہلو میں ہی خلیق الزماں اپنی شیروانی کا دامن ٹھیک کرتے ہوئے چپکے سے بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات ہیں جن میں سے ایک کاغذ نکال کر وہ مجھے بتاتے ہیں:

"یہ یوپی کے گورنر کی پندرہ روزہ رپورٹ ہے جو وائسرائے کو اطلاع کے لیے ۱۹۳۸ء میں بھیجی گئی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہندو مہا سبھا کے لیڈر

ونائک دامودر ساورکر کی تقریریں جامے سے باہر ہوتی جارہی تھیں۔‘‘

پھر وہ رپورٹ پڑھ کر سناتے ہیں:

’’ساورکر صوبے کا دورہ کر رہے ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ انھوں نے کانپور اور لکھنؤ میں جگہ جگہ مجمع لگا کر خطاب کیا ہے۔ انھیں جو حمایت ملتی ہے وہ غالباً ہندو جذبات پر مبنی ہے، وہ ہندوؤں کے مفادات کو نظر انداز کرنے کا الزام لگا کر کانگریس کی مذمت کرتے رہے ہیں اور ہندو جذبات کو بھڑکانے کی کوشش بالکل ویسی ہی ہے جیسی کوشش مسلم لیگ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے کرتی رہی ہے۔‘‘

پھر دفعتاً کچھ ایسا ہوا جیسے ٹم ٹم چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گئی ہو اور اس جھٹکے میں نہ جانے کب خلیق الزماں کی جگہ محمد علی جناح آکر بیٹھ گئے ہوں پھر یکا یک اردلی کے پائیدان پر پیچھے کسی کے قدم رکھ کر کھڑے ہونے کی وجہ سے ٹم ٹم میں دھچکہ لگا جس کے سبب جناح نے گردن پیچھے گھما کر پوچھا:

’’کون......؟‘‘

جواب ملا۔ ’’آپ کا خادم سید محمد سعادت علی خاں، بہرائچ کی ریاست نانپارہ کا راجہ۔‘‘

یہ سن کر جناح مسکرائے راجہ کو مسلم لیگ میں اپنے حمائتیوں کے ساتھ شامل ہونے پر مبارکباد دی پھر الہ آباد اور بنارس کے فرقہ وارانہ فسادات کے نتائج اور مادھو سدا شیو گولوالکر کی متنازعہ کتاب کا ذکر کیا اور برا سا منھ بنا کر بولے

’’اس کے بعد بھی پاکستان کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو حیرت ہے۔ پاکستان کا مطلب ہے ہم مکمل آزادی اور مکمل عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہتے ہیں یا پھر مر جاتے ہیں۔‘‘

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹم ٹم کی دائیں بائیں لگی دونوں لالٹینوں کی صاف ستھری چمنیوں کے اندر سے بے تحاشہ گاڑھا گاڑھا دھواں ابلنے لگا اور اس نے پوری ڈیوڑھی کو گہری دھند میں ڈبو دیا اسی دھند میں کوٹھی کے باہر ڈامر کی چوڑی سڑک پر اخبار کے ہاکروں کی کرخت آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔

کیبنٹ مشن ڈیڈلاک (Dead Lock) ختم کرنے میں ناکام

قصبات چھریاں اور تلواریں جمع کر رہے ہیں۔

جناح کے راست اقدام کا شاخسانہ، کلکتہ میں چار ہزار افراد موت کے گھاٹ اترے، لارڈ ویول چھریوں سے ذبح کئے گئے انسانوں کی لاشیں دیکھ کر توبہ بول گیا۔ گڑھ مکتیسر کے گنگا میلے میں ایک ایک مسلمان تہہ تیغ۔

پٹیل نے کہا بے شک ہم اس الگاؤ اور فرقہ پرستی کو پسند نہیں کرتے ہیں لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں دیکھتے ہیں۔

اس خلفشار کے عالم میں یکا یک ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بجی تو میں ٹم ٹم کی سیٹ پر اپنے خیالوں سے نکل کر اچھل پڑی اور بھاگی ہوئی اندر گئی، فون اٹھایا دوسری جانب سے حمیرہ بول رہی تھی، پاکستانی وفد انڈیا آ گیا تھا، حمیرہ کے پاس لکھنؤ کا ویزا تھا اور وہ مجھ سے ملنے آ رہی تھی وہ چالیس کے لپیٹے میں تھی۔ دو بچے بھی ہوئے لیکن زندہ نہ رہے وہ تین چار دن میرے یہاں مقیم رہی، میں اسے اکبری دروازے پر نہاری کلچے کھلانے لے گئی، ایک شام اس کے کہنے پر ٹنڈے کے کباب اور پراٹھے کھلائے اس کی دکان پر حمیرہ نے مجھے یاد دلایا کہ جوش نے بھی ٹنڈے کبابوں کا ذکر کیا ہے، پھر ایک شام امین آباد میں اسے گنگا پرشاد میموریل ہال دکھایا وہ اس ڈائس پر کچھ دیر کھڑی اس کے فرش کی پرانی لکڑی کو گھورتی رہی جس پر کبھی سر تیج بہادر سپرو، جواہر لال نہرو اور خاکسار پارٹی کے علامہ مشرقی وغیرہ بیٹھ چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب چیزوں سے پہلے میں ڈیوڑھی میں کھڑی خلیق الزماں کی وہ ٹم ٹم اسے دکھا چکی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ ٹم ٹم پاکستان میں ہونا چاہیے تھی۔ حمیرہ نے میرے زور دینے پر اس ٹم ٹم کو یونہی گھوم پھر کر دیکھا ضرور مگر کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔

دیر رات تک ہم دونوں کافی کے پیالے بناتے وہ سگریٹیں پھونکتی اور ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ گزرے دنوں کی سیاست اور تقسیم کے بعد اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی لکھنؤ کی تہذیبی اور معاشرتی تباہی میرا خاص موضوع رہتا۔ آخری رات حمیرہ نے بڑی بے تکلفی سے یہ بات جاننا چاہی کہ ہم لوگ پاکستان کو تقسیم کا ذمہ دار سمجھنا کب بند کریں گے۔ پھر وہ بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

"وہ ایک ملک ہے جس کی تاریخ کے کئی باب لکھے جا چکے ہیں، وہاں کے عوامی لیڈروں نے سلسلہ وار ایک کے بعد ایک اپنی جانوں کی قربانیوں دی ہیں اس لیے نہیں کہ

ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جائیں، جنھیں تقسیم نے گھائل کیا تھا وہ لوگ مر چکے ہیں یا میدانِ عمل کے حاشئے سے الگ پڑے ہیں۔ میں جو کچھ لکھتی ہوں اس ملک کے استحکام کے لیے لکھتی ہوں اور اس میں ضروری تبدیلیاں چاہتی ہوں۔ تم ٹم ٹم کی کہانیوں کے بجائے اپنی کہانیوں میں سفر کیوں نہیں کرتیں۔''

صبح حمیرہ کو میں اسٹیشن چھوڑنے گئی، پاکستان آتے ہی اس نے مجھے فون پر پہنچنے کی اطلاع دی۔ میری زندگی پھر اخباروں کے چاندہ منیجروں کو بار بے کیو پر سینکے گئے چکن ملائی تکہ کھلانے میں گزرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد حمیرہ کا ایک خط آیا لکھا تھا۔

''جس صبح تم مجھے اسٹیشن چھوڑ کر آئی تھیں اس کی رات میں تمہارے کمرے میں بہت مضطرب رہی بار بار مجھے خلیق الزماں کی ٹم ٹم کا خیال آتا جو تمہاری کوٹھی کی ڈیوڑھی میں کھڑی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بڑی تاریخی چیز تھی بلکہ اس لیے کہ وہ مجھے ایک ادھوری سی چیز لگی تھی۔ تم تو سو گئیں تھیں لیکن میں دیر رات گاؤن پہنے اور ننگے پیر چپکے سے ڈیوڑھی میں گئی۔ اندھیرے میں اس ٹم ٹم کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے کوئی اعلیٰ اور قیمتی سوٹ پہنے ننگے پیر کھڑا ہے۔ لگا کہ اس ٹم ٹم سے کوئی بڑی خاص چیز Missing ہے یا نکال لی گئی ہے، اور وہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہماری اجتماعی یاد داشت سے محو نہیں ہو پا رہی ہے، نہ یہاں اور نہ ہندوستان میں۔ جتنا میں اس غائب چیز کو یاد کرنے کی کوشش کرتی میری جھنجھلاہٹ، غصہ اور تلملاہٹ بڑھتی جاتی۔ یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ جس درد اور زہر بھری پشیمانی کی چبھن ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک میری شہہ رگ کے قریب گڑتی رہی وہ اسی شے کے سبب ہی تو تھی جو خلیق الزماں کی ٹم ٹم سے یکسر غائب تھی اور مجھے یاد نہیں آ رہی تھی کہ وہ کونسی شئے تھی۔ تب میں نے پاکستان کے قیام کی تاریخ کے صفحات لائبریریوں میں الٹنا شروع کیے تو مجھے معلوم ہوا کہ جب کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کی حکمتِ عملی ناکام ہو گئی تو جناح نے مسلم لیگ کے سارے لیڈروں کو احساس دلایا کہ جس حکمت عملی کے پہیوں پر چودھری صاحب کی ٹم ٹم چلایا جا رہا تھا ان پہیوں کو تبدیل کر دیا جائے اور نئے پہیے لگا کر ایک پاکستان کی مانگ تیز کر دی جائے تاکہ کانگریس اور برٹش حکومت پر وزنی دباؤ پڑ سکے۔ بس اسی وقت یہ بات میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی کہ یہ ٹم ٹم دراصل ٹم ٹم نہیں ہے اقتدار کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اسے سیاسی حکمت عملی کے پہیے چلاتے ہیں۔ پھر اس ٹم ٹم کو لے کر مجھے یہ فکر ہوئی کہ اگر اس ٹم ٹم کے کوچوان کی سیٹ پر جناح بیٹھے تھے اور اردلی کے پائیدان پر

چودھری صاحب مع اپنے دیگر ساتھیوں کے کھڑے تھے اور اس کی چال سیاسی حکمت عملی کے پہیوں پر منحصر تھی تو پھر اس ٹم ٹم کو کھینچ کون رہا تھا، کون تھا جس کے منہ میں لگام ڈال کر اس اس کے کوچوان کو پکڑا دی گئی تھی۔ شاید وہی لمحہ تھا جب مجھے زندہ درگور اپنی بوڑھی ماں یاد آئی وہ باپ یاد آیا جس کا گلا بلوائیوں نے کاٹ دیا تھا اور وہ گاؤں یاد آئے جن کی کنواریوں نے اپنی عصمت بچانے کے لیے کنویں میں چھلانگیں لگائی تھیں وہ ریل گاڑیاں یاد آئیں جن کے ڈبے لاشوں سے پٹے اور خون سے رنگے ہوئے تھے۔ پھر میں نے اپنے ملک کی آزادی کے دن نمائش کے لیے اس ٹم ٹم کی ایک شبیہ تیار کی اور اس میں دو خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو گھوڑی کی کھال پہنا کر اور گھوڑی کے تمام جھام سے آراستہ کر کے گھوڑی کی ہی طرح ٹم ٹم کو کھنچوایا اور اس جھانکی کا نام رکھا ''خلیق الزماں کی ٹم ٹم کی گھوڑیاں''۔ جب ان لڑکیوں نے ٹم ٹم روک کر اپنے اوپر سے گھوڑی کا لبادہ اتارا اور اپنے اصلی روپ میں مسکراتی ہوئی سامنے آئیں اور سامعین کے سامنے تعظیم سے جھکیں تو اگلی صفوں پر بیٹھے علاقے کے وڈیرے اپنی بھوکی آنکھوں سے ان لڑکیوں کو دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے لیکن میں اپنے خیالوں میں اپنی بوڑھی ماں کے زخم سہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ہندو خاندان میں پیدا ہونے والی میری بہتر سالہ ہندو ماں جسے مسلمان کر لیا گیا پندرہ برس کی عمر میں لوٹ مار کے موقعے پر اپنی کشش اور خوبصورتی کی ماری انھیں وڈیروں کے ہاتھوں اغوا ہوئی تھی اور اپنی عزتِ نفس اور وقار کے سارے لباس اور اپنے مذہب اور ضمیر کے سارے قیمتی زیورات اتار کر اسی ٹم ٹم میں الف ننگی جوت دی گئی تھی۔ یہ بھی جان لو کہ خوبصورت گھوڑیوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے والے ان وڈیروں میں سے ایک نے جو حکومت میں خاص بااثر جگہ پر تھا مجھے کھانے پر بلایا تھا اس کے گھر میں سونے کے فریموں میں جڑے آئینے تھے، موٹے موٹے قالین تھے، الیکٹرانک تھیٹر تھا۔ لذیذ کھانوں سے بجی عالیشان ڈائننگ ٹیبل تھی مشروبات کے دوران اس نے اپنی چبھتی ہوئی نوکدار نظروں سے دیکھ کر سوال کیا تھا۔

''آپ اخباروں میں لکھتی ہیں تو ایک بات ضرور جانتی ہوں گی؟''

''کیا؟''

''یہی کہ ہم نے روح افزا کا شربت بیچ بیچ کر ایک یونیورسٹی تو کھڑی کر لی ہے لیکن ہم ہندوستانیوں کی اسکالرشپ پر بے حد رشک کرتے ہیں'' میں نے بھی اس کی بات کا اعتراف کیا تو وہ بولا۔

"ان لوگوں نے ہم سے پہلے یہ جان لیا ہے کہ انسانوں کی زندگی میں حقیقت سے زیادہ حقیقت کا تصور اہمیت رکھتا ہے، ہٹلر کے تصور میں یہودی وہ نہیں تھے جو جارج بُش کے لیے ہیں، آج عورت اپنی کارکردگی اور خود آگہی کے سبب ایک فرد نہیں رہ گئی ہے اس کی حیثیت ایک ایجنسی میں تبدیل ہو چکی ہے۔"

"کچھ بھی ہو" میں جل کر بولی۔ "عورت کو اپنی کھوئی ہوئی طاقت کی تلاش ہے"۔ وہ مجھے ایک پل گھورتا رہا پھر اپنا سگار جلاتے ہوئے بولا۔ "طاقت صرف جسمانی یا فوجی ہی نہیں ہوتی، حکمت عملی بھی ایک طاقت ہے یہ سیاسی بھی ہو سکتی ہے اور جنسی بھی اور دیکھا گیا ہے کہ جنسی حکمت عملی اختیار کر کے طاقت کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ میں کچھ بدمزہ ہو کر کھانا کھائے بغیر اس کے یہاں سے کوئی بہانہ کر کے چلی آئی۔ باقی باتیں پھر لکھوں گی۔ اللہ حافظ"

میں تمیرہ کا خط ایک طرف ڈال کر بھاری قدموں سے ڈیوڑھی میں آئی۔ سامنے ٹم ٹم کھڑی تھی اپنی وکٹورین شان و شوکت کے ساتھ۔ میں اس کی سیٹ پر اداسی سے بیٹھ گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، یکا یک ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں دوڑی ہوئی گئی، فون اٹھایا، آواز آئی۔

"تمیرہ بول رہی ہوں۔ میرا خط مل گیا؟"

"ہاں آج ہی ملا ہے"۔ میں مری سی آواز میں بولی۔

"اب تم جو سیکڑوں میل دور ایک ٹم ٹم کا تصور لیے بیٹھی ہو مجھے ایمانداری سے ایک بات بتاؤ۔"

وہ چہک کر بولی۔ میں نے ویسی ہی کھوئی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ "پوچھو"۔

"ہو سکتا ہے وہ ٹم ٹم بنگال کے کسی مسلم لیگی کی نہ ہو کر بنارس کے کسی ہندو تاجر کی ہو جو لوٹ مار میں ہاتھ آئی ہو اور پھر کسی مسلمان کباڑی کے ہاتھوں تمہارے امیر خاندان میں فروخت کر دی گئی ہو اور اس کباڑی کا نام ہی خلیق الزماں رہا ہو۔ اس وڈیرے کی اس بات پر بھی غور کرو کہ چیزیں اپنی اصل حیثیت کو چھوڑ کر ایجنسیوں کا روپ اختیار کر رہی ہیں اور وہ ٹم ٹم حصولِ اقتدار کا بس ایک پُرزہ ہی بن کر رہ گئی ہو۔ اک بار پھر اس ٹم ٹم کو غور سے دیکھو اور اس کے ادھورے پن کو مکمل کر کے مجھے فون کر دو۔ اللہ حافظ۔" تمیرہ نے فون رکھ دیا۔

اُس رات میں اپنے بستر پر اپنی تصویروں کے البم کے صفحات دیر تک اُلٹتی رہی۔

دلت گاؤں میں اجتماعی ریپ کی گئی عورتوں کا انٹرویو لیتے ہوئے تصویریں، اسپتال کے بستر پر پڑی سسرال میں جلائی گئی عورتوں سے بات کرتی تصویریں، الیکشنوں میں عورتوں کے لیے جھوٹے وعدے کرتی عورتوں کی تصویریں تانیثیت کی ان علمبردار عورتوں سے بات چیت کے دوران کی تصویریں جنھیں خود بھی نہیں معلوم کہ عورت نئے حالات میں کس طرح بسر کرے۔ گجرات کی بیکری میں جلنے سے بچ جانے والی خانماں برباد عورت کی پچھلی گواہی سے پلٹ جانے پر کھینچی گئی تصویریں اور خدا سے بے آسرا ہو کر اور لال مسجد سے نکل کر گولیوں کی چھاؤں میں گرتی پڑتی اور بھاگتی برقعہ پوش لڑکیوں کی تصویریں جو حمیرہ نے بھیجی تھیں۔

میں اداس تو تھی ہی اور بھی اداس ہو گئی۔ اس البم کو نوچ کر پھینک دینے کو جی چاہا۔ پہلی بار مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ مجھے لگا کہ میں جہاں بھی ہوں بس ایک گھوڑی ہوں اور ساری گھوڑیوں کے گھاؤ اور ان سے رسنے والا خون اور اس پر بیٹھنے اور بھنبھنانے والی مکھیاں ایک سی ہوتی ہیں چاہے وہ کوئی بھی زبان بولیں اور کوئی بھی کپڑے پہنیں۔ میرے آس پاس سناٹا گہرا ہوتا گیا......... میں نے بھاری دل سے حمیرہ کو فون کیا اور کہا کہ مجھے خود پر شرم آنے لگی ہے۔ طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ کچھ دیر وہ چپ رہی پھر بولی۔

''میں ابھی ابھی پولیس چوکی سے آ رہی ہوں۔ اتنا یاد رکھو کہ جو کچھ جیسا ہے اس پر گڑھنے اور چڑچڑانے کا اس کے خلاف احتجاج کرنے اور فریاد کرنے کا بھی ایک مزہ ہے اور اس سے حاصل ہونے والی سرشاری اور طمانیت ایک اندر ہی اندر چلتے رہنے والا Movement ہے۔ ایک خاموش Continuity ہے۔ اپنے کو خود سے نفرت کرنے والوں میں شامل نہ کرو، تم سے نفرت کرنے والے بہت ہیں، مجھے اسی نفرت کے سبب بار بار یہاں تھانے پر بلایا جاتا ہے۔ بیٹھنے کو کرسی بھی نہیں دی جاتی۔ پوچھا جاتا ہے میں گالیاں دینا کب بند کروں گی۔

تو میں جواب دیتی ہوں۔

''جب تک دوسرے اپنے کندھے پر ان گالیوں کے بوجھ کو محسوس نہیں کریں گے۔''

پھر تھانیدار آنکھیں نکال کر کہتا ہے:

''ان گالیوں کا انجام معلوم ہے۔'' تو میں مسکرا کر جواب دیتی ہوں۔

''گالیوں کا انجام دیکھنے کے لیے نہ خلیق الزماں زندہ رہے اور نہ میں زندہ

رہوں گی۔"

لگتا تھا کہ حمیرہ بہت تھکی ہوئی تھی، اس کا حلق بھی شاید خشک ہو رہا تھا میں نے اس سے بجھے دل سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا اقتدار کی لگام تھامنے والے کوچوان کی ٹم ٹم میں ہی ہمیں جتے رہنا ہے۔ میں نے فون رکھ دیا۔ دوسرے دن میں نے اپنی تصویروں کا قدِ آدم (Cut out) ہارڈ بورڈ پر بنوایا اور ٹم ٹم کے دونوں بموں کے درمیان گھوڑی کے کھڑے ہونے کی جگہ پر اس کو کھڑا کر دیا اور اپنی اس تصویر کے منھ میں ٹم ٹم کی لگام پھنسا دی۔ پھر اسی حالت میں اس یادگار ٹم ٹم کی ایک تصویر کھنچوائی اور ٹم ٹم کو وزیر حسن روڈ پر کوٹھی تعمیر کرنے والے ایک مالدار ہندو جویلر کو دے دیا۔ لیکن ایک دن میں نے ٹم ٹم کی وہ بڑی سی یادگار تصویر جو ڈرائنگ روم کی دیوار پر سجی ہوئی تھی کمرے سے نکال کر کباڑ میں ڈال دی کیوں کہ میرا یہ گمان بڑی حد تک یقین میں بدل چکا تھا کہ وہ ٹم ٹم ہمارے خاندان میں کسی کباڑی نے بیچی تھی۔ جس کا نام خلیق الزماں تھا۔

OO

کرفیو سخت ہے

انیس رفیع

سورج کہیں لا پتہ ہو چکا تھا۔! یا کسی نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دی تھی......
یا پھر کوئی دبیز سا کمبل اوڑھ کر اوندھے لیٹ گیا تھا سورج.......اب جب کہ سورج لا پتہ ہو چکا ہے.........

سا ری باتیں زمین کے حوالے........
سارے معر کے اندھیروں نے
ان اندھیروں میں پیلیا روشنی لیے..........
بیرسٹر داہر کا کمرہ!

دیواروں پر کتابوں کے لمبے لمبے شلف بھلادی جانے والی ساری بڑی بڑی کتابوں کا مدفن۔ کل ملا کر کمرہ بوسیدگی کی طرف مائل تھا۔ دیواروں پر سفیدی برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔ شیلف کے شیشے جا بجا ٹوٹے ہوئے تھے۔ چمگادڑوں اور کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کوئی کوئی کتاب شیلف سے باہر آتی ہوئی اٹک گئی تھی جسے مکڑیوں نے جالے بن کر انہیں نیچے گرنے سے روک دیا تھا۔ میز، کرسیاں، کھڑکیوں کے پٹ، سب گرد آلود تھے۔ پرانی وضع کا ایک بجلی پنکھا اور مخدوش لیمپ شڈ چھت سے لٹک رہے تھے۔ اس میں لگا نحیف سا بلب جلنے پر بھی بجھا بجھا سا لگ رہا تھا، بجھی بجھی کیفیت میں جلتے ہوئے اس بلب کے نیچے ایک گول میز تھی جس پر تین سروں کے سائے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔

داہر کے سامنے قاسم اور اس کا ایک محرر بیٹھے تھے، داہر پے در پے کئی مقدمے ہار کر اپنی وکالت کی ساکھ بگاڑ چکے تھے۔ امام فیملی کے ایڈوکیٹ قاسم نے بھی داہر کو ایک بھاری شکست دی تھی اور اس کے بعد بیرسٹر داہر اپنے موکلوں کے لیے گمنام ہوتے چلے گئے تھے۔ شکست و فتح اپنی جگہ، دونوں کے ذاتی تعلقات بہت گہرے تھے، کورٹ کے باہر دونوں ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے، مگر سورج کے اچانک غائب ہو جانے پر قاسم ہیبت ناک مقدمے میں پھنس گیا تھا۔ داہر، قاسم اور محرر تینوں کے چہروں پر تناؤ تھا۔

کمرے کی پھیکی روشنی بھی فی الوقت ان کے لیے چمکتی سی امید تھی، کیوں کہ کمرے سے باہر کی روشنی، روشنی جیسی تو تھی پر روشنی ہرگز نہ تھی۔ کمرے کی تیرہ بختی سے کہیں زیادہ بد بختیاں کمرے کے باہر کھڑی تھیں۔ خموشی، سناٹا، سکڑن، سیلن، شاید یہ کمرہ اپنی خستہ حالی کے سبب بیرونی عذابوں سے بچ گیا تھا۔ ورنہ اس کے بغل والا مکان خشت خشت چھنک کر ڈھیر ہو چکا تھا........

ملبے کے اوپر پہرہ لگایا گیا تھا........

"تم پتے پھینٹو میں باہر جھانک کر آتا ہوں۔"

"کھڑکی مت کھولنا، سن سے گولی اندر آ جائے گی۔"

کبھی اندر جھانک کر دیکھا نہیں۔ باہر جھانکنے سے کیا فائدہ۔"

"جب کہ اب باہر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں۔"

"جب بغل والا مکان خشت خشت ڈھیر ہو رہا تھا تب کھولی تھی کھڑکی۔"

"تب تو آنکھیں موند لی تھیں شترمرغ کی طرح۔"

"ویسے میں نے دیکھا تھا کھڑکی کھول کر۔"

"کب؟"

"جب سورج نقاب بند کیا جا رہا تھا۔ اندھیارا دھیرے دھیرے زمین پر اتر رہا تھا۔"

"شاید اسی وقت جب میں تمہاری طرف آ رہا تھا یہ جانے بغیر کہ باہر گولیوں کا پہرہ ہے! HALT کی آواز پر نہ رکتا اور دونوں ہاتھ اوپر نہ اٹھاتا تو شاید وہیں سڑک پر ڈھیر کر دیا جاتا۔"

یک بیک بجلی چلی گئی......میز نے سایوں کو جذب کر لیا۔ باہر کی سنگینی کمرے میں در آئی۔

''دروازہ بولٹ ہے نا۔''

''بولٹ ہے مگر۔''

''ادھر ادھر مت پھرو ایک ذرا سی آواز آفت ڈھا سکتی ہے۔''

''اب تو تاش بھی نہیں کھیل سکتے۔ ڈھیر سارے وقت کا ہم کیا کریں گے؟''

''بیان جاری رکھو مگر سرگوشیوں میں۔ جب دھیرے دھیرے زمین پر اندھیرا اتر رہا تھا تو........''

''تو میرے کانوں کو محسوس ہوا دور کہیں دور ایک آواز گشت کر رہی ہے۔''

''کیسی آواز تھی۔''

''اذان تھی شاید جو میلوں میل گشت کرتی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔'' ''پھر!''

''پھر میں نے دیکھا بغل والے منہدم مکان کے ملبے سے لہولہان لوگ سر پر ٹوپیاں رکھے باہر آرہے ہیں۔''

''کیا اس مکان کے مکین ملبے میں دب کر مرے نہیں؟''

زندگی اور موت کا پتا نہیں۔ ان کے چہروں کی بے خوفی زندگی کی تھی یا موت کی میں طے نہیں کر پایا۔''

پھر کوئی شئے ادھر سے ادھر ہوئی۔ ٹھک سے کسی چیز کے گرنے کی آواز ملی۔ تینوں سہم کر چپ ہو گئے۔ شاید شلف سے باہر نکلی ہوئی کسی کتاب سے چمگادڑ ٹکرا گئی تھی۔

'' کچھ نہیں، کتاب گری ہے اوپر سے۔ شلف کے سارے شیشے چور ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ کوئی دن یہ ساری کتابیں گر پڑیں گی زمین پر، تب کیا ہوگا مسٹر داہر؟''

''وہی ہوگا جو کتابوں کے آنے سے پہلے ہوا تھا۔''

''تم کہہ رہے تھے کہ ملبے سے لوگ باہر آرہے تھے۔''

''ہاں وہ باہر آرہے تھے۔ مگر آواز کی طرف روانہ ہونے سے قبل اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیتے۔ کرفیو میں ایسا نہ کرنے سے گولی ماردی جاتی ہے۔''

داہر کی بیٹی درگا چائے کی تین پیالیاں اسی اندھیرے میں لے کر آگئی۔ شاید اسے احساس ہو چلا تھا کہ کمرے میں محبوس قاسم اور اس کا محرر اس کے بغیر بڑی بیکلی محسوس کر رہے ہوں گے۔ درگا نے اندھیرے میں بے حد احتیاط کے ساتھ تینوں چائے کی پیالیاں بڑھائیں مگر

چائے انھیں یاد ہی نہ تھی، بیان جاری تھا۔

''پھر میں نے بہت غور سے آواز سنی، اذان تھی وہ آواز۔ دونوں ہاتھ اٹھائے لوگ قطاروں میں آواز کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔''

''بڑا عجیب منظر تھا۔''

''عجیب منظر۔ مجھے نہ جانے کتنے منظر، کتنے لوگ نظر آئے سب لہولہان۔ مگر رواں۔''

''تم دیکھ کر، ہم دونوں سن کر حیران ہیں۔ کیا اب بھی باہر یہی منظر ہوگا۔''

''مجھے یقین ہے کہ اب بھی باہر یہی منظر ہوگا۔ جب تک جائے نماز نہ مل جائے یہ لوگ ملبوں سے لہو میں ڈوبے نکلتے رہیں گے۔''

''مگر ہم نے کھڑکیاں بند کر لیں ہیں۔ ہم گوشۂ عافیت میں پڑے ہیں۔'' ''جاؤ ذرا کھڑکی کھولو اور سنو، کیا آواز اب بھی آرہی ہے؟''

''نہیں کھڑکی کی طرف مت جاؤ ورنہ یہ مکان بھی ملبے میں بدل جائے گا۔''

''مگر ملبے سے ہی تو زندہ لوگ برآمد ہوتے ہیں، صالحین نے جو کچھ کہا، تم نے سنا نہیں۔''

''کیوں نہ ہم بھی............''

''داہر ہم بھی اس آواز کی طرف روانہ ہونا چاہیں گے۔ شاید ہمیں بھی نماز مل جائے۔''

''مگر جانے سے پہلے ہمیں داہر کے کمرے سے چمگادڑ کو بھگا دینا ہوگا ورنہ یہ ساری کتابیں زمین پر گرا دیں گی۔''

''اندھیرے میں چمگادڑ کی خوب سوجھی۔''

''اسلاف کی چھوڑی ہوئی کتابیں چمگادڑیں زمین پر گرا دیں۔ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کتابیں چمگادڑوں سے برباد نہیں ہوتیں بھائی۔''

قاسم اور اس کا محرر، صالحین دونوں داہر کے ہاتھوں کو چھو کر باہر جانے کی اجازت طلب کرنے لگے، داہر نے دونوں کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''باہر کرفیو سخت ہے، ڈھیل ملتے ہی چلے جانا۔''

''اب کبھی ڈھیل نہیں ملے گی، لوگ ملبوں سے نکل کر جا رہے ہیں، ہمیں بھی نماز ادا کرنی ہے۔''

داہر نے بدقت تمام انھیں جانے کی اجازت دے دی، دروازے کا بولٹ کھول کر دونوں دھیرے دھیرے باہر آئے۔ باہر پھیکی پھیکی روشنی تھی، کرخت آواز ابھری۔

''ہاتھ اوپر۔''

دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اسی آواز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہر دو چار مکانوں کے بعد انہیں ملبے نظر آئے اور ان ملبوں سے لہولہان لوگ نکلتے نظر آئے، جہاں کہیں سے بھی اذان کی آواز آ رہی تھی وہاں مسجد ضرور ہوگی۔ ہزار ہا پل بیتتے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھائے اٹھائے کتنا لمبا سفر طے کیا۔ مگر ایک نقطہ بھی آیا جہاں انھیں آواز کا آخری سرا مل گیا۔ لوگ نماز کے لیے با جماعت کھڑے تھے اور سب کے ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔

وہ دونوں بھی جماعت میں کھڑے ہو گئے مگر انھیں حیرت اس وقت ہوئی جب ان کے ہاتھ بھی اوپر سے نیچے نہ آ سکے۔۔۔۔۔۔

OO

ایک جھوٹی/ سچّی کہانی

سلام بن رزاق

میرے بیٹے نے حسب معمول اُس رات بھی کہانی کی فرمائش کی۔ میں کافی تھکا ہوا تھا۔ تس پر ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہوئی خبروں نے دل و دماغ کو اور بھی پژمردہ کر دیا۔ لگتا تھا پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے۔ اک ذرا سا ماچس دکھانے کی دیر ہے، بس۔ کیا انسان دورِ وحشت کی طرف لوٹ رہا ہے؟ دل بے چین اور دماغ پراگندہ تھا۔ میں نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا۔

''آج نہیں بیٹا! آج پاپا بہت تھک گئے ہیں، کل سنائیں گے ہم تمہیں ایک اچھی کہانی۔''

''نہیں، ہم تو آج ہی سنیں گے۔'' اس نے ضد کی۔

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔'' میں نے پھر سمجھایا۔

''بس ایک چھوٹی سی کہانی........ایک دم اِتّی سی۔'' اس نے انگلی کے پور پر انگوٹھا رکھتے ہوئے 'اتّی سی' کی صراحت کی۔

اس کی اس معصوم ادا پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے تھک ہار کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کہانی سنائیں گے، مگر تم بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھو گے؟''

''نہیں پوچھوں گا۔''

''ہم تمہیں آج وہ کہانی سناتے ہیں جو تمہارے دادا جان نے ہمیں سنائی تھی۔''

''آہا......'' اس نے خوش ہوتے ہوئے نعرہ لگایا۔

''پرانے زمانے کی بات ہے......'' میں نے کہانی شروع کی۔

''کتنی پُرانی؟'' وہ بیچ میں بول پڑا۔

''اوں ہوں......میں نے کہا تھا نا تم کوئی سوال......''

''اوہو......سوری پاپا......!''

اس نے کسمساتے ہوئے معافی مانگی۔

''ویسے بات بہت پرانی بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہی کوئی پچاس برس ہوئے ہوں گے......یا ہوسکتا ہے سو دو سو برس پرانی ہو......زیادہ سے زیادہ ہزار بارہ سو برس پرانی ہو سکتی ہے یا پھر اس سے بھی زیادہ......کہتے ہیں اس اونچی پہاڑی کے پیچھے ایک بستی تھی۔ بستی البتہ سچ مچ بہت پرانی تھی، ہزاروں برس پرانی......

بستی میں اونچے اونچے مکان تھے، مکانوں میں بڑے بڑے دروازے اور چوڑی چوڑی کھڑکیاں تھیں، روشن اور کشادہ کمرے تھے، جہاں صبح و شام ہوا اٹھکھیلیاں کرتی گزرتی، مکانوں کے آنگنوں میں پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں، جن میں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے اور ہواؤں میں ہر دم بھینی بھینی خوشبو رچی رہتی تھی، بستی کے باہر باغات کا سلسلہ تھا، جن میں طرح طرح کے پھل اور پیڑ تھے، پیڑوں پر قسم قسم کے پرندوں کے گھونسلے تھے، پرندے صبح شام چہچہاتے رہتے، ان کی چہکار سے فضا میں موسیقی سی گھلتی رہتی، بستی کے پاس سے ایک ندی گزرتی تھی جس سے آس پاس کی زمین سیراب ہوتی رہتی، انسان تو انسان ڈھور ڈنگر تک کو دانے چارے کی کمی نہیں تھی، کوئی موسم ہو، کھیتوں میں اناج کے خوشے جھومتے رہتے اور گایوں کے تھن ہمیشہ دودھ سے بھرے رہتے۔

بستی کے لوگ بڑے خوش مزاج، ملنسار اور امن پسند تھے، مرد دن بھر کھیت، کھلیانوں اور باغوں میں کام کرتے، مویشی چراتے، دودھ دوہتے اور عورتیں چولہا چکّی سنبھالتیں۔ خالی وقت میں وہ ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے، دعوتوں میں لذیذ کھانے کھاتے، عمدہ مشروب پیتے، جھومتے گاتے اور رقص کرتے۔ بوڑھے اطمینان سے مونچھوں کے نیچے مسکراتے، گردنیں ہلاتے رہتے، گرہستنیں اپنے جمّانوں پر واری جاتیں اور کنوارے کنواریاں ایک دوسرے سے ہنسی ٹھٹھول کرتے اور کبھی کبھی ہنسی ہنسی میں ایک دوسرے کو زندگی بھر کے لیے جیون ساتھی چن

لیتے۔ ان میں جوشہ زور تھے کشتیاں لڑتے، لاٹھی بلم کھیلتے، مصور تصویریں بناتے اور شاعر گیت گاتے تھے، خوشیاں روز اس بستی کا طواف کرتیں اور غم بھولے سے بھی اُدھر کا رخ نہ کرتے۔

کہتے ہیں بستی کے پاس ہی ایک گھنے پیڑ پر ایک پری رہتی تھی۔ ننھی منی، موہنی صورت اور معصوم سیرت والی، گلابی آنکھوں اور شہابی ہونٹوں والی، سنہرے بالوں اور سرخ گالوں والی پری۔ پری گاؤں والوں پر بہت مہربان تھی۔ وہ اکثر اپنے چمکدار پروں کے ساتھ اڑتی ہوئی آتی اور ان کے روتے ہوئے بچوں کو گدگدا کر ہنسا دیتی۔ لڑکیوں کے ساتھ ساون کے جھولے جھولتی، آنکھ مچولی کھیلتی، لڑکے بالوں کے ساتھ پیڑوں پر چڑھتی، ندی میں تیرتی، کبھی کسی کے کھلیان کو اناجوں سے بھر دیتی، کبھی کسی کے آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلا دیتی۔ شادی بیاہ، تیج تہوار، میلے ٹھیلے یہاں تک کہ موت مٹی میں وہ ہر جگہ، ہر موقع پر ان کے ساتھ رہتی۔ بستی والے بھی اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اگر وہ ایک دن بھی انھیں دکھائی نہیں دیتی تو وہ بے چین ہو جاتے۔

دن گزرتے رہے۔ وقت کا پرندہ کالے سفید پروں کے ساتھ اڑتا رہا اور موسم کا بہروپیا نت نئے روپ بدلتا رہا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ایک دن کسی نے ان کے کھیتوں میں شرارت کا ہل چلا دیا۔ بس، اس دن سے ان کے کھیت تو پھیلتے گئے مگر دل سکڑنے لگے۔ گودام اناجوں سے بھر گئے مگر نیتوں میں کھوٹ پیدا ہو گئی۔ اب وہ اپنی مقررہ زمینوں کے علاوہ دوسروں کی زمینوں پر بھی نظر رکھنے لگے۔ نتیجے کے طور پر ان کے کھیتوں میں بدکرداری کی فصل اگنے لگی اور درخت ریاکاری کا پھل دینے لگے۔ لالچ نے ان کے دلوں میں خودغرضی کا زہر گھول دیا تھا۔ پہلے وہ مل بانٹ کر کھاتے تھے، مل جل کر رہتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ان کی ہر چیز تقسیم ہونے لگی۔ کھیت، کھلیان، باغ، بغیچے، گھر آنگن یہاں تک کہ انھوں نے اپنی عبادت گاہیں تک آپس میں بانٹ لیں اور اپنے اپنے خداؤں کو ان میں قید کر دیا۔ ان کی آنکھوں کی مروت اور دلوں کی حمیت ہتھیلی پر جمی سرسوں کی طرح اڑ گئی، تصویروں کے رنگ اندھے اور گیتوں کے بول بہرے ہو گئے، اب نہ کوئی تصویر بناتا تھا نہ کوئی گیت گاتا تھا، ہر گھڑی ہر کوئی ایک دوسرے کو زک دینے کی فکر میں رہتا۔ آئے دن وہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔

بستی والوں کے یہ بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ننھی پری بہت دکھی ہوئی۔

وہ سوچنے لگی، آخر بستی والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں ایک دوسرے کے بیری ہو گئے ہیں؟ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

وہ اب بھی بستی میں جاتی، بچوں کو گدگداتی اور عورتوں کے ساتھ گیت گاتی......لڑکی، لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی......پیڑوں پر چڑھتی، ان کے کھیت، کھلیانوں کے چکر لگاتی، آنگنوں میں گھومتی پھرتی......مگر اب وہ سب اس کی طرف بہت کم دھیان دیتے۔

بستی والوں کی اس بے توجہی کے سبب ننھی پری اداس رہنے لگی۔ آخر اس نے بستی میں آنا جانا کم کر دیا۔ اگر کبھی جاتی بھی تو ڈری ڈری، سہمی سہمی سی رہتی اور جتنی جلد ممکن ہوتا وہاں سے لوٹ آتی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ اس نے بستی میں آنا جانا بالکل ترک کر دیا۔

بستی والے آپس کے جھگڑے ٹنٹوں میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ شروع شروع میں انھیں اس کی غیر موجودگی کا پتا تک نہیں چلا۔ مگر جب سہاگنوں کے گیت بے سرے ہو گئے اور کنواریوں نے پیڑوں کی ٹہنیوں سے جھولے اُتار لیے اور بچے کھلکھلا کر ہنسنا بھول گئے تب انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے اپنی کوئی قیمتی شئے کھو دی ہے۔ بستی والے فکر مند ہو گئے۔ اسے کہاں ڈھونڈیں، کیسے تلاش کریں؟

پہلے تو انھوں نے اسے اپنے گھروں اور آنگنوں میں تلاش کیا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ پھر انھوں نے اسے کھیت، کھلیان اور باغ بغیچوں میں ڈھونڈا......وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ ندی کے کنارے گئے، میدانوں میں بھٹکے، پیڑوں اور گپھاؤں میں دیکھا، مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ اب ان کی تشویش بڑھنے لگی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ مل بیٹھ کر سر جوڑ کر اس کے بارے میں سوچتے، وہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے کہ پری ان کی وجہ سے روٹھ گئی ہے۔ اب تو وہ ایک دوسرے سے اور بھی بدگمان ہو گئے۔ ان کے دلوں کی نفرت اور بھی گہری ہو گئی۔

اب انھوں نے ایک دوسرے کے کھیت کھلیانوں کو پامال کرنا اور مویشیوں کو چُرانا شروع کر دیا۔ دھوکہ فریب، لوٹ مار، قتل و غارت گری روز کا معمول بن گیا......اب نہ کسی کا جان و مال محفوظ تھا، نہ کسی کی عزت و آبرو سلامت تھی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا، بوڑھے اپنے گھر کی چہار دیواریوں میں بیٹھے گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے رہتے اور جوان تلواریں اور نیزے لیے ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے رہتے۔ کوئی تلوار سے کسی کا سر قلم کر دیتا، کوئی نیزے سے کسی کا سینہ چھید دیتا۔ معصوم انسانوں کے لیے روز بروز زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تب بستی والوں نے طے کیا کہ اس روز روز کے قضیے سے بہتر ہے اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ وہ جان گئے تھے کہ جب تک کسی ایک فریق کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، دوسرے کو راحت نہیں مل سکتی۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دشمن کو ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اس فیصلے کے بعد وہ دو گروہ میں بٹ گئے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو گھروں میں بند کر دیا گیا اور سارے جوان ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں لیے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ان کی مٹھیاں نیزوں اور تلواروں کے دستوں اور قبضوں پر مضبوطی سے کسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حریف کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کو تیار کھڑے تھے۔

تبھی ایک انہونی ہو گئی، فضا میں ایک مہین سا سُر بلند ہوا۔ جیسے کسی پرندے کا ملائم پر ہوا میں لرز رہا ہو......... کوئی گا رہا تھا۔

انھوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ پہلے تو انھیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مگر جب انھوں نے بہت دھیان سے دیکھا تو انھیں ننھی پری ایک پیڑ کی ڈال پر بیٹھی دکھائی دی۔ مگر آج اس کا روپ بدلا ہوا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے اور گال آنسوؤں سے تر تھے، پَر نُچے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے، جیسے وہ گھنی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزر کر آ رہی ہو، اس کے پاؤں ننگے اور تلوے زخمی تھے۔ وہ پیڑ سے اُتر کر میدان کے بیچ میں آ کر کھڑی ہو گئی، اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر رکھے تھے جیسے انھیں ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے روکنا چاہتی ہو۔

تلواروں کے دستوں اور نیزوں پر کسی ہوئی مٹھیاں قدرے ڈھیلی ہوئیں۔

وہ گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ ان کے سینوں میں دل تڑپ اٹھے۔ وہ گا رہی تھی۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی گئی، بلند ہوتی گئی، اتنی بلند جیسے ستاروں کو چھونے لگی ہو، اس کی آواز چاروں دِشاؤں میں پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی، پھیلتی گئی، اتنی پھیلی کہ چاروں دِشائیں اس کی آواز کی بازگشت سے گونجنے لگیں۔ لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، منھ کھولے اس کا گیت سنتے رہے، سنتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں میں دبی تلواریں پھولوں کی چھڑیوں میں تبدیل ہو گئیں اور نیزے مور چھل بن گئے۔

انھوں نے محسوس کیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پگھل رہی ہے اور ان کے

دلوں کی کدورت آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ رہی ہے۔ پچھتاوے اور شرمندگی سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ گیت کے بول ان کے کانوں میں رس گھولتے رہے اور دھیرے دھیرے وہ سب ایک دوسرے سے ایک اَن دیکھی، اَن جان ڈور سے بندھتے چلے گئے، جیسے وہ سب ایک ہی مالا کے موتی ہوں، جیسے وہ سب ایک ہی ماں کے جائے ہوں۔

اُدھر گیت ختم ہوا اور وہ اپنی آستینوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

جب اشکوں کا غبار کم ہوا تو انھوں نے اپنی محسن کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بستی والوں نے اسے بہت ڈھونڈا، وادی وادی، جنگل جنگل آواز دی، منتیں کیں، واسطے دیے...... مگر وہ دوبارہ ظاہر نہیں ہوئی۔ تب بستی والوں نے اس کی یاد میں ایک مجسمہ بنایا، اسے بستی کے بیچوں بیچ میدان میں نصب کر دیا۔

کہتے ہیں آج بھی بستی کے لوگوں میں جب کوئی تنازعہ ہوتا ہے، سب میدان میں اس مجسمے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس گیت کو دہرانے لگتے ہیں۔ گیت کے ختم ہوتے ہوتے ان کے دل کی سلیٹیں دوبارہ اُجلی اور صاف ہو جاتی ہیں، جیسے بارش کی پہلی پھوار سے پیڑوں کے پھول پتے دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح بستی والے آج بھی اس گیت کی بدولت بڑے امن اور چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں...... جیسے ان کے دن پھرے، خدا ہم سب کے بھی دن پھیر دے۔‘‘

میں نے کہانی ختم کر کے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا، چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

’’چلو اب سو جاؤ، کہانی ختم ہو چکی ہے۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’پاپا! آپ نے کہا تھا، کہانی سناتے وقت بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھنا۔‘‘

’’ہاں...... میں نے کہا تھا اور تم نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ تم بڑے اچھے بچے ہو۔ چلو، سو جاؤ۔‘‘

’’مگر پاپا! کہانی تو ختم ہو گئی۔ میں اب تو سوال پوچھ سکتا ہوں نا......؟

میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولا ’’چلو پوچھو..... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟‘‘

''پاپا! وہ کون سا گیت تھا، جسے سن کر گاؤں والے دوبارہ گلے ملنے پر مجبور ہو گئے۔''
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا۔ ''مجھے وہ گیت یاد نہیں ہے بیٹا۔''
''کیوں پاپا! آپ کو گیت کیوں یاد نہیں؟''
''کیوں کہ میرے پاپا یعنی تمہارے دادا نے بھی جب مجھے یہ کہانی سنائی تھی تو صرف کہانی سنائی تھی، گیت نہیں۔''
''آپ نے ان سے پوچھا نہیں......؟
''شاید ان کے پاپا نے بھی انھیں صرف کہانی سنائی ہو۔''
''نہیں پاپا......! میرے بیٹے نے مچلتے ہوئے کہا۔
''مجھے وہ گیت سنایئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کی کہانی ایک دم جھوٹی تھی۔''

OO

مئی دادا

اسد محمد خان

مایا کے تین ناموں کی طرح مئی دادا کے بھی تین نام تھے: مجیتا، مجید اور مئی دادا۔ مجیتا کہنے والے ان کے سامنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجید یا ارے میاں مجید کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے ان کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ 'مئی دادا' تھے۔

خود مئی دادا کا بیان تھا کہ ان کا اصل نام ابدل مزید کھاں ایسپ جئی ہے۔ چنانچہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں ان کا نام 'عبدالمجید خاں یوسف زئی' لکھا گیا۔ اگر ان کا کوئی وارث ہوتا تو لوحِ مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ ان کی وصیت یہی تھی۔ مئی دادا کے بارے میں محلے کے دھوبیوں نے اُڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھوبیوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود مئی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی میں دھوبنوں کے سلسلے میں ان سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بد جناوروں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلے میں ان کی تگ و تاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی میں مئی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ ان کی آخری محبوبہ حرمت دھوبن ۱۹۵۶ء میں ۷۰

سال کی ہو کر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے، جس میں اٹھارہ بیس برس کے منی دادا کان کی لو تک پہنچتی ہوئی لوہا چڑھی لاٹھی تھامے، تاراسی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ منی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپھا ابا کی کھینچی ہوئی ہے، جنھوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوایا تھا۔ خاندان کے اسکینڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ منی دادا، پھوپھا ابا مرحوم اور ان کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور اربابِ نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ نری خباثت تھی، پھوپھا ابا کھرے پٹھان اور حافظِ قرآن تھے اور منی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں ان کے دائرۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں، پھوپھا ابا نے انھیں ایک تمنچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو، مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر منی دادا سے اس تمنچے کا ذکر سنا ہے —— تقسیم ملک سے بہت پہلے کسی حرامی ازل گر بھتا بھان کے گھوڑے نے اسے چرا لیا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تمنچا ٹین کے ڈبے بھوسی ٹکڑے والے ختہ گگ کے بدلے میں تلوادیا ہے۔ منی دادا تمنچے کے واقعے پر بل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے۔ مگر لوگوں نے سمجھایا کہ غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائسنس کا ہتھیار تھا، اُلٹے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ مجبوری تھی۔ منی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تمنچا کس سالے کے کنے ہے۔ آنتیں نکال کے اس ازل گر بھتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنا دوں گا۔

آنتیں نکال کے گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور 'اجل گرفتہ' انھوں نے میرے بچا سے سنا تھا، جو اس زمانے میں زور زور سے 'طلسمِ ہوش ربا' پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

منی دادا کا خیال تھا کہ "یہ یو، طلسمِ ہوش ربا اور قصہ طوطا مینا اور انوار سہیلی وغیرہ ہیں، یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو 'نامرد' بنا دیتی ہے...... یہ لفظ وہ بزدل

کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور اکثر بڑے تاسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے، اس خاندان کے لوگوں نے کوئی 'کتل' ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انھیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے، کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے باوا علی گڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں، پہلے ایسے نہیں تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے۔ ''بلاوجے''۔

مگر یہ طے تھا کہ ابا کو اور ہم سب بہن بھائیوں کو ان سے جتنی محبت ملتی تھی، دوسروں کو اس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کٹب قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کٹب قبیلے کے 'ساکھ بجر' کا ماسٹر ہوں اور یہ کہ 'ایسا چاروں کھونٹ ساکھ بجر' میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ 'ساکھ بجر' سے ان کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر 'چاروں کھونٹ ساکھ بجر' کیا ہوتا ہے، یہ نہ میں نے کبھی پوچھا، نہ انھوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کٹب کی حد تک مٹی دادا علمِ اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریق کار یہ تھا کہ جوں ہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہوا، اس کا دادا، تایا، باپ یا چچا اسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی تھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھالو سنبھال کے اس کی سو نقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے تھے۔ پنسل، فاؤنٹین پین، فولادی نب وغیرہ سے پُرکھوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مداخلت فی الدین سمجھی جاتی تھی۔ انھیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے۔ مگر یہ ایک طے شدہ طریق کار بلکہ پیدائشی جبر تھا، جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اس دور کا پیٹری آرک، لمڈوں کا بڑا گران کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قل سننے کے بعد پہلے اس لڑکے کی مین لائن، پھر برانچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیہ کلدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں بھول جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ مہینوں تک فلاں محمد خاں کے بیٹے فلاں محمد خاں اور ان کے بیٹے فلاں محمد خاں خوابوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرتے تھے۔ انھیں

بھول کون سکتا تھا؟

دوسرے پیٹری آرکوں کے برخلاف میرے دادالمدّ وں کی بدخطی کو نظر انداز فرماتے تھے۔ مگر لنڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے ان محمد خاں کے بیٹے ان محمد خاں کی بجائے وہ دوسرے، محمد خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ 'سور، مرے نگوڑسگو دادا کو ولد الحرام بتا رہا ہے! اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے، ہم درست کیے لیتے ہیں...... مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کے یہاں یہ شدت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زاد بوم سے ہزار میل دور اور سیکڑوں برس کے بعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بھول چکا تھا، کاغذوں پر اپنے نسب کے تحفظ کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے۔ معاذ اللہ۔ آلِ رسول سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سست کہہ دینا!...... اس بے ہودگی کا تصور ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ نرینہ کی طرح اس اذیت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالم گیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بھگتانا بہ ظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر ان زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ چنانچہ میں چیں بول گیا، مثلاً فلاں محمد خاں کے پانچ بیٹے، ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس انتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دو لاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور ان کے اتنے اتنے نونہال...... اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ بیٹا ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کر لو۔

اور یہاں سے ایک تہہ دار عذاب مزید شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا۔ کیوں کہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں، وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے، ذرا دور کے رشتے سے، ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں...... کئی ہزار کاغذوں پر اسی

طرح لکھا ہے۔ اور اب جو یہ صاحب میری پھوپھی کی صاحب زادی سے شادی کرنے پر تلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخِ شجر، جدول پانچ کے حساب سے دیکھو، تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں مٹی دادا خدا کے بروقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سلجھاتے اور ہمت بندھاتے۔

خود ان کے شجرۂ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہوگا تو دھوبیوں کی اڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ مٹی دادا اس بارے میں بہت حسّاس ہیں، ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں ہوگا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ ''مجید! تُو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے، خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟'' تو اتنی ہی خوش مزاجی سے بولے، ''ہاں بیا! کیوں نہیں۔ سنو، سمسیر ابنے سمسیر اپنے ابدل مزید کھاں ایپ جیٔ۔'' اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ درّانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی انھیں چچا نے ہی سنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے ان کی جو حیثیت تھی، اگر اسے کسی ایک دولفظی اصطلاح میں بیان کیا جا سکتا تو وہ اصطلاح تھی 'ماہرِ پشتونیات' کی۔ وہ ہمارے لیے 'پٹھان ساگا' کے عالم تھے۔ مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پُرشکوہ زبانوں میں سے ایک ہے، کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دغا دار روڑا دا پستہ دا بادام روڑا دا ہینگ، اور یہ ہمیں بہت شان دار لگتا تھا کہ ہمارے پُرکھے ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں در آئے تھے اور انھوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلانِ کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہوگا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کنبہ قبیلے والوں میں شاید میں ہی سب سے زیادہ پُرتخیل واقع ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے، منھ کھولے، مٹی دادا کا بولا ہوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا اور جب میری عمر کے دوسرے لڑکے پتنگیں اڑاتے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے، میں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، اپنے پشتون اجداد سے ڈھائی تین سو سال پرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول مٹی

دادا، درہ خیبر میں ''ڈنڈم ڈنڈا اور تلوارم تلوار'' کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا ہے کہ میں کاٹھ کباڑ والے تاریک کمروں میں گھس جاتا، یا تل گھروں میں اتر جاتا یا دھادوں پر چڑھ جاتا اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اسے اپنے طور پر صیقل کرتا۔ کبھی کوئی پوری تلوار، کٹار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر ہل یا ہنسیے یا پاسے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہوگئی ہوتی، تو اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جواب ہل یا ہنسیے یا پاسے کی شکل ہوگئی ہے، یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک 'عدم استعمال' یا 'غلط استعمال' نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے اندر کے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں بہن بھائیوں کے روبہ رو ناٹک کیا کرتا تھا۔ پر دادا کی کام دار مخمل کی پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے مٹی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ مٹی دادا کو یہ ناٹک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے، کیونکہ ان کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۴۷-۴۶ء کے پُر آشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت کر کے ہمارے شہر آرہے تھے، کیوں کہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہوگا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ مٹی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھیر گھار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انھیں باڑے میں بٹھا کر ابا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتہ نہیں کس طرح ابا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کنبوں کو باڑے میں کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں! ان کے لیے بھی جگہ نکالیے۔ پھر مٹی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں، صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لا لا کر تختے نکالے اور جگہ کر، باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔ اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں، تلواریں بنانا شروع کر دیں۔ پہلا زنبیہ مٹی دادا کے لیے تخلیق ہوا، جس کے نیام پر لناں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھا گیا اور مرحوم تیغچے کے بعد مٹی دادا ایک

اصل نسل زنبیے کے مالک بن گئے۔ تمنچے کی گم شدگی اور زنبیے کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار مئی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے۔ ''یہ تو تمنچا غایب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلیت ہوئے گی۔ کیا پتا میں غصے میں کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں جھونک دیتا۔ بلا وجہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پُلیس کچیری ہوتی پھرتی۔'' کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ مئی دادا تمنچا لے لینے اور زنبیہ دینے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں زنبیہ اُتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسے اور زنبیے کے مخملیں نیام کو تھپکنے لگے۔ ''ابے، کیا کھوجی کج لیا ہے؟''

رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہتے تھے، ''گورے سب... تیا ہوتے ہیں۔''

یہی وہ زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چند انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھار دار آلے کے لائسنسوں کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد۔ اور لائسنس کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی ''جیادتی'' کی بات تھی، مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ مئی دادا نے اماں کی خوشامد کر کرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور مئی دادا کا کام بن گیا۔ زنبیے کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ مئی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہتے، مگر انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کا زنبیہ اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے مئی دادا سے تقریباً حلف اٹھوا لیا تھا کہ وہ کسی کو اس زنبیے سے دھمکائیں گے نہیں۔ ''ناہیں میاں! جیسی چاہے کسم لے لو، میں کسی ازل گر پھتا بھان کے......''

مئی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپھاؤں، خالوؤں کے اور اماں کے نام کی بندوقوں، رائفلوں، تیغوں، تلواروں، خنجروں، کٹاروں، کرچوں کے لائسنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سُنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاح محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ توپیں چڑھی رہتی تھیں۔ ''مزال

تھی کوئی ازل گر پھتا پٹھان کا گھوڑا نجر بھی ڈال کر دخ سکتا۔'' اور فلاح محمد خاں بھی اگر چہ گدی نشین نہیں تھے مگر ''ون کے کنے سوکھے سوتر واریں تھیں۔'' وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، زنبیے، کٹاریں، کھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔''

ابا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا، ہتھیار دیکھ دیکھ کر اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیے جائیں۔ ممی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہم خیال کیا اور ابا کو مشورہ دیا کہ لائسنس والے ہتھیار بے شک جمع کر دیے جائیں مگر کونوں کھدروں، تل گھروں میں دھاودں پر اور دیواروں میں پُرکھوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں، ان کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے، سو ان کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

ابا علی گیرین تھے، اصول پرست آدمی تھے۔ انھیں حکومت کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ سو پچاس برس کے دفن کیے ہوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے۔ پھر اس تردِ بے جا سے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ ممی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ ان کے گرد و پیش اور ہمارے دوہرے دالانوں، دھاودں، تل گھروں، زینوں میں ایک پُر اسرار گرمی جاری ہے، جس کا ابا کو کوئی پتہ نہیں۔

لائسنس دار اسلحے جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کنبہ قبیلے کے دو چار بڑے اور ممی دادا ہتھیار لاد کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ ممی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نیہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا، اپنے کسی خون کے رشتے دار کو مٹی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دکھ اتنا گہرا تھا کہ آج مغلظات بھی نہیں سنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے گئے تو ممی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا ہے، کوتوالی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مغلظات سے شغل ہے۔ ہاں، ہاں! کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ ممی دادا ایسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی حیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے

کے ہی سہی، پٹھان تھے........وردیوں کے نرغے میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

امّاں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سروتا مار مار کر بھائی کو حکم دیا کہ ابھی اسی وقت مٹی دادا کو گھر آجانا چاہیے۔ میاں......آج ہمارے پشتینی اہلکار کو........ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے، تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی؟ آئیں! اس روز میری امّاں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکتؔ کی پوتی تھیں۔ ایک جید نواب زادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طاقتِ لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر ''منجھلی آپا! پتہ تو چلے کہ اسے کیوں بند کیا گیا ہے......سنیے تو......میں بھیجتا ہوں کسی کو........آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔'' مگر امّاں چٹان کی طرح ان کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیاں کترتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انھیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد مٹی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے۔ اور کوئی دو درجن میرزائی جیلوں کو اپنی روداد سنا رہے تھے۔ ''اجل گرفتہ'' اور وہ دوسری بات ہٹا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام، جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ مٹی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشتر کہ بد قسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھاکر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمزدگیاں یہ کیں کہ انھیں 'بڑے میاں' کہہ کر مخاطب کیا اور چپراسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ مٹی دادا ایک طرف کھڑے اسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کی آخری اور ناقابلِ معافی بد معاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک ''بوم'' کے ساتھ اڑ گیا، یہ تھی کہ اس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اٹھا لیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اس سے اپنی پنسل چھیلنے لگا۔

یہ نواب غوث محمد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا، جس کا قبضہ سنگِ یشب کا تھا،

جس پر سنگ تراش نے پھول پتیوں کے نقش کچھ اس طرح ابھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں۔ پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خلد آشیانی پُر کھے کا نام نامی درج تھا اور فارسی زبان میں خبر دی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاری گر نے بطورِ خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر روبہ رو شیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو، پہلی بات تو یہ کہ سکھیا رام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث خاں بہادر جنت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔ مئی دادا نے ''ازل گر پھتا'' یا ''بھان کے'' کہہ کر جو ایک زناٹے کا تھپڑ مارا تو حوالدار سکھیا کی بیڑی اور پنسل دور جا پڑی۔ پھر انھوں نے اس تیلی کے پودے کو اطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے...... تیری ترکاری کاٹنے والی چھری نہیں ہے۔ اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تو بھان کے گھوڑے، اس سے پنسل چھیلتا ہے، اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد مئی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اپ میں منتقل کر دیا گیا۔

کوتوالی انچارج بڑے چکر میں تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو، جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا، ایک سویلین نے زدوکوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہوئی تھی۔ ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدی پر بیٹھا مقدور بھر فرماں روائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایک ہزار سے زائد منبروں سے ابھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ ''خلد اللہ ملکہ و سلطانہ......'' ہر چند کہ ریاستی پرچم کا مستول ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دلی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کر دی جائے گی۔

تو نواب کے خوش حال، نیم خوش حال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ اور مہذب، نیم مہذب مگر با اثر کنبے قبیلے کے معززین اور ذرا کم معزز، کئی سو پٹھان کوتوالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انھوں نے علی گڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ مخواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر، بڑے پیار

سے، اپنے اس ماتحت افسر کو قائل کر لیا کہ یہ غنڈا گردی اور فوج داری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاہٹ اور مجروح انا کا مسئلہ ہے۔ کوتوالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بے وقوف، غیر سیاہی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حوالدار سکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہر گاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت، نادر اور تاریخی اہمیت کے حامل ہتھیار کو، کہ جو تمہاری تحویل میں تھا وغیرہ وغیرہ...... سکھیا رام کو لائن حاضر کر دیا گیا۔

ابا نے مئی دادا کو آرام کرنے کے لیے زمینوں پر بھیج دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ مئی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر ابا ان سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی اور مئی دادا کو پہلی بار ہمارے ڈیوڑھی سے کچھ دور چھاؤنی چھانا پڑی۔ ہوا یوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اس کا تعلق کسی مارنے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق، داماد کو لے جایا گیا کہ وہ مئی دادا کو سلام کرے اور مئی دادا اسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اس وقت موجود نہیں تھا، اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا کر رسم پوری کرائیں۔ مئی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر انھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر 'پشتونیات' کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منھ کھولے مئی دادا کے انکشافات سنتا رہا۔ 'ساکھ بجر' پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد مئی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میر زئی خیل بڑے جیوٹ والے کٹمب ہیں، خونخوار اتنے کہ ''مزال'' ہے کوئی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے، اور یہ کہ جو چالیس بیالیس گھر اس محلے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر گھر نے دوسرے گھر ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا 'رفل' کے گزر سکتا

ہے۔ اگر محلے کے اس سرے پر میرزائی خیلوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو 'دس منٹ' میں اس سرے سے اس سرے تک، سو سوا سو مسلح پٹھان بچے صورتِ حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو تہس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کوتوال کو مع اس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے۔ تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانوں کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں میل محبت بھی رہتی ہے۔ اس کی مثال منی دادا نے یوں دی کہ یہ جو اپنے بچو میاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلانے پردادے نے انہی کے فلانے پرنانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے، پردادے پہلے سے موجود تھے کہ پرنانے آئے۔ دونوں میں جائداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں، ڈنڈم ڈنڈا، تلوارم تلوار ابھی چلتی رہتی تھیں، کس لیے کہ شیر بچے ہیں۔ آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) اب جوان کے پرنانے ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش ان کے اس پردادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد پُرکھے کی حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا پُرکھا چمک کر اٹھا اور ''خبردار'' کہہ کر تلوار کا جو بھرپور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے پرکھے کی گردن بھٹا سی دور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینہ بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی، ہم اسے زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ منی دادا بیمار تھے، ان سے تو ابا نے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا مجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے؟ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گم صم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں، خوں خواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمہارے یہاں بات بات پر تلوارم تلوار ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا، تمہارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ولیمے کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں، تا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہو گئی۔ آخر یہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا

ہے، تو کیا اس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولا قوۃ!

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور مِمّی دادا کو وہاں فروکش ہونا پڑا۔

ڈیوڑھی سے دُوران کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ ویسے تو انھیں ہم سب گھیرے رہتے تھے مگر وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ داماد والے معاملے میں میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے ان کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناکی باڑے پر اور اس کے گرد و پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے۔ "اب مزید کھاں ایسب جنی جمین کا بوجھ بنتا جا ریا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹیم ہے۔" وہ ابا کو بلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ مِمّی دادا بہت بیمار ہیں، آ کر دیکھ لیجیے۔ ابا آئے تو جیسے مِمّی دادا کھل اٹھے۔ حکیموں ویدوں کے 'نکھسوں' پر باتیں کرتے رہے...... "ازل گرپھتا" اور "بھان کے" وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چمک دار آواز میں جیسے ابا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ میاں، وہ داماد والے معاملے میں آپ کفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابا نے کچھ ہوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مِمّی دادا کی بیماری سے، ان کی حسرت ناکی، ان کے لطیفے سنانے کے انداز سے، جو ظاہر ہے ابا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مِمّی دادا کہنے لگے۔ "میاں! ویسے تو آپ ماسے اللہ بال بچے والے ہو، بڑے میرے آگو کے بچے ہو۔ میری مصلحے تم آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ یو کہتے ہیں نا کہ داگڑ باکستن داروجے اول، تو میں نے صائب جادے کو کھبر دار کر دیا ہے کہ ہاں کھبر دار! پٹھانوں سے مالا ہے..... اب صائب جادے جیادہ کج چیں پٹاکھ نہیں کریں گے انسا اللہ۔"

ابا نے اسی دن مِمّی دادا کو ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کر دیے تو جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مِمّی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے، زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ امّاں نے ان کی محبوبہ جمرت کو ان کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آ کر منھ دھلاتی، کپڑے بدلواتی، اپنے ہاتھ سے دلیا کھلاتی، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابا نے ڈاکٹروں کو دکھایا، کئی طرح کے علاج بدلوائے مگر مِمّی دادا پھر سنبھل نہ سکے، گرتے ہی چلے گئے۔ اُن کا آدھا بستر سمیٹ دیا گیا۔ چارپائی کی بان دو طرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا اور اس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائجِ ضروری کے لیے وہ اب بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جمرت نے ان کی صفائی

ستھرائی کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ مگر وہ کنبے دار عورت تھی، رات میں نہیں رک سکتی تھی۔ راتوں میں، میں دیکھتا کہ ابا گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کم زوری آواز میں مٹی دادا کے احتجاج کرنے اور رونے کی آواز آتی۔ وہ ابا سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ اماں نے ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو مٹی دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ابا ان کے سامنے بچے تھے، بیٹوں کی طرح تھے۔ تو بیٹوں کی بات ٹھیک ہے۔ ''میں غیروں کے سامنے ڈھکا کھلا نہیں ہو سکتا۔ بیا! اس سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پہنچا دیو۔'' مگر سب جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابا، امکان بھر ان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر سب تھک چکے تھے۔

اور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو مٹی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انھیں 'ڈھکا کھلا' دیکھ لیا...... میں نے دیکھا کہ ان کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنسناہٹ مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ چھت پر گیا، باڑے میں ٹہلا، اماں کے پاس بیٹھا۔ بہت دیر آنڈے بانڈے گھومتا پھرا۔ مگر مٹی دادا بہت بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔

میں نے سنا، ان کے ٹھہر ٹھہر کر غصہ کرنے اور رونے کی کم زوری آواز آ رہی تھی۔ جمرت نے شاید انھیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

''بھان کی گھوڑی، مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے...... لڑکے کیا سوچیں گے۔'' پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''ٹھی ی ی ک ہے۔ تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔''

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔

☆

تو کیا ممّی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے؟ تو کیا محلّے کے دھوبی ٹھیک کہتے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے۔ مگر یہ بات میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ دو چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔

ان کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اس سنسناہٹوں والے دن سے برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیے ہوئے تھا، میں نے یک بارگی ابا کے سامنے رکھ دیا۔ ابا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ ممّی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر رک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے بات بتا دی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ''وہ کوئی بھی تھے، تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پردادوں کی طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ..... سمجھے! جاؤ اب کھیلو۔''

پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹ پڑے، ''اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے؟ کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟''

OO

گنبد کے کبوتر

شوکت حیات

بے ٹھکانا کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔

متواتر اڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا۔ بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔

اڑتے اڑتے ان کے بازو شل ہو گئے۔ جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔ بس ایک اُبال کی دیر تھی کہ چاروں طرف......

لیکن پڑوسیوں کے بچے بھی کم بدمعاش نہیں۔ مرغیوں کے ڈربے میں آدمی رہنے پر مجبور ہو جائیں اور مرغیاں وسیع و عریض ہال میں چہل قدمی کرنے کی سعادت حاصل کر لیں تو کئی باتوں پر نئے سرے سے غور کرنا ہوتا ہے۔ لیکن بچے تو بچے ٹھہرے۔ اپارٹمنٹ کے بچے ہوں یا عام قصباتی گلیوں اور جھونپڑپٹیوں کے بچے......

بچے بھی اتنے بے ہنگم ہوتے ہیں.... اتنا شور مچاتے ہیں...... سارے فلیٹ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن سر پر اٹھانے کے لیے شہر کے سب سے بڑے اپارٹمنٹ کا سب سے چھوٹا ون بیڈ روم یونٹ یعنی اس کا فلیٹ ہی تھا جس میں کھیل کود کی سب سے کم گنجائش تھی۔ کارپیٹ ایریا کے نام پر چند انسانوں کے سانس لینے کے لیے جسم کے ہلنے ڈلنے بھر کی جگہ دی گئی تھی۔ چاروں طرف سے بند ڈربے میں۔ بس ایک چھوٹی سی بالکنی ہی راحت پہنچاتی تھی، جس کے بڑے حصے میں متعدد گملے سجے ہوئے تھے۔ گملوں میں انواع و اقسام کے پھولوں کے پودے

لگے ہوئے تھے۔ گلاب، چنبیلی، زنّیا، گرٹن اور .... جینے کی آرزو کے استعارے ....

دن بھر کا تھکا ماندہ، ہانپتے کانپتے بغیر لفٹ کے اپارٹمنٹ کی چوتھی منزل پر پہنچ کر وہ اپنے فلیٹ کی کال بیل بجاتا: بدحواسی پورے وجود پر طاری ہوتی۔

بچے پیروں سے لپٹتے کاندھوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے۔

''تم لوگ اب تک کلچرڈ نہیں ہو سکے ......

دوسرے بچوں کو دیکھو.... سیکھو کچھ ان سے .... کس طرح نہ ہونے کی طرح ہوتے ہیں۔ یہی تو ان کی شناخت ہے ....!''

لیکن چھوٹی سی بالکنی میں آ کر بیٹھ جاؤ —— گرم گرم چائے کی ایک پیالی مل جائے اور بچے خاموش اور مصروف ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جنّت میں اس سے زیادہ لطف آئے گا بھلا..... ساری تکان دور ہو جاتی۔

اپارٹمنٹ کے کیمپس میں بڑے سے پیپل کے درخت کو بلڈر نے اپنی جگہ سالم چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ایک شاخ اس کی بالکنی تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کے اس پہاڑ کے ساتھ پیپل کے درخت کا کولاژ جدید مصوری کے شاہکار نمونے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

گوریوں کا جھنڈ چہچہاتا ہوا اپارٹمنٹ کی اس بالکنی میں منڈلاتا رہتا اور زندگی کی خوبصورتی کے گیت گاتا۔ ایک نٹ کھٹ گلہری تیزی سی آتی اور شرارت بھری آنکھوں سے اسے گھورتی ہوئی پیپل کے درخت کی ٹہنی کے راستے پیڑ پر واپس چل دیتی۔ ہواؤں کی خنکی میں سورج کی سنہری کرنوں کی گرمی من پسند دلربا اور سیم تن کی گرمی سے ذائقہ دار ہم آمیزی کا لطف دیتی۔

زندگی اتنی سفاک نہ بن.........
سب کچھ داؤں پر لگا کر تجھے حاصل کیا ہے یا ہنوز.......
تجھے پانے کی جستجو میں ہوں........
وہ دھیمے دھیمے سُر میں گنگناتا۔

وہسکی اور بیئر کو ملا دو تو اس کی تلخی دماغ کو جھنجھناتا ہوا لطف عطا کرتی ہے۔ سارا وجود ہلکا ہو کر آسمان میں اڑنے لگتا ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر زمین پر چلنے والے لوگ کتنے بونے نظر آنے لگتے ہیں۔

ہوائیں تیز چلنے لگیں۔ پیپل کے پتے ہلنے لگے۔ پیپلیا ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ گوریوں کی چہچہاہٹ معمول سے مختلف سماعتی پیکر اختیار کر رہی تھی۔

بغل والا پڑوسی کہہ رہا تھا۔

اس بار پچھلے سال والا اُبال نہیں۔ دن خیریت سے کٹ جائے گا۔ موسم ٹھیک ہے۔ جینے کی چاہت قائم ہے......آپ بھی مزے سے رہیے۔

''نو پرابلم......!''

اپارٹمنٹ کے تمام بچوں کو میرے ہی فلیٹ میں مجمع لگانا تھا۔ ان کی کوئی کانفرنس ہے کیا۔ ٹو بیڈ روم اور تھری بیڈ روم کے بڑے بڑے فلیٹ چھوڑ کر ون بیڈ روم فلیٹ میں ان کا جماؤ......ہر جگہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے......لیکن تمام چھوٹی مچھلیاں مل کر بڑی مچھلی کا روپ دھارن کر لیں تو......!''

ٹیلی ویژن آن تھا۔ پرائیویٹ چینل کے پروگرام چل رہے تھے۔ دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر خود بخود آخری ہچکی لے رہی تھیں۔

''کوئی تو سمجھائے ان بچوں کو جا کر......ناگفتہ بہ حالات میں کیا آسمان سر پر اٹھا لینے کا ارادہ ہے......کلیوں، پھولوں اور تلسی کی پتیوں، میرے گملوں پر کوئی ضرب نہ آجائے......بڑی محنت سے انھیں سینچا ہے......اجی سنتی ہو......ذرا دیکھو......اچھا چھوڑو......شریف آدمی کو تو مرنا ہی پڑتا ہے......کچھ مت کہو......بچے تو بچے ہی ہیں......پڑوسیوں کے بچے......ہمکیں گے بھی تو کس حد تک جائیں گے......!''

بغل والے فلیٹ کے ینگ مین آف سکسٹی ٹو سین دادا کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے اس نے بیوی سے بدبداتے ہوئے کہا۔ پھر ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے دور تک نکل گیا۔ دادا بول رہے تھے۔

''ہاں صاحب، گھبرانے کی بات نہیں......سب کچھ نارمل ڈھنگ سے ہو رہا ہے۔ اضطراری چیزیں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتیں۔ امن و استقامت کی راہ اپنا کر ہی ہم اور آپ چین اور سکھ کی زندگی گزار سکتے ہیں......میں تو پچھلے سال کے مقابلے میں بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ راوی چین اور راحت کی سانسیں لکھتا ہے!''

پرانے زمانے کے سین دادا اس کے ساتھ ہوتے تو اردو کے ثقیل الفاظ کچھ زیادہ ہی

استعمال کرتے تھے۔

سڑک پر گاڑیاں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ چھٹی کے دن چہل پہل کی جو کمی عام طور پر دیکھی جاتی ہے، وہ اس روز بھی تھی۔

پڑوسی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

''ارے صاحب، کیوں سوگواری کا موڈ طاری کیے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنی بالکنی اپنے پودوں اور گملوں کے تحفظ کے لیے بے چین ہیں۔

—— کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے سارے گملے خیریت سے رہیں گے۔ اب دوستوں سے ملنے چل رہے ہیں تو یوں اداس نظر آنا چھوڑیے..... انجوائے کیجیے..... دیکھیے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے اُبھار..... اُف..... سامنے کے پُرکشش منظر سے جسم میں عجب ترنگ پیدا ہو رہی ہے..... ذرا دیکھیے آپ بھی........!''

''اس عمر میں دادا آپ.......!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا دل دوسرے گنبدوں میں الجھا ہوا ہولناک کیفیات سے گزر رہا تھا۔ سین دادا نرم و گداز جسمانی گنبدوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔

''عمر کی کیا بات کرتے ہو..... ہمیشہ خود کو جوان سمجھو..... یہی زندگی ہے..... دیکھنا اور دیکھتے ہوئے ان رنگین تصویروں میں ڈوب جانا اور بار بار ڈوبنا ابھرنا.......!''

سین دادا نے پھر کہا۔

''ینگ مین، تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا..... ذرا نظر تو اٹھا،.....!''

سین دادا نے اس کے شانے پر اپنی انگلیوں کی گرفت سخت کی۔

آگے تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔

''سین دادا آپ ان فاختاؤں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اوپر دیکھیے۔ بے تھکا تا کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غائب کر دیے جانے کے بعد کیسی بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں..... ان میں اترتا خون، بیچارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر رہے ہیں......!''

سین دادا اپنی دھن میں مگن تھے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔
ان کے پاس تو پوری زمین تھی اور زمین پر آسمانی جلوے موجود تھے —— وہ ان سن رسیدہ لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں سے بیویوں کے مرجانے کے بعد شہوت کے شرارے پھوٹتے رہتے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ ایک روز جب گارڈ نے اطلاع دی کہ اپارٹمنٹ کے نیچے ایک سانپ نظر آیا ہے تو سب پر وحشت طاری ہوگئی تھی۔ پورے اپارٹمنٹ میں ریڈ الرٹ کردیا گیا تھا۔ لوگ رات بھر سو نہیں پائے۔ ادھر ادھر سے مانگ کر ڈنڈے اور لاٹھیاں جمع کرلی گئیں۔ کھڑکی دروازے سب کے سب مقفل تھے۔ آنکھیں پہرے دے رہی تھیں۔ لیکن ہر آن یہ ڈر تھا کہ روشنی گل ہوگئی یا آنکھیں لگ گئیں تو پتہ نہیں سانپ کس کو ڈس لے۔

اسے تو بس اس بات کی فکر تھی کہ اس کی بالکنی میں آنے والی گلہری اور گوریوں کا جھنڈ متوحش نہ ہوجائے۔ کہیں سانپ انھیں نہ ڈس لے۔ مبادا اس کے رنگ برنگ پھولوں والے گملوں، گلہری اور گوریوں سے جو کولاژ بنتا ہے، اس پر سیاہ بادل منڈلانے لگیں۔

وہ چپ چاپ ایک لوہے کی چھڑ لے کر اپنی بالکنی میں جاکر بیٹھ گیا۔ بالکنی میں گوریوں نے چھوٹا سا گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ چوں چوں کی آوازیں رنگین روشن فواروں کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تین سیل والی ٹارچ تھی۔ اس کی بیوی بک بک کرتی رہی۔ اسے برا بھلا کہتی رہی۔ بالکنی سے ہٹنے کی ہدایت دیتی رہی۔ اس نے طرح طرح سے اسے سانپ کے زہر سے ڈرانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی، آخرکار اسے کہنا پڑا کہ اگر بہت ڈر لگ رہا ہے تو بالکنی کے دروازے بند کرلے۔ وہ گوریوں کے گھونسلے کی حفاظت پر مامور رہے گا۔ بہت دیر تک اس کی بیوی بچے منت سماجت کرتے رہے۔ اسے خبطی اور بیوقوف قرار دیتے رہے۔ لیکن اس نے گوریوں کی ننھی سی جانوں سے لاپروائی کے لیے خود کو کسی قیمت پر آمادہ نہیں کیا۔

کسی فلیٹ میں سانپ نہیں ملا۔ تمام کونے کھدرے جھاڑے گئے۔ بکس اور کپ بورڈ کی چھان پھٹک کی گئی۔ بچے تو بچے ہی ٹھہرے کچھ دیر تک سانپ کا چکر انھیں دلچسپ تماشے کی طرح لگا۔ بڑوں کے کاموں میں وہ پوری تندہی کے ساتھ ہاتھ بٹاتے رہے۔ بعد ازاں سب کے سب تھک کر جہاں تہاں سو گئے۔ بڑے بوڑھے رات بھر جاگتے رہے اور بالآخر صبح

ہونے پر سب کے سب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک افواہ تھی جو انھیں رات بھر پریشانیوں میں مبتلا رکھنے کے لیے اڑائی گئی تھی۔ تفتیش کی گئی کہ سب سے پہلے یہ خبر کس نے اڑائی تھی۔ آخر کار اپارٹمنٹ کا گارڈ شک کے گھیرے میں آ گیا۔ سب اسی کی کرتوت ہے۔ محافظت کی ذمہ داری میں وہ گھپلا کر رہا ہے۔

صبح کی نرم و نازک ہواؤں کے ساتھ تتلیاں اُڑتی ہوئی پھولوں کی طرف آئیں۔ بھنورے پھولوں کا چکر کاٹنے لگے۔ گھونسلے سے گوریوں کے جھنڈ نے دانہ چگنے کے لیے اڑان بھری۔ سورج کی نرم کچی کرنوں نے اس کی بالکنی کو گلے لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ جینے کے جواز ابھی ختم نہیں ہوئے۔

''دادا میرا دل نہیں لگ رہا ہے.....اب واپس چلیں.....نہ معلوم میرے پھولوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ بچوں کی بھیڑ کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے.....!''

''تم خواہ مخواہ وہمی ہو گئے۔ کسی نہ کسی فلیٹ میں سب برابر اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس بار تمہارے فلیٹ کی باری ہے۔ آخر تمہارے بچے بھی تو ان میں شامل ہیں.....گھبرانے کی کیا بات ہے.....!''

''دادا میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے.....یہ بے اماں کبوتروں کا اڑتا ہوا غول دماغ میں عجیب قسم کی وحشت پیدا کر رہا ہے۔ ان کی جائے اماں ان سے چھن گئی۔ گنبدوں کی بلندی دھول چاٹ رہی ہے۔ یہ کبوتر اب کہاں جائیں دادا.....انھیں کہاں آسرا ملے گا.....؟''

''تم ینگ مین.....پازیٹو ہو کر سوچو تو ہر جگہ ٹھکانا ہی ٹھکانا ہے.....گنبد، پہاڑوں کی سفاک چوٹیاں، پتھریلے غار اور گھنے جنگل کے درختوں کی ڈالیاں.....موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے لیے تیار رہو.....یار.....یار، اپنی کھال تھوڑی کھری بناؤ.....!''

ہر طرف اندر ہی اندر مختلف آہٹیں تھیں۔۔۔۔۔

کہیں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، کہیں شہنائی پر ماتمی دھن بج رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد وہ عجیب و غریب لمحہ ایک نقطے پر منجمد ہو گیا تھا، جہاں سے بیک وقت خوشیوں اور غم کے دھارے پھوٹ رہے تھے بظاہر چاروں طرف سراسیمگی اور گبھراسناٹا تھا جو آنے والے بڑے طوفان کا نقیب معلوم ہو رہا تھا۔

سین دادا دونوں جذبوں سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان پر شہوانی جذبات حاوی تھے۔

جن دوستوں کے ہاں جا رہے تھے، ان کی عورتوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کئی جگہوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں مسٹر تھامسن کے گھر پہنچے —— مسٹر تھامسن مہمان نواز انسان تھے۔ انھوں نے جھٹ نئی بوتل نکال لی۔ گلاس سامنے رکھ دیے۔ ان کے گھر کی نوجوان خادمہ مس ریزہ بڑی پھرتی سے ہر کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

جھٹ پٹ اس نے فریج میں رکھے ہوئے گوشت کے قتلے لیے اور انھیں فرائی کر کے ان کے آگے رکھ دیا۔ گرم گوشت سے اٹھتی ہوئی بھاپ سے سین دادا کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مسٹر تھامسن پہلے ہی سے شغل میں مصروف تھے۔ ان کا نشہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ سین دادا بھی مست ہو رہے تھے۔ ان سے برداشت نہ ہوا۔ انھوں نے نیم برشت کا جوکی پلیٹ لاتی ہوئی مس ریزہ کی ننگی گرم پنڈلی پر اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں رکھ دیں۔

اس نے بڑے پیار سے سین دادا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت بھرا بوسہ دیا اور ان کا پیگ بنا کر گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی مدت کی پیاس بجھ گئی۔ دل کو قرار آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کی تڑپ اور شدت اختیار کر گئی۔ شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھ گیا —— انکی انگلیاں ایک بار پھر مس ریزہ کی برہنہ پنڈلی کو چھوتی ہوئی اس کی سڈول جانگھوں کی طرف رینگنے لگیں۔

مس ریزہ کچھ دیر مبہوت رہی۔ کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی انگلیاں اور آگے بڑھنے لگیں۔

مس ریزہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

دراصل مس ریزہ سین دادا کو دیکھ کر ماضی کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا تھا۔

''مائی لونگ ڈیر ریزہ......

لائف از این اینڈلس اسکائی......

یو ہیو ٹو گو لانگ وے......ویری لانگ......''

اس کے مشفق باپ کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب تھے۔ وہ باپ سے لپٹ گئی —— ننھے ننھے پیروں سے اس کے کندھوں پر چڑھ گئی —— مسٹر سین کے چہرے کی اس کے باپ سے مشابہت نے اسے چشم زدن میں ان کے قریب کر دیا تھا —— بعد ازاں اس کے باپ نے

تابوت میں سکونت اختیار کرلی۔ ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی پتی کی طرح کئی جگہوں سے ہوکر اسے تھامسن کے ہاں آسرا ملا تھا جو اس علاقے میں بڑا عزت دار شخص گردانا جاتا تھا —— یہاں اسے بہت دباؤ اور جبر میں ہنستے اور خوش دکھتے ہوئے خود کو تھامسن کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

اس کے لیے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا —— کئی دروازے اس نے بدلے تھے۔ ہر دروازے پر زبانیں لپلپاتے، سرخ آنکھوں والے حیوان موجود تھے: رال ٹپکاتے۔ پھر مسٹر تھامسن گیا بُرے تھے۔ صاف ستھرے خوشبودار انسان۔ ان کے لمس میں کم از کم اسے جمالیاتی طور پر کسی کراہیت کا احساس نہ ہوتا تھا —— سین دادا مس ریزہ کی ان کیفیات سے بے خبر سرشاری اور لذت یابی کی اپنی دنیا میں محو تھے۔ وفورِ جذبات سے ان کے پلکیں مندنے لگی تھیں —— مس ریزہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے نزدیک کھڑی تھی۔ نشہ کی حالت میں بھی مسٹر تھامسن نے سین دادا کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک دریا دل انسان تھے۔ شراب و کباب میں تو دوسروں کی شرکت پسند کرتے تھے، لیکن اور کسی نجی چیز میں انھیں کسی کی حصہ داری منظور نہ تھی۔

انھوں نے خشم گیں نگاہوں سے مس ریزہ کی طرف دیکھا۔ مس ریزہ جس کی آنکھوں میں سین دادا کے لیے ہمدردی امنڈ آئی تھی، تھامسن کی یہ کیفیت دیکھ کر سٹپٹا گئی اور خالی پلیٹ اٹھا کر آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر وہ نظر نہ آئی۔ یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر مسٹر تھامسن کو اسے چیخ کر بلانا پڑا۔

اس نے سوچا، اس کے اور مس ریزہ کے دُکھ میں کس کا دُکھ بڑا ہے۔ غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتروں کا غول اس کے سر پر منڈلانے لگا۔ اس نے حامی بھری اس سے بڑا غم کوئے اماں برباد کبوتروں کا ہے۔ جنھیں اب ساری عمر، ہجرت کا عذاب جھیلنا ہے...... کئی نسلوں سے وہ ان گنبدوں کے باشندے تھے..... لیکن اب......

اسے سین دادا اور مسٹر تھامسن کی مے نوشی پر غصہ آنے لگا۔ سین دادا بولتے ہیں ینگ مین غم بھلاؤ.... انجوائے کرو..... ایسے حالات میں بھلا کوئی انجوائے کرسکتا ہے........

اندرونِ خانہ سے برتنوں کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔

متوحش سی ریزہ دوڑتی ہوئی آئی۔

"انکل..... ایک کبوتر گھر کے اندر داخل ہوگیا ہے...... بغل والے پڑوسی کی بلّی اس

پر جھپٹنا چاہ رہی تھی...... کبوتر کچن میں برتنوں کے بیچ چھپ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے بلی کو بھگایا اور کچن کا دروازہ بند کر کے آ رہی ہوں.....!"

اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس نے سین دادا کی آنکھوں میں جھانکا پھر تھامسن کو دیکھا۔ نشے کی چمک ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں کبوتر کے بارے میں سن کر سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کے سر جھک گئے جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو۔

اسی وقت باہر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"مسٹر تھامسن..... مسٹر تھامسن.....!"

اداس اور سراسیمہ ریزہ نے دروازہ کھولا۔

پڑوسی مسٹر جان کھڑے تھے

"مس ریزہ..... مسٹر تھامسن کو بلاؤ!"

"کیا ہے بھائی.....!" مسٹر تھامسن نشے میں جھومتے ہوئے بھاری بھاری قدموں سے باہر آئے۔

"میرا کبوتر آپ کے یہاں آ گیا ہے..... آپ جانتے ہیں میری مدر ان لا پرانی مریض ہیں..... آج کل ان کے ہاتھوں میں سنسناہٹ رہتی ہے۔ ڈاکٹر نے کبوتر کا سوپ تجویز کیا ہے..... اسے ذبح کر ہی رہا تھا کہ اُڑ کر آپ کے یہاں چلا آیا......"

'ہاں..... ہاں...... میرے یہاں آ کر چھپ گیا ہے...... ابھی ابھی مس ریزہ نے مجھے رپورٹ دی ہے...... ایک بلی بھی ہے جو اس کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے..... مس ریزہ جاؤ..... ان کا کبوتر انھیں واپس کر دو...... آیئے..... آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں مسٹر جان..... کچھ ہو جائے جب تک.........!"

"اوہ نو تھینکس..... میں صرف ویک اینڈ میں لیتا ہوں...... دوسرے روز چھٹی رہتی ہے..... سویرے اٹھنے کا چکر نہیں ہوتا..... کمبخت کو لینے سے مجھے نیند بہت آتی ہے.....!"

ہزار اندرونی شکست و ریخت سے گزرنے کے بعد ناچار مس ریزہ کبوتر کو پکڑ کر لے آئی تھی..... لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے پورے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی۔..... مسٹر تھامسن نے اس کی آوازوں کو سنا ــــ بہت دنوں سے وہ اسے خود سے اسی طرح کی باتیں کہتے ہوئے سن رہا تھا ــــ خاموش نگاہوں سے وہ بُد بُدا رہی تھی۔

........لڑنہیں سکتا تو بھاگ جا نامراد......اُڑ جا........بستیوں سے دور وسیع آسمانوں اور جنگلوں کی طرف بھاگ.......

لیکن سہما ہوا کبوتر اس کی ہتھیلیوں میں سکڑتا سمٹتا چُھپنے کی کوشش میں مصروف تھا —— اور جب مسٹر جان نے تھینک یو.....تھینک یو........کہتے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مس ریزہ کے اندرون سے کسی نے اُچھال لگائی۔

اس منظرنامے میں اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس میں لرزش زیادہ تھی......کبوتر یا مس ریزہ میں —— یا وہ زیادہ لرز رہا تھا —— یہ کبوتر نہیں......اچانک اسے خیال آیا۔

بے اماں کبوتر......شاید ان میں سے ایک بوڑھی عورت کے ہاتھوں کو حرارت پہنچانے کے لیے مذبح کا اسیر ہوگیا......

مس ریزہ نے ہتھیلیاں ڈھیلی کردیں۔ اس کے اندر کسی نے اچھل کر جیسے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

لڑنہیں سکتے تو کم از کم بھاگ تو سکتے ہو......ہائے نامراد......تو نے یہ صلاحیت بھی کھودی......!

کبوتر اُڑا اور روشن دان پر جا کر بیٹھ گیا۔

مسٹر تھامسن نے ایک طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ بے حد غصے میں تھے۔ مس ریزہ پر سکتہ طاری ہوگیا —— تھامسن نے ٹیبل پر اسٹول رکھ کر اسے پکڑنے کا حکم دیا۔ اس کوشش میں اسٹول کھسکنے سے مس ریزہ گری —— اسے شدید چوٹیں آئیں —— سین دادا اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تب تک مسٹر تھامسن نے بڑھ کر اسے اٹھالیا تھا —— ان کے سینے سے لگی ہوئی مس ریزہ کانپ رہی تھی۔

وہ دونوں اٹھ گئے۔

''اجازت ہو مسٹر تھامسن —— آپ کی محفل میں بڑا لطف آیا........!''

''لیکن صاحب تو اتنے سوگوار ہیں کہ انھوں نے کوئی مزہ نہ لیا........!''

سین دادا نے بڑے پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ویسے کنکھیوں سے وہ مستقل کانپتی ہوئی مس ریزہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

''اس کی اداسی برحق ہے.....لیکن میرا کہنا ہے کہ خواہ مخواہ اداس ہونے کا فائدہ کیا

ہے......کوئی راستہ نکلتا تو ٹھیک تھا......آپ کے پاس لایا تھا کہ انگور کی بیٹی کے ساتھ شغل کرے گا تو بہل جائے گا۔......لیکن یہاں کبوتر اور بلی کا تماشا دیکھ کر یہ اور بھی اداس ہو گیا......
کوئی بات نہیں......اپنی اپنی قسمت ہے......آپ نے بڑی فیاضی دکھائی۔......اس گرما گرم محبت کا شکریہ......!''

رخصت ہونے سے قبل انھوں نے مس ریزہ کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا جو اس متوحش انداز میں بھی بلا کی حسین لگ رہی تھی......

''بائی بائی ریزہ......بائی مسٹر تھامسن......گڈ نائٹ......!''

اس روز کئی دوستوں کے ہاں دونوں گئے تھے۔ سب نے اس روز کے اہم ترین واقعے پر بات چیت کرنے سے گریز کیا تھا۔ لوگ دل ہی دل میں یا تو رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے۔ عجیب بے بسی اور دلی خوشی کی کیفیتیں تھیں۔ جن سے مختلف لوگ اپنے اپنے حساب سے گزر رہے تھے۔ لیکن تمام کیفیات اور بے نیازی کے باوجود ایک سوال سب کو کرید رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا......آئندہ کیا ہونے والا ہے......؟''

وہ اُوب گیا تھا۔ تھامسن کے ہاں اس نے بھی مئے نوشی کی۔ لیکن اسے نشہ آنا تو دور، ہلکا سرور تک نہ ہوا۔ رہ رہ کر اسے اپنے گملے کے پودوں، بالکنی اور بچوں کے اجتماع کا خیال آ رہا تھا۔ ایک عجیب تشویش میں وہ تمام وقت مبتلا رہا۔

اس علاقے کے تمام دوستوں کے ہاں سین دادا نے جی بھر کر انجوائے کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ گلابی نشہ پورے وجود پر طاری تھا۔ ریزہ کی لمحاتی قربت نے انھیں عجیب کیف و سرور سے سرشار کر رکھا تھا۔ پھر بھی اتنا ہوش انھیں تھا کہ ہم سفر کی چارہ جوئی کرنی ہے۔ اسے اپنے پھولوں، پودوں اور گملوں کی سالمیت کے تعلق سے ڈھارس بندھانی ہے۔ راستے بھر ان کا انداز پچکارنے اور دلارنے والا رہا۔

''گھبراؤ نہیں بچے......سب ٹھیک ہو جائے گا!''

گیٹ پر اپارٹمنٹ کے گارڈ نے ان کے داخل ہونے کے لیے رستہ چھوڑ دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر اس نے سین دادا کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ ٹکرا کر گر پڑتے۔ تیسری منزل پر بہ دقت تمام اس نے دادا کی جیب سے ان کی فلیٹ کی چابی نکال کر ان کا انٹر لاک کھولا۔ انھیں ان کے فلیٹ کے اندر داخل کیا۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ

دادانے اندر سے چٹخنی لگالی ہے، وہ اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہوا۔ اوپر کی منزل کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس کے قدم کانپ رہے تھے۔ دل ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

کال بیل بجانے پر بیوی نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی لگیں۔ جیسے بہت دیر سے روتی رہی ہو۔

''کیا حال ہے۔ میرے پھولوں کا......؟''

''خود دیکھ لو جا کر......!''

بچے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہروں پر ایسی اذیتیں جیسے کوئی بہت ڈراؤنا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں — آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا.....اس کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ بالکنی کے کھلتے ہی وہاں کے ٹوٹے پھوٹے منتشر حال زار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ نچے ہوئے پھول، موزائک کے فرش پر مسلی کچلی بکھری ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں.....ٹوٹے پھوٹے گملے......گملوں کی مٹیوں کے جا بجا ڈھیر......گوریوں کے گھونسلوں کے منتشر تنکے.....گوریوں کا کوئی پتہ نہیں تھا......گلہری، تتلیاں اور بھنورے تو اب ایک مدت تک دکھائی نہیں دیں گے......اس کی بالکنی کا سارا حسن ملیامیٹ ہو چکا تھا —

آخر بچوں نے اپنے کھیل میں میرا سب کچھ......اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اس دن اپارٹمنٹ میں گھسے سانپ کو چند بچوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس سے کھیلنے کے خطرناک عمل کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو بچے اتنے زہریلے اور وحشی ہو گئے تھے۔

آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش میں کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔

بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔

○○

گمشدہ کلمات

مرزا حامد بیگ

بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر تیر رہے تھے۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا اور دریا ایک حد تک پر سکون تھا۔

نشیب میں آبادی کے چاروں اطراف سے گرتی ہوئی پگڈنڈیاں ادھر ادھر بکھرے ہوئے آجڑیوں اور ڈھور ڈنگروں کو رفتہ رفتہ سمیٹنے لگی تھیں۔

''ہا...... ہا'' کی ڈوبتی ابھرتی آواز کے ریلوں میں چھڑی کی پھٹکار کے ساتھ دائیں بائیں طرح دے کر نکل جانے والی چست گائیں اور دودھ پیتے بچھڑے بچھڑیاں چاروں اطراف سے چوکڑیاں بھرتے بڑھے چلے آتے تھے۔ سامنے ساری آبادی میں چپ چڑانگ تھی اور پگڈنڈیوں کے ساتھ گھٹنے گھٹنے تک اوپر اٹھی ہوئی فصلوں میں ہوا سنکی ہوئی تھی۔

آج ہر طرف فیکے کا کا کی باتیں تھیں۔ اس کے نیک بختوں اور اچھے سجاؤ کی اور بیتی ہوئی کئی صدیوں کی نہ ختم ہونے والی باتیں۔ دراصل مرزا مغل بہادر کے جی میں جانے کیا آئی تھی کہ انھوں نے بڑی حویلی میں کا کا اور آبادی کے تمام مردوں کا کھانا کہہ دیا تھا۔ یہ بلا شبہ حیران کن بات تھی۔

فیکا، جس کی پہچان اس کے باپ کے حوالے سے نہیں، ماں کے حوالوں سے تھی، فیکے نے آج تک ہر چھوٹے بڑے کے پاؤں دابے اور تلوے چاٹے تھے۔ وہ سب کے ٹکڑوں پر پلا تھا اور اس کی ماں خود کہا کرتی تھی۔

''فیکے کا خمیر بھی سب کے ٹکڑوں سے اٹھا ہے۔''

آج مرزا بہادر نے فیکے کو عزت بخشی تھی۔ آپ بہادر فیکے کے چہار بیتے سننا چاہتے تھے اور بڑی حویلی میں اس انوکھی تقریب کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔

مغلوں کے حجرے میں فیکے کا کا کے گرداگرد سب جمع ہو رہے تھے اور وہ کھاٹ پر بیٹھا، سامنے کو آدھا جھکا ہوا، وقفے وقفے کے ساتھ کھانس رہا تھا۔ کسی نے اس کا موٹا کھلا کھلا دھو دیا تھا۔ پہلے اسے وہ پہنایا گیا، جس میں دھلنے کے بعد خاص طرح کی درشتی آ گئی تھی۔ کا کا کے چہرے اور ہاتھوں کی جھریاں کپڑے کی درشت شکنوں میں ایک ہو گئی تھیں۔ پھر کسی نے اس کے گلے میں زرد رنگ کا نیا دسترخوان باندھ دیا اور ہاتھ میں رکھنے کے لیے منقش ہاکی، جس پر پنیاں اور کوکے لگے ہوئے تھے، فیکے کا کا کے جڑے ہوئے گھٹنوں کے بیچ رکھ دی گئی۔ اوپر اس کا سفید سر دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ فیکا کا کا شکر گزار آنکھوں کے ساتھ ہر طرف دیکھا کیا۔ حویلی سے بلاوا آنے پر یہیں سے سب کو کا کا کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا تھا۔

باہر آدھا آسمان سرخی میں رنگ گیا تھا اور بادلوں کے رنگین بجرے ایک ہی مٹیالے رنگ میں یکجا ہو کر چھتری بن گئے۔ پھر حویلی کے سمت چلنے کا ''ہوکا'' ہوا.......کا کا کو اپنے جلو میں لیے ہوئے رک رک کر چلتا ہوا قافلہ آبادی سے نکل آیا۔ سامنے ایک کوس پرے، دریا کے چوڑے پاٹ کے عین کنارے پر حویلی ایستادہ تھی، جس کا شمالی کنارا بہت حد تک دریا کے کٹاؤ میں بیٹھ گیا تھا۔

بڑے دروازے پر مشعلیں روشن ہوتی گئیں۔ مشعلوں کے اڈتی ہوئی زردی میں مغلوں کا گھڑ دوڑ میدان خاموش تھا اور سنکی ہوئی ہوا قافلے کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلی آئی تھی۔

فیکے کا کا کے استقبال کی خاطر، مرزا بہادر حویلی کے بڑے دروازے تک خود چل کر آئے۔ تمام نگاہیں ان کے پاؤں کی کامدار جوتیوں سے اوپر نہ اٹھتی تھیں اور اوپر ''لش لش'' کرتی بھاری چادر کا گھیر تھا۔

''دشمن زیر.......خدا لمبی حیات دے۔'' سب وہیں ٹھہر گئے۔

پھر کامدار جوتیوں نے رہنمائی کی ہے؟

اسلحہ خانے کی دورویہ کوٹھریوں کی قطاروں کو عبور کر کے، اجاڑ عیش باغ کی گمنام

روشوں سے ہوتا ہوا یہ قافلہ حویلی کے مردانے تک آیا، جہاں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

گرے ہوئے کنگوروں والے فوارے کی ایک جانب دریا کی سمت کھلنے والی، بالکنی کے آگے پردا کھینچ کر مسند کے لیے جگہ بنا دی گئی تھی۔ سامنے فوارے کے گردا گرد رعیت کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

آپ بہادر نے لپک کر فیکیے کا کا کو اپنے ساتھ مسند پر گھسیٹ لیا۔ عام لوگ سامنے نشیب میں دم سادھے ہوئے تھے۔ مرزا بہادر نے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر پاٹ دار آواز میں گویا ہوئے۔

''تم سب نہیں جانتے کہ حویلی کے مردانے میں آج کتنے برسوں بعد رونق لگی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ یہ سب کیوں ہے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ حصہ جہاں ہم اس وقت بیٹھے مجلس کرتے ہیں کبھی ناچ گھر ہوا کرتا تھا۔ تمہارے دائیں ہاتھ میکدے کا ملبہ ہے اور اس کے آگے دریا کی سرکش موجیں۔ اس طرف کھلے میں عیش باغ اور اس کی گمنام راہداریاں ہیں، کبھی ان راہداریوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ فیکیے کا کا نے بڑے مغلوں کی آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں اور وہ زمانے بھی، مناسب یہی ہے کہ پہلے وہ کچھ کہیں، پھر عام روٹی ہوگی۔ کہو فیکیے جو تم نے دیکھا ہے اس کے بارے میں ہم تو محض سن پائے ہیں۔''

کا کا نے کچھ کہنا چاہا اور کہتے کہتے رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے سینے میں گہرا سانس بھرا اور بہت نحیف آواز میں گویا ہوا۔

''حضور، میں عیش باغ کی تمام گمنام راہداریوں کے نام نہیں گنوا سکتا، البتہ ان میں سے ایک گمنام میری اپنی ماں تھی۔ لوگ کہتے تھے، اس نیک بخت کے پنڈے کی کساوٹ کا چہار جانب شہرہ تھا۔ اس کے پھرتیلے انگ نے جب جوانی کی پہلی انگڑائی توڑی ہے تو خدا مغفرت کرے بڑے مرزا مغل بہادر نے اسے اکیلے میں دوسری انگڑائی نہیں لینے دی۔ اس کے پیروں کے نرم سجاؤ اسی گھر میں اپنی معصومیت گم کر بیٹھے۔ لوگ کہتے ہیں اس وقت میری ماں صرف تیرہ برس کی تھی۔ وہ اس ناچ گھر سے عیش باغ اور خلوت کدہ سے ہوتی ہوئی گھڑ دوڑ کے وسیع میدان تک پہنچ گئی۔ مغل بہادر کی تازہ گھوڑیوں نے میدان میں اتنے چکر نہیں لیے ہوں گے جتنی بار میری کمسن ماں نے رات کی تاریکی میں طویل اور اصطبلوں سے پلٹون سپاہیوں کی چھاؤنی تک کے چکر کاٹ لیے۔

اس کی لوریوں میں میرے لیے تھکاوٹ کا سمندر ٹھہر گیا تھا۔ سمندر جب بھی کروٹ لیتا تو ساری کتھا بیان کرتا۔

اس روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ دور تک اجاڑ غیر آباد میدان تھے۔ کون تھا جس نے اس لق دق سارے میں پولی کے کانٹے بیج دیے۔ وہ یقیناً مرزا مغل بہادر نہیں تھے، میری ماں کی جوانی تھی اور اس کے بدن کی کساوٹ۔

جب کانٹوں کی فصل تیار ہوئی ہے تو جانے کہاں سے فیکا بھی کانٹوں کے ساتھ پھوٹ پڑا تھا۔ اس رات بھی زور کا مینہ برسا تھا اور فیکے کی ماں کے پیروں تلے شورہ زمین پر فیکے کی جنم گاہ، حویلی کو نکل جانے والی گزرگاہ تھی۔

ہاں تو وہ پوہ ماگھ کی کوئی ٹھٹھری ہوئی رات تھی اور گزرگاہ پر فیکا اگ آیا تھا۔ یخ، سنسناتی ہوا کو اس کی جڑوں کی تلاش تھی۔ سارے میں کہرے اور کلر کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چھاؤنی میں سپاہی اور طویلوں سے ملحقہ کوٹھریوں میں جوگی آرام کی نیند سو رہے تھے۔ فیکے کو گھٹی میں شورہ ملا تھا، سر پر نیلا آسمان اور بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں، فیکے کی ماں نے یخ ہوا کی انگلی تھامی۔ ہوا جڑوں کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

فیکا بدبخت اپنی ماں کے پیچھے طویلوں، سپاہیوں کی تاریک کوٹھریوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں پنجوں ایڑیوں اور گھٹنوں کے بل چلتا رہا۔ اس کے پاؤں کے ناخن اکھڑ گئے، ایڑیاں سوج گئیں اور گھٹنوں کی ہڈیوں کے خول سرک گئے۔ جب فیکے کو ہوش آیا ہے تو طویلے کے باہر شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ وہ ماں کو چھوڑ کر ننگ دھڑنگ دوڑتا چلا گیا۔ بڑی حویلی کے باہر مغل باباؤں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ اپنی پیدائش سے ہوا کی انگلی تھامے دوڑتا آیا تھا، حضرت صاحب کے دربار کی سمت نکل گیا۔ اس نے چھوٹے مغل بہادر جو یقیناً آپ ہی تھے، کی سالھ اپنی ہتھیلیوں پر تھام رکھی تھی۔ دربار کے سامنے کیکروں کی قطار میں سبز، سرخ اور پھولدار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ وہ ٹھہر گیا، دیر تک یخ ہوا میں جھنڈوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنتا رہا۔ دور سے آپ بہادر نے پکارا تو دربار کی اوٹ میں ہو گیا۔ فیکا اس وقت تک وہاں بیٹھا رہا ہے، جب تک بابا لوگ اسے دُر پھٹ کرتے حویلی کو واپس نہ چلے گئے، پھر وہ اٹھا ہے اور اس نے کیکروں پر لہراتے ہوئے سارے جھنڈے اتار لیے ہیں۔ رنگین ریشمی کپڑوں کی نشانیاں، جن میں تانبے کے سوراخ دار پیسے، چھوٹی چھوٹی خوشیاں، امیدیں اور تمنائیں لٹک رہی تھیں، سب

اس نے اتار لیں۔

اگلے روز آبادی میں جب پہلا مرغا پھڑ پھڑایا ہے، فیکے نے آنکھ کھولی۔ وہ دربار کی چوکھٹ پر جھنڈوں کے انبار تلے سیڑھیوں کے ساتھ پڑا تھا۔ اس نے شام تک وہیں بیٹھے بیٹھے کیکر کے کانٹوں سے سب جھنڈوں کو ایک کر کے اوڑھ لیا تھا۔ اس نے سوراخ دار تانبے کا ہار بنا کر گلے میں پہنا اور دربار کی سیڑھیوں کے نیچے چھپ گیا، جہاں سے اسے کئی روز بعد ماں نے بڑی مشکلوں سے باہر نکالا تھا۔

اصطبلوں، طویلوں اور سپاہیوں کی کوٹھریوں تک وہ ماں کے پیچھے پیچھے تھا، جھنڈے اوڑھے ہوئے اور گلے میں سوراخ دار پیسوں کے ہار کھنکھناتا۔

تم میں سے کون کون ہے، جس نے اسے چاندنی راتوں میں چمکدار سالھ کے پیچھے اکیلے دوڑتے ہوئے دیکھا ہے؟ اس نے اپنے اکھڑے ہوئے ناخن، سوجی ہوئی ایڑیوں اور گھٹنوں کے سر کے ہوئے خول کو کیکر سے اتاری ہوئی نشانیوں کے ساتھ کس کر باندھ رکھا تھا۔ چاندنی راتوں میں بنجر میدانوں پر دوڑتے ہوئے وہ ہر شے سے بے پروا، بس بڑھتا چلا جاتا تھا۔

وہ کسی جوگا نہیں تھا لیکن ہاری نواری چاروں اطراف میں لہلہاتے کھیتوں کی نگرانی کرتے کرتے اوبھ گئے تھے۔ فیکے کے پاس کوئی کام نہیں تھا، ڈھور ڈنگروں کو ڈرانے کی خاطر لہلہاتے کھیتوں کے بیچ، وہ جیتا جاگتا ''بیجا'' بن گیا۔

فیکے کو کھیتوں کے بیچوں بیچ کھڑا دیکھنے بڑے مرزا مغل بہادر خود تشریف لائے۔ اس وقت فیکے کے سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ اس نے رنگین جھنڈوں کا گھٹنوں تک لمبا کرتا پہن رکھا تھا اور گلے میں تانبے کی مالا جھول رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو کندھوں تک اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ مغل بہادر مونچھوں میں مسکائے اور فرمایا۔

''فیکا اس بڑی سی پگڑی میں کتنا معزز دکھائی دے رہا ہے۔''

فیکا بد بخت، اسی پر خوش تھا۔ دونوں بازو پھیلائے کھڑا رہا۔ موسم گزرتے رہے اور چاروں اور لہلہاتے ہریالی میں بیچ در بیچ پگڈنڈیوں پر اس کی ساتھی ہوا گیت بنتی رہی۔ چست گائے اور کلیلیں کرتے بچھڑے کے گیت، گھڑ دوڑ کے میدان میں اترتی ہوئی رات کی کہانی، جس میں اصطبل اور طویلے سے اٹھتی، گرتی، لڑکھڑاتی بو کی بساند تھی۔

فیکے نے اکثر تپتی دوپہروں اور ٹھٹھری ہوئی طویل راتوں میں اپنی ماں کے پیچھے گھٹنوں اور پنجوں کے بل لپکتے ہوئے پیادوں اور جوکیوں کی ٹکڑیاں دیکھیں۔ لوگ کہتے ہیں محض سال بھر میں اس کے کسے ہوئے بدن سے ناقابل برداشت بو اٹھتی تھی، اور وہ خون تھوکتی ہوئی بیت گئی۔

فیکے کم بخت کو تو مرزا مغل کا ایک میٹھا بول پابند کیے ہوئے تھا۔ وہ ''بیجا'' بنا رہا۔ ٹھاٹھیں مارتی ہریالی کے سمندر میں دونوں بازو پھیلائے اپنے مالک کا پابند......''

فیکے کا کا کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں اور اس کی آواز دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی۔ وہ بیتے ہوئے زمانوں میں غوطہ لگا گیا تھا۔ اسے بے کراں وسعت کا سامنا تھا۔ وہ سارے کو گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ڈوبے ہوئے دخانی جہاز تھے، ٹوٹے ہوئے مستول، گہری نیلاہٹوں میں روپوش ہوتے ہوئے۔ اس کے گردا گرد بھوکی شارک مچھلیاں سنسناتے ہوئے تیروں کی مانند رواں تھیں۔ وہ لاتعداد گھونگھوں اور ناشگفتہ سیپیوں کے انبار میں دبتا چلا جارہا تھا۔

یکلخت مسند پر پلش کے گاؤ تکیے سے ٹیک لیے، فیکے کا کا نے مرزا مغل بہادر کی جانب ٹانگیں سیدھی کرلیں۔ وہ یقیناً اونگھ گیا تھا۔

مرزا بہادر کی ٹھوڑی پر تیپچواں کی نے ٹھہر گئی۔ حقے کے پیندے میں پانی کی گڑ گڑاہٹ نے دم سادھ لیا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ سامنے اکڑوں بیٹھی ہوئی رعیت کا سانس سوکھنے لگا۔ پھر فیکے کا کا نے بیتے زمانوں کی گہری تہوں سے جھرجھری لی ہے۔

''خدا یہ جھوک آباد رکھے، حضور اب میں ان وقتوں کا قصہ کہتا ہوں جب فیکا جوان تھا اور اس نے مغل بیگم سرائے کے عین نیچے لہلہاتی فصلوں میں پوہ ماگھ کی طویل راتیں گزاردی تھیں۔ اس کے بازو کندھوں تک اٹھے ہوئے تھے اور چھاتی پر تانبے کا ہار ہوا میں لہریے لے رہا تھا۔ ان طویل راتوں میں سے ایک رات کا بیان کرتا ہوں۔

اس رات حویلی کی فصیل میں عین اس جگہ روشنی کی لکیر پڑی، جہاں مغل بیگمات کی سرائے تھی۔ باہر کھلنے والی کھڑکی کے پٹ دیر تک نیم وا رہے۔ میں وہاں ٹھہرا رہا اور دیکھتا رہا۔ پھر لالٹین کی زرد روشنی دیر تک آگے پیچھے جھولتی رہی۔ یہ بلاوا کس کے لیے تھا، میں نے حیرانی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ دور دور تک ہریالی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جس کے

درمیان یک وتنہا صرف میں ٹھہرا ہوا تھا۔

تاریکی میں جب کسی طرف سے بھی کوئی حرکت نہ ہوئی تو میں چل پڑا۔ دھیرے دھیرے نیم وا کھڑکی میں ایک ماہ لقا کا سراپا واضح ہوتا گیا۔ میں کوئی بیس قدم پرے رک گیا تھا کہ حکم ہوا۔ ''اندر آؤ''۔

مجھ نابکار میں اتنی ہمت کہاں تھی اور پھر میرے دونوں بازو شانوں تک اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ مترنم جھرنا پھوٹا ''بازو گرا دو اور آجاؤ۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس ماہ لقا نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیے اور کمرے کی مدہم زرد روشنی میں نہا گئی۔ ایسی روشنی میں نے ماں کے ساتھ طویلوں، اصطبلوں اور پلٹون کے سپاہیوں کی تاریک کوٹھریوں میں دیکھی تھی۔ ایسے میں ہمیشہ میں اس مدھم زرد روشنی میں نہائی ماں کو چھوڑ کر باہر آجاتا تھا، کھلے میدانوں میں اکیلا سالھ کھیلتا رہتا تھا۔

وہ ماہ لقا اس زردی میں نہا رہی تھی اور میں عادت سے مجبور۔

میں پلٹا، کھڑکی کے پٹ وا کیے اور باہر کود گیا۔ میرے گلے میں ڈھیلی پگڑی جھول رہی تھی اور تانبے کا ہار گھٹنوں پر بج رہا تھا۔ میں گھڑ دوڑ کے میدان کی طرف نکل گیا۔ پلٹون کے سپاہیوں کی کوٹھریاں جھانکتا پھرا۔ میں بچپن کے شناسا چہروں کی تلاش میں تھا۔ بالآخر میں اس تلاش میں کامیاب ہوا، مجھے ایک شناسا چہرہ مل ہی گیا۔ میں نے اس کھانستے ہوئے ہڈیوں کے پنجر کو اپنے کندھوں پر لادا اور بیگمات کی سرائے تک لے آیا۔ میں شاید پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ پوہ ماگھ کی ایک طویل رات تھی۔ کھڑکی کے پٹ اسی طرح وا تھے اور وہ اس میں تنہائی، بے سدھ تھی۔ میں نے اس ہڈیوں کے پنجر کو وہاں اتارا ہے اور باہر آ گیا ہوں........''

نیکے کا کا کی آواز ایک بار پھر دھیرے دھیرے ڈوبنے لگی۔ وہ بیتی ہوئی صدیوں کی کھوج میں تھا اور اسے بے کراں وسعت کا سامنا تھا۔ مرزا مغل بہادر کی ٹھوڑی پر بیچواں کی نے ٹھہری ہوئی تھی اور چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا گزر جاتا تھا۔ سامنے نشیب میں اکڑوں بیٹھی ہوئی رعیت کے سانس ایک بار پھر سوکھ رہے تھے۔

بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر چھتری بنے کھڑے تھے اور باہر حویلی کی بنیادوں میں دریا پرسکون سانس لے رہا تھا۔

OO

گُم گُم بہت آرام سے ہے

زاہدہ حنا

میری دلاری دادی ماں

نمسکار!

کئی ہفتوں بعد آج جب میں کابل واپس پہنچی تو ڈاک ملی۔ گھر سے آپ کے علاوہ بھی کئی چٹھیاں آئی ہیں۔ آپ کی چٹھی پڑھ کر مجھے لگا جیسے بچپن لوٹ آیا ہے اور میں آپ کی گود میں چڑھی بیٹھی ہوں۔ آپ مجھے کہانیاں سنا رہی ہیں۔ برابر میں رکھی ہوئی تپائی پر سفید چینی کا بڑا سا پیالہ دھرا ہے جس کا کنارا آپ کی آب رواں کی ساڑی کے کنارے جیسا نیلا ہے۔ پیالے میں ۔ سے اخروٹ، کشمش یا بادام کا دانہ اٹھا کر میرے منھ میں رکھ دیتی ہیں، میں شرارت سے آپ کی انگلیاں دانتوں میں دبا لیتی ہوں۔ آپ مجھے گھورتی ہیں اور پھر مجھے اپنے بیتے جنموں کی کہانیاں سنانے لگتی ہیں، جب آپ ہنس تھیں اور اڑتی ہوئی کیلاش کی چوٹی پر جا اتری تھیں، جب آپ مچھلی تھیں اور گنگا، جمنا، سرسوتی اور ساردا میں تیرتی پھرتی تھیں، جب آپ ہزار پتوں والا کنول تھیں اور آپ کی سندرتا دیکھنے اور آپ کی سگندھ سے مست ہونے کے لیے راجے مہاراجے آتے تھے۔ اور ایک تو بالکل سچ مچ کا قصہ تھا۔ آپ کے بچپن کی کہانی جو کابل کے بنجارے رحمت کی تھی، پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر آپ ڈر گئی تھیں۔ پھر آپ کی اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ آپ کی باتیں سنتا اور آپ کا چھوٹا سا آنچل بادام، کشمش اور اخروٹ سے بھر دیتا۔ آپ نے بتایا تھا کہ جس دن رحمت بابا آٹھ برس کی جیل کاٹ کر آیا اسی دن آپ کے

بچھڑے ہونے والے تھے، وہ کسی دوسرے بنجارے سے آپ کے لیے میوہ مانگ کر لایا تھا اور آپ وہی میوہ دان کر کے چلا گیا تھا۔ اس کا قصہ جب آپ نے مجھے پہلی بار سنایا اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے تب میں نے جانا تھا کہ بڑے بھی بچوں کی طرح رو سکتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ رحمت بابا کی بھی آپ کے برابر کی ایک بیٹی تھی جو کابل میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اس کی تصویر اتروانے کے لیے پیسے نہ تھے یا شاید اس زمانے میں فوٹو گرافر کابل میں نہ پائے جاتے ہوں، تو اس نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کا رنگین چھاپا ایک کاغذ پر لے لیا تھا اور اس کاغذ کو سینے سے لگائے پھرتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے پتا جی میری تصویر اپنے والٹ میں رکھتے تھے۔

ان دنوں جب درد سے چیختے ہوئے، خون میں ڈوبے ہوئے گھائل یا دم توڑتے ہوئے لوگ میرے پاس لائے جاتے ہیں تو میں سوچتی ہوں کہ اب سے ستر برس پہلے اگر آپ نے رحمت بابا کی جھولی کے بادام اور پستے نہ کھائے ہوتے، اگر میرے بڑے نانا جی نے اس کی کہانی نہ لکھی ہوتی تو کیا میں یہاں کابل یا قندھار میں، ہرات یا ہلمند میں ہوتی؟ شاید نہیں۔ بلکہ یقیناً نہیں۔ پچھلے اکتوبر کے وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں جب کابل پر امریکی ہوائی جہازوں نے بم گرانے شروع کیے تھے اور ٹیلی وژن پر وہ بمباری دکھائی جانے لگی تھی۔ آپ نے اپنی جھولا کرسی برآمدے سے اٹھوا کر لاؤنج میں رکھوالی تھی اور سارا وقت ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی رہتیں۔

امریکی بمباری کے خلاف جب کول کتا کی سڑکوں پر لاکھ لوگوں کا جلوس نکلا تو میں بھی اس میں گئی تھی، ٹیلی وژن پر میری ایک جھلک دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئی تھیں۔ پھر جب ریلیف ورک کے لیے کابل کے اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ کی طرف سے ڈاکٹروں کی مانگ آئی اور میں نے والنٹیر کیا تو یہ صرف آپ تھیں جنھوں نے مجھے آشیرواد دی، ورنہ گھر میں تو سب ہی ناراض ہوئے تھے۔ ماتا جی کا غصے سے برا حال تھا۔ بڑے نانا جی کی اور آپ کی طرح ماتا جی آدرش وادی نہیں۔ ایک پریکٹیکل بزنس وومن ہیں، نہ ہوتیں تو پتا جی کے چلے جانے کے بعد ان کا اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھالتیں۔ میں آپ پر اور بڑے نانا جی پر گئی ہوں، تب ہی جاگتی آنکھوں سپنے دیکھتی ہوں۔

آپ نے مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں آپ نے رحمت بابا کی بیٹی کو اپنی ان دیکھی گوئیاں بنالیا تھا۔ خیالوں میں اس کی گڑیا سے اپنی گڈے کا بیاہ رچاتی تھیں۔ گڈا آپ کا اور گڑیا اس کی، سو گڑیا بیاہ کر کابل سے کلکتہ چلی آتی تھی۔ لیکن بڑی نانی جی نے جب آپ سے یہ باتیں

سنی تھیں تو ناراض ہوگئی تھیں۔ بھلا ہندو گڈے سے مسلمان گڑیا کا بیاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھیرے ہوں گے یا نکاح؟ بڑے نانا جی نے یہ بات سنی تو بہت خفا ہوئے تھے۔ ''تم عورتوں کو فساد پھیلانے کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟ کم سے کم گڈے گڑیا کو تو دین دھرم کے چکر میں مت ڈالو۔'' انھوں نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا تھا اور بڑی نانی جی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھیں۔ آپ نے یہ بات بھی مجھے ہنس ہنس کر سنائی تھی۔ ''پتا جی کا دل بہت بڑا تھا، اس میں ایشور اللہ، ہندو مسلمان سب رہتے تھے۔'' آپ نے بڑے نانا جی کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

میں جب کابل کے لیے چلی ہوں تو آپ پرارتھنا کرنے برلا مندر گئیں، پھر آپ ناخدا مسجد بھی ہو آئیں۔ گھر میں جب ڈرائیور نے یہ بتایا تو سب حیران ہو گئے تھے۔ ''یہ مسجد جانے کی کیا تک تھی؟'' ماتا جی نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ ''ارے مجھے خیال سوجھا کہ یہ مسلمانوں کے ملک جا رہی ہے تو اس کی رکھشا کے لیے مسجد ہو آؤں۔ اللہ سے کہہ آؤں کہ میری پوتی کا دھیان رکھیو۔''

میری محبت میں آپ مندر گئیں، مسجد گئیں ایشور اور اللہ سے ڈائریکٹ ڈائلنگ پر بات کر کے بہت اطمینان سے مجھے کابل بھیج دیا، شاید ایک مرتبہ بھی آپ خواب میں اس شہر کو دیکھ لیتیں تو مجھے کبھی یہاں نہ آنے دیتیں۔ جہاں ہر گھر کی دیواروں پر موت کا سایہ ہے، ہر گلی اور ہر بازار میں خون کی لکیریں ہیں۔

ان مہینوں میں ہندوستانی، جرمن اور جاپانی ڈاکٹروں کی ہماری ٹیم شہر شہر پھرتی رہی ہے۔ ہم صبح سے شام تک اور رات کو جنریٹروں کی روشنی میں بچوں، عورتوں اور مردوں کے بدن سے کلسٹر بم کے ٹکڑے اور ریزے چنتے رہے ہیں۔

ایک سے تھا وادی ماں کہ بامیان اور بلخ تک ہمارے اشوک کی کنشک کا راج تھا۔ لیکن دھرتی پر کب کسی ایک راجا کا راج رہا ہے۔ عرب آئے، ترک آئے، چنگیز خاں کی فوجیں آئیں، اس نے اپنے پوتے کو بامیان فتح کرنے کے لیے بھیجا لیکن وہ لڑکا لڑائی میں کام آیا۔ چہیتے پوتے کی موت چنگیز خان کے لیے اتنا بڑا صدمہ تھی کہ اس نے بامیان کی وادی میں کسی ایک جاندار کو جیتا نہ چھوڑنے کی سوگندھ کھائی۔ سو کوئی مرد، عورت، بچہ، بوڑھا جیتا نہ چھوڑا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ماؤں کے پیٹ چیر کران کے بچے نکالے گئے اور ٹکڑے کر دیے گئے۔ بامیان کی گلیوں میں پھرنے والے کتے، بلیاں زندہ نہیں چھوڑے گئے اور اس کی ہواؤں میں اڑنے والے پرندے بھی تیروں سے چھید دیے گئے۔

ہم بامیان گئے تو کچھ دیر کے لیے وہاں گئے جہاں پہاڑوں کی اونچی اونچی چٹانوں کو تراش کر مہاتما بدھ کی مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ چنگیز خان نے پوتے کے انتقام میں بامیان کا کوئی جاندار جیتا نہیں چھوڑا تھا۔ طالبان نے اپنا غصہ پتھر کی مورتیوں پر نکالا۔ میں نے ایک جاپانی ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ لیکن میری آنکھوں میں نمی بھی نہیں آئی۔ آپ خود سوچیں دادی ماں کہ جنھوں نے اپنے جیتے جاگتے لوگ، اپنی پوری نسل خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کر دی، ان سے اس بات کی کیا شکایت کہ انھوں نے مہاتما بدھ کی مورتیاں ڈائنامائٹ سے، توپ کے گولوں سے کیوں اڑا دیں۔

چنگیز خاں اور اس جیسے دوسرے بادشاہوں، راجاؤں، مہاراجوں کا غصہ ان شہروں پر اترتا تھا جو ان کے راستے میں آتے تھے اور ان کی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے تھے لیکن دادی ماں امریکہ کا غصہ تو قندھار سے قندوز اور خوست سے قلعۂ جنگی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لڑاکا ہوائی جہاز تورا بورا اور طالبان پر بمباری کرتے ہیں۔ یہاں کی دھرتی میں بارودی سرنگیں یوں بوئی گئی ہیں جیسے کسی کھیت میں بیج چھڑک دیے گئے ہوں۔ موت کے بیج۔ بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب ہی ان کا نوالہ بنتے رہتے ہیں۔ جن کے ٹکڑے اڑ گئے، لوگ انھیں خوش نصیب سمجھتے ہیں، ورنہ یہاں کسی کا ایک ہاتھ نہیں اور کوئی دونوں ہاتھ کھو بیٹھا ہے، کسی کی ٹانگیں نہیں رہیں۔ میں نے وہ بھی دیکھے جن کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر غائب ہیں۔ یوں جانیں کہ جیتا جاگتا انسان گوشت کا ایسا لوتھڑا بن گیا ہے جسے بھوک لگتی ہے، جو سوچ سکتا ہے اور لمحہ لمحہ اپنے ہونے کا دکھ بھوگتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مجھے برسات سے کیسا عشق تھا، جہاں چھینٹا پڑا اور میں باؤلی ہوئی۔ ماتا جی سے کیسی جھڑکیاں سنتی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ بارش کے ساتھ میں بھی ندی نالوں میں، دریا میں چل نکلوں۔ ہاتھ پاؤں مٹی میں سنے ہوئے، کپڑوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ آپ ساڑی کا پلو اوڑھے ہوئے میرے پیچھے آواز دیتی پھرتیں ''اری گُم گُم، چل اندر چل، اشنان کر کے کپڑے بدل، بیمار پڑ جائے گی۔''

ہم دونوں جب پانی میں بھیگتے ہوئے، چھپ چھپ کرتے اندر آتے اور چمکتی ہوئی ٹائلوں والا فرش ہمارے قدم سے گندا ہوتا تو ماتا جی چپ چاپ ہمیں دیکھتی رہتیں۔ آپ ان کی ساسو ماں تھیں اور اس سے بھی بڑھ کر خود بڑی ٹھکرائن تھیں۔ بڑے ناناجی دکان، مکان، باٹ،

بغیچے اپنے دیہانت سے پہلے سب آپ کے نام لگا گئے تھے۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ آپ سے کچھ کہتا۔ وہ آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں، اس لیے شامت رگھودا کی آتی جنھیں وہ چیخ چیخ کر فرش صاف کرنے کا حکم دیتیں۔ ایسے میں آپ چپکے سے میرے کان میں کہتیں ''دیکھ گم گم دیکھ، تیری ماں کے کان سے دھواں نکل رہا ہے۔'' میں کھی کھی کر کے ہنستی اور نیچی آواز میں فائر بریگیڈ بلانے کا مشورہ دیتی۔ تب آپ میرا کان مروڑتیں ''منھ بند رکھ، تیری ماں نے سن لیا تو تجھے کھانا نہیں ملے گا''، ''پھر کیا ہوا دادی ماں آپ اور میں ٹالی گنج کلب چلیں گے''، ''ٹالی گنج کلب چلیں گے'' آپ میری نقل اتارتیں پھر دھیمی آواز میں ڈانٹتیں ''اور وہاں جا کر تین دن کا کھانا ٹو آدھے گھنٹے میں ٹھونس لے گی، پھر پیٹ پکڑے پھرے گی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نبر جی کو بلاؤ، ہسپتال لے کر بھاگو۔ نا بابا تُو بھوکی ہی بھلی۔''

لیجیے دادی ماں، میں بھی جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اتنے دنوں بعد آپ سے باتیں کرنے بیٹھی ہوں تو برسات کے پرنالے کی طرح باتیں شرانے سے بہتی چلی جا رہی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ جب میں یہاں آئی تو مجھے برسات سے ڈر لگنے لگا۔ یہاں کے بچے برسات میں نہا نہیں سکتے، کاغذ کی ناؤ بنا کر بہتے پانی میں چلا نہیں سکتے، اس لیے کہ برسات کا تیز پانی بارودی سرنگوں کی جگہ بدل دیتا ہے۔ وہ جگہ جو پہلے محفوظ تھی، وہاں بارود بچھ جاتی ہے۔

آپ نے مجھے بنگال کی بھکمری کے کیسے بھیانک قصے سنائے ہیں، ایسی بھکمری کہ جب ماؤں نے دو نوالے بھات کے لیے اپنے بچے بیچ دیے تھے۔ بڑے نانا جی کے صندوق کے سامان کو دھوپ دکھاتے ہوئے ایک بار آپ نے اس کال سے مرنے والوں کی تصویریں مجھے دکھائی تھیں۔ فٹ پاتھ پر مرتے ہوئے بچوں، عورتوں اور مردوں کی تصویریں۔ یوں جیسے شمشان گھاٹ میں مردے انتم سنسکار کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوں۔ یہاں بھی دادی ماں بھوک کا راج ہے۔ میں نے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے ایسے ہزاروں بچے اور عورتیں دیکھیں جنھوں نے سیکڑوں میل کا سفر کیا اور پھر ریلیف کیمپوں سے چند میل کے فاصلے پر گر گئیں، ان میں چند قدم چلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ بچے اپنی حیران آنکھوں اور عورتیں اپنے پھٹے ہوئے چکٹ نیلے برقعوں کی جالیوں سے نیلے آسمان کو تکتی تھیں۔ اس انتظار میں کہ موت آئے اور اپنے ساتھ بھوک، بیماری اور تھکن سے نجات کا نسخہ لائے۔ یہاں عورتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ آپ کو لکھنے بیٹھوں تو جس کاغذ پر لکھوں گی وہ جل جائے

گا۔ امریکہ کے اس وار تھیٹر میں ہوائی جہاز مکھن کی ٹکیاں، بسکٹ کے پیکٹ اور بارودی سرنگیں ایک ساتھ پھینکتے ہیں۔

ایک بار بڑے نانا جی کے صندوق کا سامان، ان کی ڈائریاں، ان کے خط پتر اور تصویریں جب آپ دھوپ دکھا کر واپس رکھ رہی تھیں تو آپ نے مجھے وہ میلا سا کاغذ دکھایا تھا جو آپ کے بیاہ کے دن رحمت بابا کی جھولی سے گر گیا تھا۔ بڑے نانا جی نے وہ سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ رحمت اگر کبھی آیا تو اسے دے دیں گے، لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا اور اس کی بیٹی کے چھوٹے سے ہاتھ کا رنگین چھاپا آج بھی بڑے نانا جی کے صندوق میں رکھا ہوا ہے۔

کابل کی گلیوں میں دادی ماں مجھے آپ کے بچپن کا ہیرو کا تو کیا ملتا، اس کی بیٹی، اس کی نواسیاں اور پوتیاں بھی نہیں ملیں، ملتیں بھی تو کیسے کہ وہ سب گھر کی کال کوٹھریوں میں خاک ہو گئیں۔ اس کی کسی پرپوتی، کسی پرنواسی کی شاید ہتھیلیاں بھی نہ ہوں جن کے رنگین چھاپے ان کے چاہنے والے باپ اپنے کلیجے سے لگا کر پھریں۔ میں نے ان لڑکیوں کی کلائیوں کے گھاؤ سیے ہیں، جن کی ہتھیلیاں نہیں رہیں، جو اب کبھی عید پر مہندی نہیں لگائیں گی، چوڑیاں نہیں پہنیں گی۔ میری سہیلی رضیہ تو آپ کو اب تک کینیڈا سے کارڈ بھیجتی ہے۔ ہر عید شب برات پر مہندی لگوانے کے لیے وہ آپ کے پاس دوڑی آتی۔ ''دادی ماں جیسی مہندی آپ نے ہولی پر گم گم کے لگائی تھی، ویسی ہی مجھے بھی لگانا۔'' وہ فرمائش کرتی۔ ''اری باؤلی ہوئی ہے، مجھے بھلا خاک یاد ہے، کیسے پھول بوٹے بنائے تھے، بس اب چپکی بیٹھی رہ اور ہاتھ مت ہلائیو۔'' آپ اسے ڈانٹتیں اور سوئی کی نوک سے اس کی گلابی ہتھیلی پر یوں پھول بوٹے بناتی جاتیں جیسے ریشم سے کڑھائی کر رہی ہوں۔ یہاں ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جن کی ہتھیلیوں کے لیے اب کبھی عید اور شب برات نہیں آئے گی۔

میں نے دادی ماں لاشوں کے ڈھیر دیکھے، کھیلتے ہوئے بچے جنھیں ہوائی جہازوں سے ہونے والی Straffing نے سلا دیا تھا، عورتیں جو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگی تھیں اور جن کے برقعے اور بدن ایک ساتھ چھلنی ہوئے تھے۔ میں نے ان دلہنوں اور دولہاؤں کے بدن سے گولیاں نکالی ہیں جن کی براتوں کو دہشت گردوں کا ٹولا کہہ کر ان پر گولیاں برسائی گئیں، بم مارے گئے۔

پھر دادی ماں ایک رات مجھ پر عجیب گزری۔ ہم بامیان اور شبر غان سے ہوتے

ہوئے دشت لیلیٰ میں کیمپ کر رہے تھے جہاں ٹیلی وژن چینلوں کے اور اخباروں کے لوگوں کی ڈار اتری ہوئی تھی۔ طالبان کی ان Mass Graves کی خبروں اور تصویروں کی تلاش میں جنھیں کنٹینروں میں مزار شریف سے شبرغان لایا گیا اور وہ سب دم گھٹنے سے ہلاک ہو گئے تو انھیں خندقیں کھود کر دشتِ لیلیٰ میں دفن کر دیا گیا۔ برسوں پہلے جب طالبان نے اس علاقے کو فتح کیا تو یہاں کے لوگوں کا قتل عام کیا اور پھر اسے چھپانے کے لیے Mass Graves میں دفن کیا، اب وقت ان کے لیے لٹو کی طرح گھوم گیا ہے، تو ان کا بستر بھی دشتِ لیلیٰ کی خندقوں میں لگا۔ دشتِ لیلیٰ کو یوں سمجھیں دادی ماں جیسے ہمارے راجپوتانے کے ریتیلے میدانوں کی کوئی چھوٹی سی آبادی۔ کچے گھروں کی اس بستی پر بھی بمباری ہوئی تھی۔ سو لوگوں کے پاس نہ کھانے کو، نہ سر چھپانے کو۔ ہم ایک دن کے لیے وہاں کچھ زخمیوں کی دیکھ ریکھ کے لیے رکے تھے۔ شام ہوئی اور کام ختم ہوا تو میں تھکن سے نڈھال اپنے خیمے میں پہنچی اور بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ اچانک کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تو خیمے میں اندھیرا تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی جانور خیمے کو اپنے ناخنوں سے کھرچ رہا ہو۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہڑبڑا کر اپنے خیمے سے باہر آ گئی۔ آسمان پر ماگھ کا سبزی مائل نیلا چاند، زمین پر دشتِ لیلیٰ کی ریت، کچھ فاصلے پر Mass Graves اور میری نگاہوں کے سامنے میرے خیمے سے ٹیک لگائے ہوئے ریت پر ایک لڑکا۔ قمیص پر خون کے سوکھے اور تازہ دھبے، آنکھوں میں وحشت اور خوف، سارے بدن سے کانپتا ہوا۔ وہ گرتا پڑتا، چھپتا چھپاتا ہمارے کیمپ تک پہنچا تھا۔ جانے کب زخمی ہوا تھا۔ یہ سوچ کر ہی میرے اعصاب تن گئے کہ شاید اب بھی وہ ہتھیار بند ہو۔ پہلا خیال مجھے کسی گارڈ کو آواز دینے کا آیا، لیکن پھر دادی ماں ایسی انہونی ہوئی کہ اسے لکھتے ہوئے اس وقت بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ آن کی آن میں اس لڑکے کا چہرہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس نے پیروں کے پاس پڑی ہوئی جھولی سے کچھ نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا، اس میں بادام، کشمش اور اخروٹ تھے۔ وہ آپ کو آواز دے رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس کے چہرے پر نظر کی، ایشور کی قسم ماگھ کے چاند کی روشنی میں وہاں رحمت بابا تھا، اس کی قمیص پر خون کے دھبے تھے، بڑے نانا جی نے لکھا تھا کہ وہ ماگھ کے مہینے میں گھر لوٹ جاتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ کے بچپن کو، بڑے نانا جی کی کہانی کو میں گرفتار کیسے کراتی؟ اس لڑکے کا گھاؤ سیتے ہوئے میں نہ اس کی سن سکی، نہ اپنی کہہ سکی۔ اس لیے دادی ماں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی

زبان نہیں جانتے تھے۔ اس وقت مجھے آپ کا خیال آتا رہا اور مجھے اپنے ہارے ہوئے لوگوں کے قصے یاد آتے رہے، جو آپ نے سنائے تھے۔ ٹیپو، سراج الدولہ، بابو کنور سنگھ، لکشمی بائی، حضرت محل......تانتیا ٹوپے۔

اس رات جب پو پھٹنے والی تھی، میں نے اسے ایک تھیلے میں کچھ دوائیں، کھانے کے ڈبے اور کمبل دیا، اور جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، وہ تھیلا اور کمبل کندھے پر ڈال رہا تھا کہ مجھے کچھ خیال آیا، میں نے سرہانے پڑے ہوئے پرس سے کچھ پیسے نکالے، اس نے سر ہلا کر لینے سے انکار کیا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے دادی ماں نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ کر مٹھی بند کردی۔ وہ چند لمحے تک مجھے دیکھتا رہا، پھر اس نے وہی ہاتھ پیشانی تک لے جا کر مجھے سلام کیا، تھیلا اور کمبل کندھے پر ڈالا اور خیمے سے نکل گیا، میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کُہرے اور چاندنی کے غبار میں لپٹا ہوا تنہا وجود۔ چند قدم چل کر وہ پلٹا اور میری طرف دیکھا۔ وہ ہارے ہوئے قبیلے کی آنکھیں تھیں۔ پھر ان سب آنکھوں نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور چلتی چلی گئیں۔ تنہائی اور تاریخ کی اندھی گپھاؤں کی طرف۔ آپ خوش نصیب ہیں دادی ماں کہ آپ نے تاریخ سے ہار جانے والوں کا قصہ پڑھا ہے، ان کی آنکھوں میں اترا ہوا تنہائی کا زہر نہیں دیکھا۔

رحمت کابلی والا آپ کے بچپن کی سندر سہانی یاد تھا لیکن اس رات وہ آپ کی گُم گُم کو درد کا دوشالہ اوڑھا گیا۔ اچھا ہوا کہ بڑے ناناجی گزر گئے۔ وہ اس زمانے میں ہوتے تو پرتاب سنگھ اور کنچن مالا کی کہانی لکھنے کی بجائے دھرتی کے گھاؤ لکھتے، ان کھوئی ہوئی ہتھیلیوں کا قصہ لکھتے جن پر اب کبھی مہندی نہیں لگے گی۔

ماتا جی کو یا گھر میں کسی اور کو کچھ مت بتایئے گا۔ یہی کہیے گا کہ کابل میں گُم گُم بہت آرام سے ہے۔

آپ کی گُم گُم

OO

ایک عام آدمی کا خواب

رشید امجد

انگلیاں شل اور آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

انگلیاں اس چینل کو تلاش کرتے کرتے شل ہو گئی ہیں جہاں سے وہ اپنی پسند کی خبریں سننا چاہتا ہے، اور آنکھیں اس خبر کی سرخی کو تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہیں جسے پڑھنے کا وہ مدتوں سے منتظر ہے لیکن نہ منظر بدلتا ہے نہ چینل ملتا ہے، نہ وہ سرخی نظر آتی ہے، شروع شروع میں صرف ٹی وی کا چینل تھا، اس کا خیال تھا کہ شاید وہ خبر جسے سننے کو اس کے کان ترس گئے ہیں، کسی اور چینل پر سنی جا سکتی ہے۔ نئی نئی ڈش آئی تو خاصی مہنگی تھی، جن دو چار ملنے والوں کے پاس ڈش تھی، وہ ان سے کرید کرید کر خبریں پوچھتا۔ ''کوئی تازہ خبر؟''

جواب دینے والا خبروں کی بجائے تفریحی پروگراموں کا ذکر کرتا، نیم عریاں جسموں کے گداز پن کو چسکے لے لے کر بیان کرتا، وہ اَن سنی کرتے ہوئے پوچھتا۔ ''خبریں بھی تو سنی ہوں گی؟''

عموماً جواب ملتا۔ ''یار خبریں تو کم ہی سنتے ہیں۔''

وہ مایوس ہو جاتا، ذرا ڈش سستی ہوئی تو اس نے کچھ پیسے جوڑ کر بیوی کی مخالفت کے باوجود ڈش لگوالی۔ بچوں کی ضد تھی کہ وہ سائیڈ رکھی جائے جہاں تفریحی پروگرام زیادہ ہیں، لیکن اس نے ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود خبروں والے حصے کو ترجیح دی۔ اس طرف تفریحی چینل دو تین ہی تھے۔ اب تو روز رات گئے تک، جب بچے سو جاتے، خبروں کے چینل کو آگے پیچھے کرتا رہتا، لیکن وہ خبر کہیں نہ تھی، مگر وہ مایوس نہ ہوا۔

ایک نہ ایک دن تو اس خبر کو آنا ہی ہے، اس دوران وہ صبح اٹھتے ہی اخبار بھی دیکھتا، وہ سرخی کب لگے گی؟ زندگی کے پچاس برس بیت گئے، وہ سرخی کب لگے گی؟ لگے گی بھی کہ نہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو ڈانٹ دیتا۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ شاید وہ خبر کہیں درمیان میں چھپ جائے اس کے گھر جو اخبار آتا تھا، اس کی ایک ایک سطر پڑھ کر اسے احساس ہوتا کہ یہ وہی چبائے ہوئے بے معنی حرف ہیں، جن کو ایک ڈھیر کی صورت اخبار کے صفحات میں پھیلا دیا جاتا ہے، اس نے سوچا کہ شاید کوئی دوسرا اخبار بہتر ہو لیکن ایک سے زیادہ اخبار لینا اس کی عادت نہیں تھی، دفتر میں بھی ایک اخبار آتا تھا۔ اس نے گھر کا اخبار مختلف کرالیا، لیکن یہ دوسرا اخبار بھی ہر صبح مردہ لفظوں کا ایک ڈھیر اس کے سامنے پھیلا دیتا جن میں سے اٹھنے والی سڑاند اسے دن بھر پریشان رکھتی۔ اب اس نے ایک اور طریقہ اپنا لیا، صبح ذرا جلدی گھر سے نکل پڑتا اور دفتر جانے سے پہلے اخباروں کے اسٹالوں پر کچھ دیر رک جاتا جہاں کئی اخبار لٹک رہے ہوتے۔ وہ جلدی جلدی سب پر ایک نظر ڈالتا۔ وہی سڑاند بھرے مردہ لفظ، ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے، وہی پرانی خبریں نئے نئے انداز سے، وہی چہرے، صرف ماسک بدلتے۔ یہ تو وہی لاشیں ہیں صرف کفن بدلے گئے ہیں، وہ انھیں دیکھتے ہوئے سوچتا۔ وہ خبر کب چھپے گی؟

ایک دن دفتر میں کسی نے ذکر کیا کہ اگر ڈش کے ساتھ ایک ایل این بی لگالی جائے تو کچھ چینل اور آجاتے ہیں، ان میں سے کچھ نیوز کے بھی ہیں۔ پہلی تاریخ کو اپنے پر بہت جبر کرکے اس نے کچھ پیسے بچالیے اور ایک نئی ایل این بی لگوالی۔ چینل دگنے ہو گئے، بچے بڑے خوش ہوئے لیکن اس کو اب بھی کچھ نہ ملا۔ ان نئے نیوز چینلوں پر بھی وہی پرانی خبریں تھیں، وہی پرانے چہرے، صرف کبھی کبھی ماسک بدل جاتے۔

وہ کچھ مایوس سا ہو گیا، اب وہ ساٹھ کے قریب پہنچنے والا تھا کچھ دنوں بعد ریٹائر ہو جائے گا، بس زندگی تو کولہو کے بیل کی طرح ہی گزر گئی۔ وہ ایک تبدیلی، ایک نئی خبر کی تمنا، ایک حسرت ہی بنتی جارہی تھی۔ اور کئی بار اخبار پڑھ کر، کئی نیوز چینل سن کر بھی وہ خبر نہ ملتی، تو کیا وہ خبر اسے کبھی نہ ملے گی۔ شاید وہ خبر کسی ایسے چینل پر ہو جو اس کی ڈش پر نہیں آتا۔ اب گھومنے والی ڈشیں آگئی تھیں اور بتانے والے بتاتے تھے کہ اس پر اتنے چینل ہیں کہ گنتی کرنا مشکل ہے۔ وہ سوچتا ان میں سے بے شمار نیوز چینل بھی ہوں گے۔ شاید اس کی خبر، جس کا وہ منتظر ہے ان میں سے کسی پر آجائے۔ یہ سارے چینل اور اخبار تو بکے ہوئے ہیں، وہی بتاتے اور چھاپتے

ہیں جو انھیں بتایا جاتا ہے۔ بڑے غیر جانب دار، جن کے بارے میں خوش فہمی تھی کہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، ایک ہی طرح کے تھے، صرف لفظوں کا ہیر پھیر تھا۔

''سب ایک ہی ہیں'' وہ سوچتا۔ ''لگتا ہے کہ انھیں کنٹرول کرنے والے اندر سے ایک ہی ہیں۔''

شاید گھومنے والی ڈش پر کوئی ایسا چینل ہو جو سچ بولتا ہو اور شاید وہاں سے.........

ریٹائرمنٹ کے پیسے ملے تو اس نے کسی کو بتائے بغیر ایک گھومنے والی ڈش لگوالی۔ واقعی اس پر اتنے چینل تھے کہ گنتی مشکل تھی۔ ان میں بے شمار نیوز چینل بھی تھے۔ کئی دن تو انھیں تلاش کرتے کرتے لگ گئے۔ اب وہ یوں بھی فارغ تھا۔ بچے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے، بیوی باورچی خانے میں گھس جاتی اور وہ ریموٹ اٹھا کر چینل گھماتا رہتا۔ گھماتے گھماتے انگلیاں شل ہوگئیں۔ تلاش کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں لیکن وہ خبر نہ سنی جاسکی نہ پڑھی جاسکی۔ اب اسے ہلکی ہلکی سانس کی تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ زیادہ دیر تو بیٹھا نہ جاسکتا، نیم دراز کیفیت میں ایک آدھ اخبار دیکھ لیتا۔ اسٹال تک جانا موقوف ہوگیا تھا۔ ٹی وی بھی زیادہ دیر نہ دیکھا جاسکتا۔ بس جلدی جلدی چینل بدلتا رہتا۔ شام کو بچے ریموٹ سنبھال لیتے اور وہ اس منظر سے باہر ہو جاتا۔

ایک دن اچانک سانس کی تکلیف بڑھ گئی۔ ریموٹ اس کے ہاتھوں ہی میں رہ گیا اور آنکھیں چپکے سے بند ہوگئیں۔ اس کے بیٹے نے اپنے کسی دوست کو کہہ کر اخبار میں خبر لگوادی۔ وفاتیات کے کالم میں سب سے نیچے تین سطری ایک خبر چھپی:

''عام آدمی ابن عام آدمی کل رات وفات پا گیا۔ نمازِ جنازہ میں بہت سے عام آدمیوں نے شرکت کی۔ رسمِ قل کل سہ پہر ادا کی جائے گی۔''

معلوم نہیں اب وہ یہ خبر پڑھ سکتا تھا کہ نہیں؟

(۲)

اللہ بخش ایک جن ہے جس کا کوئی وجود نہیں، لیکن اس کے خوابوں، خیالوں اور تصورات میں اللہ بخش اپنے پورے وجود اور امکانات کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کے ہر اشارے پر ناچتا اور اس کے ہر حکم کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ معاشرہ جہاں وہ رہتا ہے، اللہ بخش کے بغیر اس کے لیے ایک جنگل ہے جہاں انسان نہیں حیوان رہتے ہیں۔ اللہ بخش اس کے ہونے اور نہ ہونے کے

احساس کو قائم رکھنے کی دلیل ہے اور اس کی کہانی میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے!

یہ کہانی ہر صبح سات بج کر بیس منٹ پر شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے گلی سے نکل کر بڑی گلی میں دائیں طرف مڑتا ہے۔ یہ گلی جس میں اس کا گھر ہے، نیچے سے اوپر جاتی اور بڑی گلی سے ملتی ہے۔ جب اس نے گھر بنایا تھا تو موڑ کے دونوں طرف اتنی جگہ خالی تھی کہ دائیں بائیں سے آنے والوں کے نیچے سے اوپر جانے اور اوپر جانے والوں کو دائیں بائیں کی گاڑیاں نظر آجاتی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ بڑی گلی کے ایک گھر والے نے اپنی دیوار آگے کرلی، اسے دیکھ کر دوسرے اور پھر تیسرے نے بھی یہی کیا، نتیجتاً موڑ اندھا ہوگیا۔ نیچے سے آنے والے کو دائیں بائیں اور بائیں دائیں والوں کو چڑھائی چڑھتی گاڑی دکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ سے یہاں آئے دن گاڑیاں ٹکراتے ٹکراتے رہ جاتی ہیں یا کئی بہت تیز رفتار گاڑیاں ٹکرا بھی جاتی ہیں۔ نیچے والوں نے کئی بار اوپر والی سیدھی گلی میں جمپ بنانے کی کوشش کی لیکن اوپر والی گلی میں ایک جج صاحب رہتے ہیں، انھیں ایک لمحے کے لیے جمپ پر رکنا پسند نہیں، اس لیے جمپ نہیں بننے دیتے۔ چڑھائی چڑھنے والے مسلسل ہارن بجاتے اوپر کی طرف آتے ہیں لیکن سیدھی گلی میں آنے والے ہارن کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات اس تمسخر سے دیکھتے ہیں جیسے ہارن بجانے والا بینڈ بجا رہا ہے۔ اسے ایسے موقعوں پر بہت غصہ آتا ہے اور کئی بار اس نے گردن نکال کر چیختے ہوئے کہا بھی ہے...... ''یہ تمہاری ماں کا بینڈ نہیں بجا رہا۔''

اس پر کئی بار ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی، اسے غصہ بہت آتا ہے لیکن کر کچھ نہیں سکتا، ایسے موقعوں پر اللہ بخش بہت کام آتا ہے۔ وہ کہتا ہے...... ''اللہ بخش اسے الٹا لٹکا دو۔'' اللہ بخش حکم کی تعمیل میں ہارن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کو الٹا لٹکا دیتا ہے۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے۔ اب چھوٹی سڑک اور پھر بڑی سڑک کو کراس کرنے کا مرحلہ ہے، یہاں بھی یہی ہوتا ہے۔

سیدھے آنے والے ایک لمحے کے لیے بھی آہستہ ہونا پسند نہیں کرتے کہ اس سے رفتار میں فرق پڑتا ہے اور یہ دور تو ہے ہی رفتار کا، تیزی کا...... کئی کئی منٹ سڑک کے خالی ہونے کا انتظار، پھر سڑک خالی ہو جائے تو اچانک کوئی غلط طرف سے نکل آتا ہے اور معذرت کرنے کی بجائے الٹا ایسے گھورتا ہے جیسے اس نے کوئی بڑا نقصان کر دیا ہو...... اللہ بخش یہاں بھی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے موجود ہے۔ ٹریفک والوں سے تو کوئی امید نہیں کہ وہ سڑک کے ایک کنارے کھڑے بسوں اور ویگنوں سے روزانہ وصول کر رہے ہیں۔ ہاں اللہ بخش اس کے حکم کے مطابق

غلط آنے والوں کو سرزنش کرتا ہے اور کبھی کبھی انھیں ایک زناٹے دار تھپڑ بھی رسید کر دیتا ہے۔

دفتر تک پہنچنے کے لیے دس اشاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر اشارے پر ایک ہی صورت ہے، سپاہی مزے سے دوسرے کنارے کھڑا تماشا کرتا رہتا ہے۔ کچھ گاڑیاں اشارے کی بالکل پروا نہیں کرتیں، کچھ رک تو جاتی ہیں لیکن پیچھے سے کچھ مسلسل ہارن بجاتی رہتی ہیں۔ اب اس پر غصہ نہ آئے تو کیا آئے۔ وہ اللہ بخش کو حکم دیتا ہے کہ ہارن توڑ دے، لمحہ بھر کے لیے سکون مل جاتا ہے۔ دائیں بائیں غلط آنے والی گاڑیوں کی بات ہی نہیں لیکن وہ اکثر اللہ بخش کے ذریعے انھیں ٹریفک کی کتاب پڑھوا دیتا ہے۔

اس کی عادت ہے وہ انتہائی بائیں طرف آہستہ رفتار میں چلتا ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی گاڑی پیچھے سے ڈپر مارتی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اللہ بخش ہی یہ ڈپر توڑتا ہے اور کبھی کبھی تیز رفتار ویگنوں اور سوزوکیوں کے چاروں ٹائر پنکچر کر دیتا ہے۔ ایسے لمحوں میں اسے بڑا لطف آتا ہے........ ''الو کے پٹھے! آگے نکلنا چاہتے ہیں، اب لگاؤ چاروں پہیوں کے پنکچر۔''

دفتر میں بھی اللہ بخش اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

بڑا افسر کہتا ہے...... ''یہ نوٹ بنالاؤ۔''

وہ کہتا ہے...... ''لیکن سر یہ تو رولز کے خلاف ہے۔''

افسرِ اعلیٰ کو بڑا غصہ آتا ہے...... ''یار تم کہاں آگئے ہو، مجھے بھی نکلواؤ گے اور خود بھی نکلو گے۔''

کبھی اس کا موڈ ٹھیک ہو تو کہتا ہے...... ''یار، بیٹھ جاؤ...... دیکھو، ہم ایک بددیانت نظام کے پرزے ہیں، اس بڑی مشین میں دوسرے پرزوں کے ساتھ حرکت نہیں کریں گے تو ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔''

پھر ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے کہتا ہے......... ''بھائی! کتابیں کم پڑھا کرو، یہ کتابیں تمھیں خوابوں کی دنیا میں لے گئی ہیں......... سچ مچ کی دنیا میں آؤ........ اور جاؤ، یہ نوٹ بنا کر لاؤ۔''

اللہ بخش ایسے موقعوں پر اپنا کام دکھا دیتا ہے۔ وہ یا تو افسرِ اعلیٰ کی انگلیوں پر پیپر ویٹ اٹھا مارتا ہے کہ وہ نوٹ پر دستخط ہی نہ کر سکے یا پھر زیادہ فعال ہو تو غلط کام کروانے والے اصل شخص کی ٹانگیں توڑ دیتا ہے۔ غلط کام کرنے والوں کی ٹانگیں توڑنا تو روز کی بات ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا مداوا تو فوراً ہو جاتا اور تھوڑی دیر لڑنے کے بعد نارمل ہو جاتا لیکن کبھی

کبھار...... بلکہ اب تو اکثر دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کر اسے اللہ بخش کو پکارنا پڑتا۔

"اللہ بخش! دیکھ یہ شخص بلا وجہ اس غریب آدمی کو ڈانٹ رہا ہے، اسے ذرا کھمبے کے ساتھ لٹکا دو۔"

"جو حکم آقا......" اللہ بخش جواب دیتا۔

سڑک پر اکثر بد معاش قسم کے گاڑی والے اپنے قصور کے باوجود کسی دوسرے کو آنکھیں دکھاتے تو اللہ بخش اس کے حکم پر ایک لمحے میں مظلوم کی مدد کو آ جاتا۔

اس کا معمول تھا کہ لنچ ٹائم میں ہلکا پھلکا کھانا، جسے وہ گھر سے لے کر آتا تھا، کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹانگیں لمبی کر کے کرسی سے ٹیک لگا لیتا۔ ایسے میں صبح کی پڑھی ہوئی خبریں ایک ایک کر کے اس کے سامنے حاضر ہوتیں۔

"فلاں محلہ میں پینے کا پانی ایک ہفتے سے بند ہے کیوں کہ ٹیوب ویل کی موٹر جل گئی ہے۔"

وہ اللہ بخش سے پوچھتا۔ "موٹر کتنے کی ہے، یہ لوگ دو موٹریں کیوں نہیں رکھتے کہ ایک جل جائے تو فوراً دوسری استعمال میں آ جائے، اس کا مطلب ہے انھیں لوگوں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں۔"

اللہ بخش اس کے حکم پر متعلقہ افسر کی ٹانگیں توڑ آتا۔

"پینے کے گندے پانی سے اتنی اموات......"

وہ اللہ بخش سے پوچھتا...... پورے ملک میں صاف پانی کے پلانٹ لگانے میں کیا خرچ آئے گا...... اگر صرف ایک سال کوئی سرکاری تقریب نہ ہو تو اس رقم سے پورے ملک میں......

اللہ بخش ذمہ داریوں کے تعین کے لیے کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتا۔ آنکھ کھل جاتی...... دفتر کا ڈرائیور اس کے کمرے میں آ کر کچھ دیر ستا لیتا...... صاحب جی تنگ آ گیا ہوں، پہلے صاحب کے بچوں کو سکول چھوڑنا، پھر صاحب کو دفتر لے کر آنا، پھر واپس گھر جا کر کچن کے لیے سودا لانا کہ بیگم صاحب کو تازہ سبزی گوشت پسند ہے، پھر انھیں بازار لے کر جانا، شاپنگ کرتی ہیں 'اف' ایک ایک دوکان سے گھنٹہ گھنٹہ باہر ہی نہیں آتیں، پھر بچوں کو اسکول سے واپس لانا، صاحب کو گھر لے جانا، پھر شام کو...... رات ہو جاتی ہے...... اور سرکاری پٹرول، صاحب پٹرول کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہتا......

"صاحب، تھوڑی سی روٹی تو نہیں بچی؟" وہ ٹفن اس کی طرف بڑھا دیتا۔ یہ اس کی

پرانی عادت ہے، تھوڑا سا زائد کھانا لانا۔ ڈرائیور تشکر سے اس کی طرف دیکھتا ہے..... صاحب، اس ملک کا کیا بنے گا، ہماری تو ساری آمدنی ان لوگوں کے پٹرول پر ہی خرچ ہو جاتی ہے....... آج صاحب کے گھر کا سرکاری ٹیلی فون بل جمع کرا کے آیا ہوں، چالیس ہزار..... بیگم صاحبہ روزانہ گھنٹوں اپنی ماں سے کراچی بات کرتی ہیں..... صاحب جی۔"

اللہ بخش فوراً اس کے حکم پر حرکت میں آجاتا ہے۔

لیکن اب کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا ہے کہ اللہ بخش بھی تھک گیا ہے۔ یا پھر یہ کہ اب ہر قدم پر اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آخر ایک جن ہے، صرف ایک، اور ایک یا دو تین، چار، پانچ...... اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے احساسِ زیاں کی بجائے قہقہوں اور لذت کی سسکاریاں سنائی دیں تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے...... اس کے پاس تو صرف ایک اللہ بخش ہے...... یہ اللہ بخش اس کے احکام کی تعمیل کر کر کے تھک گیا ہے۔

ایک دن اس نے کہا...... "آقا! یہاں ہر چیز الٹی ہے، میں انھیں سیدھا نہیں کر سکتا۔"

"ہاں" اس نے سر ہلایا، ایک سرد آہ بھری اور بولا...... "یہ ملک، ملک جیسا ہے، یہ حکومت، حکومت جیسی ہے، یہ 'لوگ' لوگوں جیسے ہیں...... جہاں ہر شے اصل کی بجائے جیسی ہو وہاں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

اللہ بخش چپ رہا۔

اس نے پھر سرد آہ بھری اور کہنے لگا..... "میرے پاس تو اب خواب ہی رہ گئے ہیں اور اب میرے خوابوں میں بھی یہ سب کچھ ہونے لگا ہے، اللہ بخش! میرے خوابوں کو ٹھیک کر دو۔"

اللہ بخش سوچتا رہا، تا دیر سوچتا رہا، پھر بولا...... آقا! جب خوابوں میں سے لذت چلی جائے اور ان میں دن کی تکرار ہونے لگے تو یہ خواب نہیں ہوتے، ذہنی روگ بن جاتے ہیں اور جب خواب، خواب نہ رہیں تو دن کی اذیت رات کی اذیت، اور رات کی اذیت دن کی اذیت بن جاتی ہے۔"

وہ خاموش رہا، پھر اتنی مدھم آواز کہ خود اسے بھی سنائی نہیں دیا، کہنے لگا "...... اللہ بخش! میری مصیبتوں کا کوئی حل نہیں کہ ان کا ذمہ دار میں خود ہوں، جب ظلم سہنے میں لذت آنے لگے تو کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، اللہ بخش میں تمھیں آزاد کرتا ہوں!"

اللہ بخش نے کوئی جواب نہ دیا، دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

OO

بادِ صبا کا انتظار

سید محمد اشرف

ڈاکٹر آبادی میں داخل ہوا۔

راستے کے دونوں جانب اونچے کشادہ چبوتروں کا سلسلہ اس عمارت تک چلا گیا تھا جو لکھیا اینٹ کی تھی اور جس پر چونے سے قلعی کی گئی تھی۔ چبوتروں پر انواع واقسام کے سامان ایک ایسی ترتیب سے رکھے تھے کہ دیکھنے والوں کو معلوم کیے بغیر قیمت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ سامان فروخت کرنے والے مختلف رنگوں اور نسلوں کے نمائندے تھے جو اپنی اپنی دوکانوں پر چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ چبوتروں کا یہ سلسلہ اس عمارت پر جا کر ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ عمارت کے دوسرے رخ پر اسی طرح کے چبوترے انواع واقسام کے سامان کے ساتھ سجے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ راستے میں گٹھیلے بدن کے مرد، کندھے پر مشکیزے لٹکائے ہاتھوں میں کٹورا پکڑے بجا رہے تھے اور چھڑکاؤ کرتے پھر رہے تھے۔ خریدار مختلف قبیلوں، گروہوں اور رنگوں کی پوشاک پہنے اس چبوترے سے اس چبوترے تک آجا رہے تھے۔ راستہ طرح طرح کی شیریں، نرم، سخت، کرخت، بھدی، چیختی ہوئی، دھی سکھی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔

لکھیا اینٹ کی سفید عمارت کی دیواریں ناقابل عبور حد تک اونچی نہیں تھیں۔ ان میں جگہ جگہ در، دریچے اور روشندان تھے اور ان سے آتی ہوئی حق، حق کی پر اسرار گونج دار آوازیں بازار میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ بازار میں کھڑے ہو کر ان آوازوں کو سن کر ایسا لگتا تھا جیسے ان آوازوں کے جسم ہوں اور ان جسموں پر دراز سفید ریشم جیسی داڑھیاں ہوں اور کانوں

سے نیچے تک کھیلتی ہوئی نرم نرم کاکلیں ہوں۔ ان آوازوں کو سن کر ایک ایسے سکون کا احساس ہوتا جو سخت لو میں، کوسوں کا سفر پا پیادہ طے کرنے کے بعد ٹھنڈی صراحی کا سوندھا سوندھا پانی سیر ہوکر پینے پر ملتا ہے۔ نیچی نیچی دیواروں والی اس نورانی عمارت کو چاروں طرف سے ستونوں، برجیوں، مناروں اور پھاٹکوں نے گھیر رکھا تھا جو بظاہر کسی محل کی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ کسی نے شاید بہت کوشش کی بھی نہیں اور اگر کرتا بھی تو غالباً یہ جاننا بہت مشکل ہوتا کہ بازار اس سفید عمارت کو گھیرے ہوئے ہے یا بازار اس سفید عمارت کا باہری حصہ ہے یا یہ دونوں ستونوں اور مناروں والی عمارت کے ناقابل تقسیم حصے ہیں۔ یہ تینوں کسی واحد نقشے کی بنیادی لکیروں کی طرح ایک دوسرے سے متصل اور مسلسل تھے۔ محل نما عمارت کے اندر سے کبھی کبھی تیز آوازیں بلند ہوتیں جو سفید عمارت کے 'ھوحق' اور بازار کی چہکتی رنگا رنگ آوازوں پر ایک لمحے کے لیے چھا جاتیں۔ کبھی کبھی یہ وقفے طویل بھی ہو جاتے۔ پھر اچانک یہ بھی ہوتا کہ بازاروں کی آوازیں دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے لب ولہجہ میں بلند ہوتیں ان میں کھنکناہٹ پیدا ہوتی بہت سی آوازیں مل جاتیں اور پھر سفید عمارت کی نورانی کا کل دار آوازیں بازار کی آوازوں کے ساتھ مل کر محل کی سب آوازوں کو ڈھانپ لیتیں۔

ڈاکٹر نے ہاتھ لگا کر جنیو برابر کیا، گلے میں پڑے آلے کو ٹٹول کر محسوس کیا اور ہاتھ میں تھامے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے اس اونچے مستطیل کمرے میں داخل ہو گیا جو اس آبادی اور عمارتوں کے عین درمیان میں واقع تھا۔ ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر اس نے کمرے کی سوگوار ٹھنڈی خاموشی بھری فضا سے خود کو ہم آہنگ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس بے پناہ حسین کمرے کو دیکھ کر سہم گیا ہو۔ کمرے کے درمیان مدوّر پایوں کی ایک بڑی اور حسین مسہری پڑی تھی جس کے سرہانے کے سیاہ حصے میں نفیس کام بنا ہوا تھا۔ مسہری پر قیمتی اور مرعوب کرنے والا بستر لگا ہوا تھا اور اس بستر پر وہ بدن رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد نہایت حسین وجمیل خاتون تھی۔ اس کے بال ترکی نژاد عورتوں کی طرح سنہرے تھے جن سے عمر کی شہادت نہیں ملتی تھی۔ اس کی پیشانی شفاف اور ناک ستواں اور بلند تھی۔ آنکھیں نیم وا اور سرمگیں تھیں۔ ہونٹ اور رخسار بیماری کے باوجود گلابی تھے۔ ہونٹ بھی نیم وا تھے اور سفید موتی سے دانت ستاروں کی طرح سانس کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ رہ رہ کر دمک رہے تھے۔ شفاف گردن پر نیلگوں مہین رگیں نظر آرہی تھیں اور گردن کے نیچے کا عورت کا حصہ اٹھا ہوا اور مخروطی تھا۔ ساعدِ سیمیں کولہوں کے ابھار سے لگے

ہوئے رکھے تھے۔ ڈاکٹر نے غور سے اس کے ہاتھوں پیروں کو دیکھا اور ایک عجیب بات محسوس کی کہ خاتون کے بھرے بھرے ہاتھ اور پیر محنت کے عادی ہونے کی غمازی کر رہے تھے لیکن انھیں نرم اور صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مریضہ کی سانس بے ترتیب تھی۔ کئی کئی لمحوں تک بدن ساکت نظر آتا پھر یکا یک جھٹکے کے ساتھ بے ترتیب سانسیں آنے لگتیں۔

مسہری سے ٹکا ہوا وہ دراز قد شخص استادہ تھا جس کے سر اور بالوں کو ایک گوشے دار کلاہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سرخ وسفید معمر چہرے پر خوبصورت داڑھی تھی جو باترتیب نہیں تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں جلال و جمال کی پرچھائیاں رہ رہ کر چمکتی تھیں۔ اپنی شخصیت اور لباس سے وہ کبھی بادشاہ لگتا کبھی درویش۔ ڈاکٹر مسہری کی دوسری طرف اس شخص کے مقابل سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر دیر تک مریضہ کو دیکھتا رہا۔ وہ شخص متفکر آنکھوں سے مریضہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ دفعتاً ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ اس بڑے مستطیل کمرے کے چاروں طرف بہت سے کمرے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان پردوں کے پیچھے چوڑیوں کی کھنکناہٹ دھیمی دھیمی مغموم سرگوشیاں اور دبی دبی آہیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی کسی کمرے میں نوعمر بچوں کی شور مچانے والی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ جب ان آوازوں کا شور ایک خاص آہنگ سے زیادہ بلند ہو جاتا تو دراز قد شخص کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں کھنچ جاتیں۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ پردے کے پیچھے سے بلند ہونے والی سرگوشیاں قابل فہم ہیں لیکن ان کا تعلق کسی ایک زبان سے نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے قدرے توقف کے بعد مرض کا حال جاننے کے لیے اس شخص کے رشتے کے بارے میں سوچا۔

''یہ........آپ کی کون ہیں؟''

''عزیزہ ہیں''

''کیا؟''

''عزیزہ کا مطلب بہت عزت والی اور بہت پیاری بھی''

''آپ سے سمبندھ کیا ہے؟''

''میں ہی رب مجازی ہوں۔''

ڈاکٹر آنکھیں پھیلائے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر آواز صاف کر کے بولا۔ ''ڈاکٹر

ہونے کے ناطے مجھے جاننا چاہیے کہ روگی کو کیا روگ ہے۔ روگ کے بارے میں جاننے کے لیے آپ سے ان کے سمبندھ کے بارے میں پوچھنا آوشک ہے۔ آپ جو سمبندھ بتا رہے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔''

دراز قد انسان تکلیف کے ساتھ مسکرایا۔

''''آپ معلوم کیجئے جو کچھ میرے علم حضوری میں ہے آپ کے روبرو پیش کروں گا۔''

ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس جملے کو مکمل طور پر نہ سمجھ پانے کے باوجود مطمئن ہے کہ وہ شخص مریضہ کے بارے میں بہت کچھ یا سب کچھ جانتا ہے۔

''یہ دشا کب سے ہے؟''

''بہت عرصے سے۔''

پھر دیر تک خاموشی رہی۔ خاموشی اور زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھی کہ برابر کے کمروں سے اسی تازہ شہر مگر نامانوس زبان میں سرگوشیاں بلند ہو رہی تھیں۔

دراز قد انسان نے ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی پڑھی اور اس بار وہ تفصیل سے گویا ہوا۔

''عزیزہ...... میری مراد مریضہ نے مدتوں سے غذا کو منھ نہیں لگایا۔ گھریلو نسخوں سے تیار شدہ ادویات ہونٹوں تک تو پہنچ جاتی ہے لیکن معدے تک نہیں جا پاتیں۔ مریضہ اپنے مرض کا اظہار بذات خود کبھی نہیں کرتیں۔ کبھی کبھی جلد بدن بخار کی شدت سے سرخ ہو جاتی ہے۔ ہاتھ رکھ کر محسوس کیا جائے تو تھوڑی ہی مدت میں بدن نم اور برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے اور زندگی کے سارے آثار ختم ہوتے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تنفس کی بے ترتیبی تردد کا سب سے بڑا سبب ہے۔''

''کس چیز کی بے ترتیبی'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''تنفس کی، مراد سانسوں کی بے ترتیبی۔''

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور جھجھکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں روگی کو آلہ لگا کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''ضرور۔ عزیزہ کبھی بھی پردہ نشین خاتون نہیں رہیں۔''

مریضہ کی سانسیں اس وقت نسبتاً معمول پر تھیں۔ ڈاکٹر نے سینے پر پڑے کام دار دوپٹے کو تہذیب سے ایک طرف کیا اور سینے پر آلہ رکھ کر غور سے سنا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے

پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے آلہ ہٹایا اور کان لگا کر کمرے کے ہر کونے سے ابھرتی مہین سے مہین آواز کو سننا چاہا۔ کمرے میں سانسوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے پھر آلہ لگایا۔ اس کے چہرے پر پھر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ دیر تک آلے کو سینے پر رکھے آنکھیں بند کیے کچھ سنتا رہا۔ مریضہ کے چہرے پر، جتنے وقت تک آلہ رہا اطمینان رہا۔ ڈاکٹر نے آلہ ہٹایا اور بے چین آواز میں بولا۔

"روگی کا دل بہت اچھی حالت میں ہے۔ کسی روگ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔"

دراز قد انسان کے چہرے پر کوئی تغیر نمودار نہیں ہوا۔

"کیا اس بات سے آپ کو اچرج نہیں؟"

"نہیں" دراز قد انسان کا جواب مختصر تھا۔ ڈاکٹر کو اس جواب کی امید نہیں تھی لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"اب جو بات آپ کو بتاؤں گا اسے سن کر آپ اچھل پڑیں گے۔ روگی کے دل سے سنگیت کی لہریں نکل رہی ہیں جنھیں میں نے کئی بار سنا۔"

دراز قد انسان دھیمے سے وقار کے ساتھ مسکرایا اور آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

دراز قد انسان کے اطمینان پر ڈاکٹر کو حیرت ہوئی لیکن اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"ہردے کی چال سے جو دھن پھوٹ رہی تھی اس میں ندی کے بہنے کی کل کل تھی۔ ہوا کی مدھ بھری سرسراہٹ تھی، پنچھیوں کی چہکار تھی......"

دراز قد انسان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ڈاکٹر کو محسوس ہوا کہ دراز قد انسان کسی پچھلی بات کو یاد کر کے کہیں کھو گیا ہے۔ دراز قد انسان گویا ہوا۔

"اس آواز میں میدان جنگ میں طبل پر پڑنے والی پہلی ضرب کی آواز کا ارتعاش بھی ہوگا۔ دو محبت کرنے والے بدن جب پہلی بار ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے ہونٹوں سے محسوس کرتے ہیں وہ نرم لذت بھری آواز بھی ہوگی۔ ملاگیری رنگ کی عبا پہنے صوفی کے نعرۂ مستانہ کی گونج بھی ہوگی۔ دربار میں خون بہا کا فیصلہ کرنے والے بادشاہ کی آواز کی گرج بھی شامل ہوگی۔ صحراؤں میں بہار کی آمد سے متشکل ہونے والی زنجیر کی جھنک بھی ہوگی اور بنجر زمین پر پڑنے والے موسم برشگال کے پہلے قطرے کی کھنک بھی ہوگی۔ بربط، ستار اور طبلے کی......" وہ خاموش ہو گیا۔

''ہاں کچھ اس پرکار کی آوازیں ہیں پر انھیں شبدوں میں بتا پانا بہت کٹھن ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔
اچانک برابر کے کمرے سے ایک نوعمر لڑکا نکلا۔
''ڈاکٹر نے لیڈی کو کیا روگ بتایا اندر سے انکوائری کی گئی ہے۔''
یہ آواز سنتے ہی مریضہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور سانسیں یکا یک بے ترتیب ہو گئیں۔ دراز قد شخص کے چہرے پر ناگواری کا دھواں پھیل گیا۔
''اندر جاؤ۔ اندر جاؤ۔ خبر دار بلا اجازت یہاں قدم نہ رکھنا۔'' نوعمر بچہ حیرت سے اسے دیکھتا ہوا اندر چلا گیا۔
ڈاکٹر نے مریضہ کے سنہرے بالوں میں کنگھی کرنے والے انداز سے جڑوں تک انگلیاں لے جا کر کاسہ سر پر ہتھیلی جما دی۔
''فیور بڑھ رہا ہے'' وہ بڑبڑایا۔ پیشانی کے پسینے کے قطروں سے اپنی ہتھیلی کو نم کرتا ہوا وہ آنکھوں تک ہاتھ لے گیا۔ انگوٹھے کے نرم پیٹ سے آنکھ کے پپوٹے کو آہستگی سے اوپر اٹھایا۔ آنکھوں کی سفیدی چمکی۔ رخساروں کی گرمی ہاتھ کی پشت سے محسوس کرتا ہوا وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

''شریر ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔''
دراز قد انسان کے چہرے پر فکر کے سائے تھرتھرائے۔ وہ دھیمے سے بولا۔
''اصل مرض کا تعلق تنفس سے ہے۔''
ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر مریضہ کے ابھرتے ڈوبتے سینے پر آنکھیں جما دیں اور بے ترتیب سانسوں کا معائنہ کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے سیدھے کھڑے ہو کر بہت یقین کے ساتھ کہا۔
اس روگی کے سارے شریر میں جیون ہے۔ کیول سانس کی پرابلم ہے اور یہی سب سے بڑی پرابلم ہے۔ پھیپھڑے کی خرابی کا کوئی علاج نہیں ہے۔''
''کیا آپ کو یقین کامل ہے کہ اعضائے تنفس قطعاً بیکار ہو چکے ہیں؟'' ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کو آسان زبان میں سوال سمجھایا۔
ڈاکٹر نے آلہ لگا کر پہلی بار پھیپھڑوں کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔
''بڑی وچتر بات ہے۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہیں پر پوری سانس نہیں لے

پار ہے۔''

پوری سانس لینے سے بدن کے دیگر اعضاء کی قوت کا کیا تعلق ہے''؟ دراز قد انسان نے سوال کیا۔

''بہت بڑا سمبندھ ہے۔ تازہ ہوا جب پھیپھڑوں کے راستے رکت میں ملتی ہے تو جیون کا سروپ بنتا ہے۔ وہ جیون رکت کے ساتھ مل کر شریر کے ہر انگ کو شکتی دیتا ہے۔ پوری ہوا نہ ملے تو رکت......لال رکت تھوڑی دیر بعد نیلا پڑ جاتا ہے اور شریر کے ہر بھاگ میں روگ چھا جاتا ہے۔''

''آپ کا گمان ہے اعضائے تنفس اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں تو پھر بدن میں تازہ ہوا کی کمی کیوں ہے؟''

''شریر میں تازہ ہوا کی کمی اس لیے ہے کہ اس کمرے میں تازہ ہوا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''اس کمرے میں کھلنے والے باقی کمروں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور ان کمروں میں باہر کی طرف بے شمار کھڑکیاں ہیں'' دراز قد انسان نے تفصیل سے بتایا۔

''پر مجھے لگتا ہے کہ کسی کھڑکی سے تازہ ہوا نہیں آ رہی۔''

دفعتاً برابر کا ایک کمرا کھلا اور ایک نوعمر لڑکی فراک اسکرٹ پہنے داخل ہوئی۔

''مامانے پوچھا کہ لیڈی کا فیور ڈاؤن ہوا کہ نہیں؟''

مریضہ کا بدن ایک لمحے کو تڑپا اور سانس پھر بے ترتیب ہو گئی۔

''دور ہو جاؤ میرے نگاہوں کے سامنے سے۔ ناہنجا'' دراز قد انسان شدید طیش کے عالم میں دانت پیستے ہوئے آواز کے آہنگ کو کم کرتے ہوئے بولا۔

''''آپ اینگری کیوں ہوتے ہیں۔ میرے کو حال پوچھنے اندر سے ماما بھیجتی ہے۔ میری مسٹیک کدھر ہوتی۔'' لڑکی نے ناک پھلا کر احتجاج کیا۔

اس لڑکی کے الفاظ، لہجے اور آواز سے دراز قد انسان پر پاگل پن جیسا دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے بہ مشکل اسے سمجھایا۔ لڑکی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔

پھر ڈاکٹر بولا۔''میرے پاس ایک ہی دوا ہے۔ اس پرکار کے روگی کے لیے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس ایک ہی میڈیسن ہوتی ہے۔ وہ میڈیسن دے کر پھیپھڑوں کی باریک

نسوں کو پھلایا جا سکتا ہے تا کہ ان میں تازہ ہوا بھلی بھانت بھر جائے۔ پر.........''

''پر کیا؟.......دراز قد انسان نے بے صبری سے پوچھا۔

''پر یہ دوا تبھی کام کرتی ہے جب روگی کو اچھی ماترا میں تازہ ہوا مل سکے۔ تبھی تو پھیپھڑوں کی پھولی ہوئی نسوں میں ہوا جا سکے گی۔ جب تازہ ہوا ہی نہ ہو تو کیول پھیپھڑوں کی نسوں کو پھلا کر کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''تب؟'' دراز قد انسان نے متفکر ہو کر پوچھا۔

''اس کا کوئی اُپائے نہیں ہے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ مایوسانہ تھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

''کیا روگی کا کمرہ بدلا نہیں جا سکتا'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں یہ عزیزہ کا مخصوص کمرہ ہے۔ زندگی اسی میں گزری ہے۔ باہر پھیلی تمام عمارتوں کے درمیان یہ کمرہ عزیزہ کے علاوہ کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔''

''لیکن روگی کو اس کمرے کے علاوہ دوسرا کمرہ تو دے سکتے ہیں۔''

''لیکن بنا تازہ ہوا کے روگی اتنے دن تک جیوت کیسے رہا؟''

تازہ ہوا کی کمی کا مسئلہ بہت پرانا نہیں ہے۔ اس کمرے کے چاروں طرف مریضہ کے متعلقین کے کمرے ہیں۔ ان میں دریچے اور روشندان ہیں، دروازے ہیں لیکن وہ لوگ ان کو کھولتے نہیں۔''

''کیا ان لوگوں کو دوسروں سے ملنے کے لیے اپنے کمروں سے نکلنا نہیں پڑتا؟''

''نہیں۔ انھوں نے سہولت اور آرام کے پیشِ نظر دوسروں سے ملنے کے لیے اندر ہی اندر دیواروں میں راستے بنا لیے ہیں۔''

''پھر تو بہت اچنبھے کی بات ہے کہ روگی اب تک جیوت کیسے ہے۔ دن رات اسی پرانی ہوا میں جیوت رہنا بہت کٹھن ہے۔''

''نہیں۔ دراصل اس عمارت کے ایک کمرے میں شام ڈھلے باہر کا دروازہ کھلتا ہے اور تازہ ہوا کی ایک لہر اندر آجاتی ہے۔ شاید اسی سے کاروبارِ ہستی قائم ہے۔ یوں بھی عزیزہ بہت سخت جان ہے۔'' وجیہہ مرد نے بستر پر لیٹی خاتون کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"میں نے اس پرکار کا روگی پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان کے اور ناطے دار بھی ہیں۔ کبھی کبھی بیماری پرکھوں سے بھی مل جاتی ہے۔"

"عزیزہ کی کئی بہنیں ہیں۔ ایک بہن بہت معمر ہے۔ اس کا گھر اس ملک سے باہر ہے۔ وہ نوجوانوں کی طرح تروتازہ ہے۔ وہ اپنے دیس کے باہر بھی عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔"

"اور؟"

"ایک بہن جو اس سے کچھ بڑی ہیں وہ بھی اس ملک سے باہر رہتی ہیں اور اپنے ملک میں بہت خوش وخرم ہیں۔ تمام تر عیش ولذت کوشی ان کی قسمت میں نوشت کردی گئی ہے۔ ایک بہن اس ملک میں بھی ہے۔ اور بہت آرام سے ہے۔ اس کے متعلقین عزیزہ کو بھی اس کی روش پر چلانا چاہتے ہیں لیکن مریضہ کے عزیزوں نے انکار کردیا۔"

"کیا اس بہن کے چال چلن میں کوئی برائی ہے؟ ڈاکٹر نے آلہ گردن میں لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی برائی نہیں لیکن اگر عزیزہ اس کی چال چلتی تو اپنا آپا کھودیتی۔"

اچانک دراز قد شخص کو کچھ یاد آیا۔ وہ ہلکے ہلکے جوش کے انداز میں گویا ہوا۔ "عزیزہ کے بزرگوں میں ایک ضعیفہ ہے۔ ان کے گھر والے انھیں بہت عزت دیتے ہیں لیکن کبھی گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ مسموع ہوا کہ وہ طاقت ور ضعیفہ محبوس ہو کر اب کمزور ہوگئی ہیں۔ ان کے متعلقین احتراماً انھیں سلام تو کر لیتے ہیں لیکن کوئی ان کے پاس دیر تک بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔"

یکا یک کسی پردے کے پیچھے سے دال بھات مانگنے کی آواز آئی۔ یہ ایک شیریں نسوانی آواز تھی۔ وہ آواز تھوڑی دیر بعد رام سیتا، لنکا اور ہنومان کے قصے سنانے لگی۔

ڈاکٹر نے دراز قد انسان کو حیرت سے دیکھا جیسے اسے اعتبار نہ آیا ہو لیکن دراز قد انسان کے چہرے کے سنجیدہ تیوروں نے ڈاکٹر کا اعتماد اسے واپس کیا۔

ڈاکٹر نے مریضہ پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"آپ بتا رہے تھے کہ شام ڈھلے برابر کے کمرے کی کھڑکی سے تازہ ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے؟"

"ہاں! حالاں کہ وہ وقت شام کا وقت ہوتا ہے لیکن وہ ہوا بادِ صبا کی طرح دل خوش

کن ہوتی ہے۔''

''کیا شام ڈھل چکی'' دراز قد انسان نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں ابھی کچھ دیر ہے۔ کیا آپ کو سمے بیتنے کا اندازہ نہیں ہوتا؟ دراز قد انسان خاموش رہا۔ اس سوال کے اندر ایسا کچھ تھا جس نے اسے مزید بے چین کر دیا۔

ڈاکٹر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب یہ نظریں سوئی بن کر دراز قد انسان کے چہرے پر جگہ جگہ کھب گئیں تب اس نے گہری اور مجبور آواز میں کہا۔

''نہیں؟''

''اچرج کی بات ہے۔'' ڈاکٹر اور کچھ نہیں بول سکا۔

لیکن اس کی نگاہیں مرد کے چہرے پر جمی رہیں۔ مرد ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ دھیمے دھیمے گویا ہوا۔

''بہت دنوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر گھڑی وقت غروب چھایا ہوا ہے۔''

''کیا آپ بھی ہر وقت دیواروں کے بیچ بند رہتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

اس مرتبہ مرد کی خاموشی مہیب تھی۔ ڈاکٹر سہم کر رہ گیا۔

مرد نے ڈاکٹر کی دلی کیفیات کا اندازہ لگا لیا۔ شگفتہ لہجے میں بولا۔

''بہت سی باتیں پراسرار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں بھید پر سے پردہ ہٹا بھی دوں تب بھی آپ پوری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔''

دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر ڈاکٹر نے پہل کی۔

''میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب تازہ ہوا کا جھونکا اس کمرے میں آتا ہے تو روگی کی حالت میں کس طرح کا فرق آتا ہے؟''

''شام ڈھلے آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''شام ڈھلنے میں ابھی دیر ہے۔''

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس مرد کے علاوہ کسی اور کو خاتون کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مریض کی حالت پوچھنے والیوں کو اس نے دیکھا نہیں لیکن اتنا اندازہ تھا کہ وہ بھی مریض کی حالت میں بس اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہیں جیسے لوگ

موسم کی تبدیلی کے بارے میں ایک دوسرے سے معلوم کرتے ہیں۔ اس کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی کہ اس رعب دار مرد کی اس آبادی میں کیا حیثیت ہے۔ اس عمارت کے دوسرے مکینوں سے اس کا کیا تعلق ہے اور باہر پھیلی ہوئی اس بستی سے مرد کا کیا علاقہ ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر سوال اٹھ رہے تھے لیکن وہ مرد کے لہجے کی سنجیدگی اور موقع کی نزاکت کے پیش نظر زیادہ سوالات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ گھما کر معلوم کرنا چاہا۔

''یہ باہر کا علاقہ کس کا ہے؟''

''کیا آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔ بس دور سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے میں یہ پوری آبادی بہت اچھی لگتی تھی۔ دور سے ان عمارتوں کی اونچائی، مضبوطی اور پرانا پن من کو کھینچتا تھا۔ آج قریب سے بازار بھی دیکھا۔ رنگا رنگ چیزیں، طرح طرح کی پوشاکیں، الگ الگ نسلوں کے لوگ، پھر ہو حق کرتی سادھو سنتوں کی آوازیں۔ میں زیادہ نہیں دیکھ پاتا تھا۔ لیکن لکھیا اینٹ کی باہر کی ایک عمارت کو دیکھ کر من کو بہت شانتی ملی کہ اس آبادی میں ایسی سادگی بھی ہے۔''

''آیئے میں آپ کو آبادی کی ایک جھلک دکھا دوں۔ جب سورج ڈھلنے کا وقت قریب آجائے تب مجھے بتا دیجئے گا۔ ہم لوگ مریضہ کے پاس واپس آجائیں گے۔''

ساگوان کے سیاہی مائل اونچے دروازوں کو کھول کر وہ دونوں باہر نکلے۔ غلام گردش میں کئی طرح کے لوگ ملے لیکن کوئی ان دونوں سے مخاطب نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مخاطب کوئی نہیں ہوتا لیکن تمام افراد اس بارعب، وجیہہ اور خوش پوش مرد کو عقیدت و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلام گردش کا یہ حصہ چوڑی سیڑھیوں والے ایک زینے کے مقابل تھا۔ دونوں اس پر چڑھے۔ اونچی اونچی چھتوں والی بے شمار عمارتوں کو عبور کرتے ہوئے وہ لوگ زینے پر چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ سب سے اونچی چھت آگئی۔ چھت پر کنگورے دار حصار تھا۔ مرد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حصار کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ نیچے پوری بستی پھیلی ہوئی تھی۔ چھت پر ابھی سورج کی زرد شعائیں تھیں لیکن نیچے —— بہت نیچے بستی میں اندھیرا اتر چکا تھا۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اندھیرا اترنے کے باوجود نیچے ابھی بھی رونق ہے۔ تب اسے محسوس ہوا کہ رونق کا لطف روشنی سے نہیں آبادی سے ہوتا ہے۔ یہ بلند اور مضبوط عمارت چاروں طرف سے بازاروں سے گھری ہوئی تھی اور اس عمارت سے متصل لکھیا اینٹ کی وہ عمارت بھی

ریشم جیسے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی جہاں اس نے ہوحق کی صدائیں سنی تھیں۔

"یہ سب کس کا ہے؟" اس نے نیچے آبادی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

یہ عمارتیں، یہ ستون، یہ بالا خانے، یہ حصار، یہ بازار یہ ہوحق کی صدائیں یہ سب میری ہی......ان سب کا مجھ سے ہی علاقہ ہے۔"

مرد نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

لکھیا اینٹ کی اس سادہ عمارت میں کچھ سفید پوش سائے نظر آئے جن کے چہروں کے خطوط ملگجے اندھیرے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔

"وہ......وہ کون لوگ ہیں؟" ڈاکٹر نے بے صبری سے پوچھا۔

مرد نے ادب سے ان سایوں کو دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔

"وہ عمارت اور سفید پوش ہوحق کی صدائیں بلند کرنے والے سب اسی بستی کا حصہ ہیں۔ بازار کے تمام افراد بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں۔ اس عمارت کے سارے مکین بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں اور یہ سب کے سب اس مریضہ کی بیماری سے آدھے ادھورے رہ گئے ہیں۔"

"مطلب" ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سب اسی خاتون کے حوالے سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ شعوری طور سے کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ مریضہ ان کے لیے کتنی کارآمد ہے لیکن جب سے وہ بیمار ہوئی ہے، کمزور ہوئی ہے سب خود میں کچھ نہ کچھ کمی پا رہے ہیں۔"

"یہ باتیں تو پہیلیوں جیسی ہیں۔" ڈاکٹر دھیمے سے بولا۔ اب اسے ڈر لگنے لگا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا تھا۔ جب سورج کی آخری شعاع ماند ہو کر اندھیرے میں کھو گئی تو اس پھیلی ہوئی آبادی میں استادہ اس عظیم الشان عمارت کی وسیع و عریض چھت کے حصار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے خود کو مرعوب پایا۔ لیکن اب اس سے رہا نہیں گیا۔

"روگی کون ہے آپ نے اب تک نہیں بتایا؟ آپ نے اب تک روگی سے اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" چھت کی کھلی فضا میں ڈاکٹر نے ہمت پا کر سوال کیا۔

مرد حصار کے نیچے جھانکتا رہا۔ پھر یکایک بولا۔

"آپ خود کچھ نہیں سمجھ سکے؟" مرد کی آنکھوں میں ایک دکھ بھرا سوال تھا۔

تب ڈاکٹر کو اچانک ایسا لگا جیسے پردہ سا ہٹ گیا ہو۔ اسے یاد آیا جب اس نے

مریضہ کے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں تو اسے کچھ آوازیں بھی سنائی دی تھیں جنھیں وہ اس سے پہلے بھی بار ہا سن کر خوش ہو چکا تھا۔

اب اس نے بغور اس وجیہہ مرد کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''شام ڈھل گئی ہے۔ آیئے نیچے چلیں۔ روگی کو دیکھ لیں۔''

وہ دونوں تیزی سے نیچے اترے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ برابر والے کمرے سے ہوا کے تازہ جھونکے آ رہے ہیں۔ مریضہ بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے وقار کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر سرخی جھلک آئی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر اس نے کوئی تکلف نہیں کیا لیکن مرد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے جذبے لہرائے۔

''کیسی ہو؟'' مرد نے کمال محبت کے ساتھ قریب جا کر دھیرے سے پوچھا۔

وہ بدقت مسکرائی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے مرد کا جائزہ لیا اور ادب سے بولی۔

''اس وقت تو اچھی ہو جاتی ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہارے اعضائے رئیسہ مکمل طور پر تندرست ہیں۔ بس سانس لینے بھر کو تازہ ہوا کی کمی ہے۔''

مریضہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔'' وہ دیر کے بعد بولی۔

''تم جانتی ہو کہ اس بستی کا کاروبار ہستی میری وجہ سے قائم ہے۔ تم نصیب دشمناں ختم ہو گئیں تو دھیرے دھیرے سب کچھ خس و خاشاک ہو جائے گا۔''

''کیا'' ڈاکٹر نے انھیں روک کر پوچھا۔ ''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ برابر والے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہے اور تازہ ہوا آتی رہے۔''

''برابر والے کمروں میں جہاں مکین ہیں وہیں کچھ نوجوان بھی ہیں۔ چاروں طرف بنے ان کمروں میں صرف ایک کمرہ ایسا ہے جس کے مکین نے باہر کی کھڑکی کھول رکھی ہے۔ شام کو جب وہ واپس آتا ہے تو دروازہ کھول دیتا ہے۔ تبھی تازہ ہوا کے جھونکے اندر آپاتے ہیں۔ دن بھر روزی روٹی کے چکر میں مارا مارا پھرتا ہے۔ شام ڈھلے واپس آپاتا ہے۔''

باقی لوگ بھی اپنی رہائش گاہوں کی کھڑکیاں کھول کر ادھر والے دروازے نہیں کھول سکتے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''غالباً انھیں اب اس خاتون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''اس نوجوان کو دلچسپی کیوں ہے؟''

''کیوں کہ وہ اس خاتون کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''کیوں کہ اسے اپنے اجداد سے محبت ہے۔''

یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔'' ڈاکٹر نے بہت مایوسی کے عالم میں کہا۔

''میں نے پہلی ہی عرض کیا تھا کہ اگر میں کچھ بتانا بھی چاہوں تب بھی ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کی سمجھ میں آسکے۔'' مرد نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا میں کچھ کر سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے جیسے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

''آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں؟''

تب ڈاکٹر نے بہت مضبوط لہجے میں لیکن ادب کے ساتھ کہا۔ میں صرف پھیپھڑوں کو مضبوط کرنے والی دوا دے سکتا ہوں لیکن پھیپھڑوں کو مضبوطی کی اصل دوا در اصل تازہ ہوا ہوتی ہے۔'' اس ماحول میں اتنی دیر تک رہنے کے بعد وہ اب صاف وشفاف زبان میں بات کر سکتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

''اس عمارت کے تمام نوجوان مکینوں سے کہیے کہ وہ باہر کھلنے والی تمام کھڑکیاں کھول کر اس کمرے کے کھلنے والے دروازے کھول دیں۔''

''اگر وہ ایسا نہ کریں.....تب.....تب.....کیا ہوگا؟'' مریضہ نے بہت بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

''تب'' ڈاکٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تب یہ ختم ہو جائیں گے'' اس نے دراز قد وجیہہ مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حسین وجمیل مغموم مریضہ اور دراز قد وجیہہ مرد نے ایک دوسرے کو کن نگاہوں سے دیکھا، یہ کوئی نہیں دیکھ سکا کیوں کہ ڈاکٹر دھیرے سے بیگ اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔

OO

باغ کا دروازہ

طارق چھتاری

گرمیوں کی تاروں بھری رات نے گھر کے بڑے آنگن کو شبنم کے چھڑکاؤ سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیسے ہی دادی جان نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھی نوروز کود کر ان کے پلنگ پر جا پہنچا۔ ''دادی جان جب سبھی شہزادے باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو گئے تو چھوٹے شہزادے نے بادشاہ سلامت سے کیا کہا......؟''

''نوروز تو اب بڑا ہو گیا ہے۔ کہانیاں سننا چھوڑ......''

''دادی جان یہ کہانی کہاں ہے، یہ تو ہمارے ہی شہر کے باغ کا قصہ ہے۔ باغ کوٹھی والا باغ۔''

''ہاں میرے لال، یہ ہمارے شہر کی بھی داستان ہے اور ان شہروں کی بھی جو ہم نے نہیں دیکھے ہیں۔''

''کیا چھوٹا شہزادہ بھی باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو جائے گا؟''

''اچھا سن......لیکن ہنکارے بھرتے رہنا۔''

''تو چھوٹے شہزادے گل ریز نے بادشاہ سلامت سے کہا۔ بابا حضور مجھے بھی ایک موقع دیجئے۔ بادشاہ نے لختِ جگر پر نگاہ کی اور بولے۔ نہیں جانِ پدر، شرط مشکل ہے اور تو عزیز۔ اگر تیرا پہرا بھی ناکام ہوا تو اس وطن کے آخری ستارے کو بھی شہر بدر ہونا پڑے گا۔ شہر خالی ہو چکا ہے۔ تیرے پانچوں بھائی بھی میری آنکھوں کو ویران کر گئے ہیں۔ باغ پر کسی دیو کا

سایہ ہے جو سخت نگہبانی کے باوجود صبح ہوتے ہوتے سارے چمن کو اجاڑ دیتا ہے۔ پہرے کی کامیابی پر آدھی بادشاہت دینے کا وعدہ ہے۔ مگر تجھے کیا؟ اے میرے خوش بخت فرزند تو، تو پوری سلطنت کا مالک ہے۔ نہیں بابا حضور، میں نے بیڑا اٹھایا ہے، اب آپ حکم دیجیے۔ جیسی تیری مرضی، اور بادشاہ نے شہزادے گل ریز کو رخصت کیا۔ شہزادے نے اپنے ساتھ ایک چاقو اور شیشی میں پسی ہوئی سرخ مرچیں لیں اور باغ کی سمت روانہ ہوا۔ باغ کے دروازے میں داخل ہو، دروازہ بند کر، پہرہ دینے لگا۔ جب رات آدھی ہوئی اور جھپکیاں آنے لگیں تو اس نے چاقو نکال، اپنی کنی انگلی تراش، اس میں مرچیں بھرلیں۔ نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی اور سحر نمودار ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ عرصہ ہوا اس باغ میں ایک فقیر نے ڈیرا ڈالا تھا اور کسی بات پر خوش ہو کر اس قلندر نے شہزادے کو بتایا تھا کہ اس باغ پر ایک دیو کا سایہ ہے۔ جو بھی اس کی پاسبانی کرے گا وہ پو پھٹتے پھٹتے سو جائے گا۔ اگر کسی صورت جاگتا رہ جائے تو دیو پر فتح پائے گا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے، ایک گیم شیم دیو باغ کی فصیل لانگ کر داخل ہوتا ہے اور پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا پھل دار درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ بس شہزادے نے دیکھا اور پلک جھپکتے ہی اس کی دُم سے لٹک گیا۔ دیو ڈال ڈال تو شہزادہ پات پات۔ دیو نے کہا، میں سیر ہوں، شہزادہ بولا، میں سوا سیر۔ دیو پلٹا، شہزادہ کود کر اس کی پیٹھ پر.........''

''سو گیا کیا؟''

''نہیں دادی جان۔''

''اچھا تو سن۔'' اور پھر وہ بہت دیر تک دیو اور شہزادے کے داؤ پیچ بیان کرتی رہیں۔

''آخر کار دیو کی ہار ہونی تھی سو ہوئی۔ بولا تو جیتا میں ہارا۔ اب مجھے چھوڑ، اس کے عوض تجھے سات بال دوں گا، جو وقت ضرورت تیرے کام آئیں گے۔ جب مصیبت پڑے تو ایک بال جلا دینا، باقی بُرے وقت کے لیے رکھ لینا۔''

یہ کہہ کر دادی جان نے اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد سانسوں میں آواز پیدا ہونے لگی اور وہ سو گئیں۔ نوروز رات کو کہانی کی اگلی کڑی سنتا اور دن میں باغ کوٹھی کے چکر لگاتا۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا، پھر ایک دن نوروز نے دادی جان سے کہا۔

''آج کہانی پوری کر کے ہی سوئیے گا دادی جان۔''

''اچھا تو کہاں تک پہنچے تھے؟'' لمحے بھر سوچ کر خود ہی قصے کو مختصراً دہرانے لگیں۔

''شہزادے نے بادشاہت ٹھکرا دی اور اپنے بھائیوں کی تلاش میں راج پاٹ چھوڑ کر چل پڑا۔ بھائی ملے مگر مارے حسد کے اسے سائیس بنا کر رکھا۔ بھائی سویرے نکلتے شام کو لوٹتے اور بہت فکر مند رہتے۔ ایک شب بھائی سمجھے وہ سو گیا ہے مگر وہ جاگ رہا تھا، بھائیوں کو کہتے سنا کہ آج پھر منادی ہوئی ہے کہ جو شخص برج کی محراب میں بیٹھی شہزادی گلشن آرا کو محل کے پہلے دروازے سے پھولوں کی گیند مارنے میں کامیاب ہو جائے گا وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ اشتیاق بڑھا، چھپ کر بھائیوں کے پیچھے پیچھے چل دیا اور یہ ماجرا دیکھا کہ دور دراز ملکوں سے آئے شہزادے اپنی اپنی قسمت آزما رہے ہیں مگر شہزادی جس بارہ دری میں بیٹھی ہے وہاں ہوا کچھ اس رخ سے چلتی ہے کہ شہزادی تک گیند کا پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسے طلسمی بالوں کا خیال آیا۔ ایک بال جلایا، سبز گھوڑا سبز جوڑا تیار اور پھولوں کی ایک گیند جو شہزادے کے اشارے کی تابع دار تھی، ہاتھ میں آ گئی، کامیابی ملی مگر وہ گھوڑے کو لے کر نظروں سے اوجھل۔ دوسرے دن سرخ جوڑا، سرخ گھوڑا اور گیند۔ گل ہزارہ کی گیند شہزادی گلشن آرا کے رخ روشن کو چھوتی اور بکھر جاتی۔ یہ سب اس طرح ہوتا جیسے بجلی کوند گئی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے شہزادہ نظروں سے غائب۔ ساتویں روز سفید جوڑا پہنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ گیند مار کر فرار ہوا تو شہزادی کے منصوبے کے مطابق اس کے داہنے پیر کو محل کے سپاہیوں نے زخمی کر دیا۔ بس شہر بھر میں زخمی پیر والے شخص کی تلاش شروع ہوئی اور ایک سرائے کے پچھواڑے سائیس کے بھیس میں شہزادہ گرفتار ہوا۔ شہزادی کی ضد کے نتیجے میں شادی تو ہو گئی مگر بادشاہ سلامت کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا۔ دونوں کو دو دھڑی ناج اور ایک اشرفی دے کر سلطنت سے نکال دیا۔ ان دونوں نے ایک دنیا بسائی۔ دنیا بسانے کا وہی پرانا طریقہ۔ ایک اشرفی کے کچھ چاول، کچھ ریشم کے دھاگے، کچھ زری کے تار اور کچھ اوزار۔ چاول کے دانے میدان میں ڈالے۔ رنگ برنگی چڑیاں آ کر دانہ چگنے لگیں۔ ان کے پروں کو سمیٹ کر پنکھا بنایا۔ شہزادہ بازار میں بیچ آیا۔ پھر چاول کے دانوں، ریشم کے دھاگوں اور زری کے تاروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہر روز نئی نئی پنکھیاں تیار ہونے لگیں۔ پھر فرشی پنکھے، چھت سے لٹکنے والے پنکھے اور دیوار کے قالین بننے لگے۔ کاروبار بڑھا تو ایک محل نما مکان بنوایا، یوں ان کی دنیا آباد ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی اور پھر ایک باغ بنایا۔''

''بس دادی جان۔ آگے کا قصہ مجھے معلوم ہے۔''

''تجھے کیسے معلوم؟''

''ہمارے ہی شہر کی تو کہانی ہے۔ باغ کوٹھی کے دربان شیز فام نے مجھے سنائی تھی۔ اور دادی جان وہ کہانی میں نے رات میں نہیں دن میں سنی تھی۔''

دادی جان کو اطمینان ہو گیا، وہ سو گئیں لیکن نوروز جاگتا رہا اور آج وہ برسوں بعد سوچتا ہے کہ اس نے دادی جان سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا وہ آگے کی کہانی سننا نہیں چاہتا تھا؟ مگر کیوں؟ شاید اس لیے کہ گلشن آرا کے لگائے ہوئے باغ کی کہانی وہ سننا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور باغ لگتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اب اجڑتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ باغ ہزاروں سال میں لگ پایا تھا، نوروز کی آنکھیں اس کی گواہ ہیں۔ ہزاروں سال پرانی آنکھیں۔ ایک ایک پودا اس کے سامنے لگا ہے اور ایک ایک پھول اس کی آنکھوں کے آگے کھلا ہے۔ یہ بات نہیں مختلف پھولوں سے بنی شہزادہ گل ریز کی گیند ہے جو گلشن آرا کے رخ روشن سے ٹکرا کر بکھر گئی ہے۔

نوروز کا دنیا دیکھنے اور زندگی کو سمجھنے کا یہ طلسمی انداز واقعات کو یوں دیکھتا ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ شہر میں نٹوں کی ایک ٹولی داخل ہوئی۔ ایک نوجوان نٹ اور اس کی نہایت ملوک نٹنی نے اعلان کیا کہ وہ نقلی پر لگا کر دو کوس تک اڑ سکتے ہیں۔ بس لوگ جمع ہونے لگے۔ اس کی خبر گڑھی کی بالائی منزل پر شہزادی گلشن آرا کے کانوں تک پہنچی۔ شہزادی نے نٹ کے اس جوڑے کو بلوا بھیجا۔ کرتب شروع ہوا۔ مشرقی برج سے چھاج کے نقلی پر لگا کر دونوں اڑے۔ دو کوس کا دعویٰ تھا ڈھائی کوس تک اڑتے رہے اور پھر جب گرے تو خدا کا کرنا، دونوں نے وہیں دم توڑ دیا۔ شہزادی گلشن آرا پالکی میں سوار ہو کر جب وہاں پہنچیں تو دیکھتی کیا ہیں کہ وہاں نہ کوئی نٹ ہے اور نہ نٹنی۔ لاش کا کہیں پتا نہ تھا، بس دو پھول کھلے ہوئے تھے۔ رنگ ان کا ایسا کہ دنیا میں مثال نہیں۔ شہزادی گلشن آرا نے حکم نامہ جاری کیا کہ یہاں ایک ایسا باغ لگایا جائے جس میں دنیا بھر کے نایاب و نادر پھول، طرح طرح کے پھل اور بے شمار خوبصورت درخت ہوں۔ باغ کی چہار دیواری ایسی ہو کہ جس میں ہزار دروازے ہوں اور سارے دروازے سبھی کے لیے کھلے رہیں۔ باغ کی پہرے داری گلِ صد برگ کریں اور ان کی سواری گل گوں ہو۔ شہزادی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ پہلے تمر ہندی، برگد، پیپل اور املتاس کے درخت لگائے گئے اور پھر درمیان روشیں مولسری، آبنوس اور صنوبر کے درختوں سے آراستہ کی گئیں۔ باغ کے وسط میں ایک عالی

شان عمارت تعمیر کی گئی جو باغ کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لوگ مختلف ممالک سے آتے ، اپنے ساتھ نایاب قسم کے پودے لاتے اور باغ کوٹھی میں قیام کر کے محسوس کرتے گویا باغ میں نہیں شہزادی گلشن آرا کے دل میں قیام پذیر ہوں۔ کچھ آنے والے کوہ قاف کو عبور کر کے آتے تو کچھ سمندر کے راستے۔ دور دور تک اس گل کدے کی شہرت تھی۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اب گلِ داؤدی، گلِ رعنا اور گلِ آفتاب کے ساتھ ساتھ کرسمس ٹری، پام کے درخت اور منی پلانٹ کی بیلیں بھی اس چمن زار میں دکھائی دینے لگی تھیں۔

پھر کیا ہوا، کیسے ہوا کہ باغ اجڑنے لگا۔ نوروز بستر پر لیٹا سوچ ہی رہا تھا کہ گلیارے میں ایک شور اٹھا۔ بیٹھک کی کھڑکی کھول کر دیکھا کہ باغ کی پاسبانی کا عزم لیے کچھ لوگ نعرے لگاتے گلی سے گزر رہے ہیں۔ وہ بھی چبوترے پر نکل آیا اور ہجوم کے سنگ سنگ چلنے لگا۔ پھر اس نے جانا کہ بھیڑ باغ میں داخل ہو چکی ہے اور وہ تنہا دروازے کے باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ نظریں اٹھائیں تو پایا کہ اب فصیل مزید اونچی کر دی گئی تھی اور اس کے تمام دروازے پتھروں سے چن دیے گئے تھے۔ صرف صدر دروازہ کھلا تھا، جس پر سیاہ وردی پہنے سپاہی آبنوس کے درختوں کی طرح جامد و ساکت کھڑے تھے۔ اندر جانے کی کوشش کی، پر اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ابھی اجازت نہیں۔ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

دوسرے روز سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ جہاں مولسری اور صنوبر کے شجر تھے وہاں ببول کی کانٹے دار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ حوض جس میں ہر پل فوارہ چلتا رہتا تھا اسے بارش کے پانی اور کائی کی پرتوں نے مینڈکوں کا مسکن بنا دیا ہے۔ سامنے نگاہ کی تو کھلا کہ باغ کوٹھی کے کھنڈر دم سادھے کھڑے ہیں۔ کوٹھی کی بلند محراب کی طرف گردن اُٹھائی تو اندھیرے میں ڈوبے آسمان کا عکس نظر آیا۔ محراب ٹوٹ کر گر چکی تھی اور ستون سرنگوں تھے۔ وہ بڑھتا رہا اور آگے بڑھتا رہا کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر اوندھے منھ آ گرا۔ کانپتی انگلیوں سے ٹٹولا تو دو قبروں کے نشان پائے۔ اسے معلوم ہے یہ قبریں شہزادہ گل ریز اور شہزادی گلشن آرا کی ہیں۔ اب سورج آسمان پر پاؤں جما چکا تھا۔ صدر دروازے کے باہر ہجوم جمع ہونے لگا۔ نوروز اٹھا اور باغ کوٹھی کے کھنڈر کی ایک دیوار کے پیچھے چلا گیا اور سوچنے لگا۔ نگہداشت کی تمام کوششیں جاری ہیں، پھر آخر یہ باغ روز بہ روز کیوں ویران ہوتا جا رہا ہے؟ باہر ایک اژدحام ہے اور گشت پہلے سے زیادہ سخت۔ ''کیا ہزاروں

سال پرانا دیو پھر سے........."

ایک شور اٹھا اور بھیڑ اندر داخل ہو گئی ـــــــ کچھ لوگ حوض کے چبوترے پر، باقی حوض کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ چبوترے پر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ "باغ کی حفاظت کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ صدر دروازے کو بھی باقی دروازوں کی طرح بند کر دینا ہو گا۔"

مجمع سے ایک آواز ابھری ـــــــ "باہر سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے دامن سمیٹ لیا اور بیٹھ گیا۔

چبوترے پر کھڑا شخص پھر بولا ـــــــ "یوں تو ہم نے صدیوں سے اس باغ میں کسی گل ریز اور کسی گلشن آرا کو نئی قسم کا کوئی بھی پودا لگانے نہیں دیا ہے، کیوں کہ ہر نیا پودا پرانے پودے کو غارت کر دیتا ہے۔ چہار دیواری کے باہر سے لائے ہوئے پودے لگا کر باغ کی فضا کو آلودہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

نوروز دیوار کی آڑ میں کھڑا حیرت سے سن رہا تھا۔ "نئے پودوں کی آمد پر بندش؟ کہیں باغ کے ویران ہونے کی یہی وجہ تو نہیں۔ ہاں یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے باغ اجڑا ہی نہ ہو بلکہ نئے پھولوں کے نہ کھلنے اور نئے پھولوں کے نہ پھلنے کے سبب دنیا کے دوسرے باغوں کے مقابلے میں اجڑتا ہوا سا محسوس ہو رہا ہو۔"

اب اس نے دیکھا کہ چبوترے پر کوئی دوسرا شخص آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس شخص نے شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مسکراتے ہوئے باغ کے چوتھے کھونٹ کی طرف اشارہ کیا، جیسے اس نے رکھوالی کا کوئی کارگر طریقہ ڈھونڈ نکالا ہو۔ دیوار کے پیچھے سے نوروز نے جھانک کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ وہاں سے گلِ رعنا، گلِ جعفری اور گلِ سوسن کے پودے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ ہاں کیتکی اور ناگ پھنی کے پودے قطاروں میں اسی طرح لگے ہوئے تھے۔

"باغ کی صفائی کے نام پر خود رو گھاس سمجھ کر ان لوگوں نے سب پودے اکھاڑ پھینکے۔ گلِ سوسن بھی!" اس نے چیخ کر کچھ کہنا چاہا مگر اب اس کی زبان پوری طرح گنگ ہو چکی تھی۔ کیوڑے کی جھاڑیوں سے ایک سانپ نکلا اور گلِ شب افروز کے جھنڈ سے ہوتا ہوا بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ کچھ لوگ بلّم بھالے لے کر دوڑے اور سانپ مارنے کے بجائے گلِ شب افروز کے پودوں کو جڑ سے اکھاڑنے لگے۔ اب حوض پر کھڑا وہ شخص کہہ رہا تھا کہ........."بے کار اور بے میل پیڑ پودے اکھاڑ پھینکو۔ برگد کی صف میں برگد اور پیپل کی

صف میں پیپل۔ پلکھن، چیڑ، ساکھو اور بس............... ''اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ بغیر کچھ سوچے، بغیر کچھ سمجھے بھیڑ چاروں طرف بکھر گئی اور پلک جھپکتے خیار شمبر، پام اور رایو ویریا کے درخت بھی اکھاڑ پھینکے۔

''اے خدا یہ باغ کی زیبائش کا کون سا طریقہ ہے؟ اے میرے پاک پروردگار کیا اب اسے بچانے کی کوئی تدبیر نہیں۔ اے قادرِ مطلق کوئی ترکیب بتا۔ ہاتھ میں چاقو اور سرخ مرچوں کی شیشی لے کر کسی شہزادے کو بھیج۔'' اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ کچھ نوجوان ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں شیشی لیے باغ میں داخل ہوئے۔ وہ سب پہرے کے لیے باغ کے کونے کونے میں منتشر ہونا ہی چاہتے تھے کہ ایک بوڑھا شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو میرے چہرے پر یہ جھریاں دیکھو۔'' پھر اس نے کٹی انگلی کا زخم دکھایا اور رقت آمیز لہجے میں بولا ''میں یہ ترکیب صدیوں سے آزماتا آ رہا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تدبیر اب کارگر نہیں رہی۔ اب کوئی دیو باغ کی دیوار پھلانگ کر اسے اجاڑنے کے لیے باہر سے نہیں آتا، اس کے اجڑنے کا سبب کچھ اور ہے، تو ظاہر ہے نگہبانی کی تدبیر بھی کچھ اور ہی ہوگی۔'' اتنا سننا تھا کہ مجمع پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور پھر ایک ایک کر کے سب واپس ہو لیے۔ وہ بھی جو بعد میں آئے تھے اور وہ بھی جو حوض کے گرد جمع تھے۔

ایک روز پھر شہر میں ڈگی پٹی، اعلان ہوا کہ: ''باغ کی حفاظت کے تمام حربے آزمائے جا چکے ہیں، مگر ہر بار ناکامی ہاتھ آتی ہے۔ باغ متواتر ویران ہوتا جا رہا ہے۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سورج طلوع ہونے سے قبل باغ کے صدر دروازے پر پہنچے۔'' سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ صدر دروازہ بند تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ نوروز بھی ہزاروں سال پرانی آنکھوں میں ویرانی لیے وہاں موجود تھا۔ دروازے پر بڑی سینی میں چاندی کے ورق میں لپٹا ایک بیڑا رکھا تھا۔ ایک جم غفیر تھا مگر خاموش............... ''تو کیا اسی طرح لوگ شام ہوتے ہوتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے؟'' آخر کار شام بھی ہو گئی۔ دن بھر کی گرم ہوا نے سینی میں رکھے بیڑے کو جھلسا دیا۔ لگتا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لوگ پلٹیں گے اور واپس شہر کی طرف دوڑ پڑیں گے کہ اچانک مجمع سے ایک آواز آئی جیسے بجلی چمکی ہو اور پھر بادل گرجنے لگے۔ مجمع کو چیرتا ایک بوڑھا، اپنی جھولی کو بغل میں دبائے صدر دروازے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ نوروز نے پہچاننے کی کوشش کی۔ ''کیا یہ گل ریز ہے؟ نہیں۔ تو پھر شاید

نوروز۔نہیں۔میں تو یہاں کھڑا ہوں اگر اسوقت میرے چہرے کے سامنے آئینہ ہوتا تو ضرور اس بوڑھے کو قریب سے دیکھ پاتا۔'' اس نے تھوڑا آگے بڑھ کر پہچاننے کی کوشش کی۔''ارے یہ تو وہی بوڑھا ہے جس نے کٹی انگلی کا زخم دکھا کر مجمع کو واپس کیا تھا۔اس دن یہ کتنا مایوس تھا مگر آج اس کے چہرے پر یہ چمک؟ شاید میری آنکھوں کی چمک ہو۔'' پھر کیا تھا، بوڑھے نے بیڑا اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھ کر منھ میں رکھ لیا۔لوگ مضطرب تھے، شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کی جھولی میں کیا ہے؟ بوڑھے کی تجربے کار آنکھیں مسکرائیں۔اس نے جھولی میں ہاتھ ڈالا، سب سے پہلے جو چیز نکلی وہ گلِ ہزارہ کی ایک خوبصورت گیند تھی۔پھول کی اس گیند کے چاروں طرف نیلوفر، نسترن اور یاسمین کی پتیاں گندھی ہوئی تھیں۔اس جھولی سے پھر ایک تیشہ نکلا۔نوروز نے دیکھا کہ تیشے کی نوک پر فصیل کے تمام بند دروازوں کو توڑنے کا عزم چمک رہا تھا۔

''سب سے پہلے باغ کے تمام دروازے کھولنے ہوں گے۔'' بوڑھے نے کہا۔نوروز کچھ اور آگے بڑھ گیا۔باغبانی کے اوزار اور کچھ نایاب و نادر پھولوں کے پودے دیکھ کر وہ بوڑھے کے بالکل قریب جا پہنچا، اتنا قریب کہ شاید دونوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ایک آواز آئی۔

''رکھوالی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟''

بوڑھے نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور نرمی سے کہا۔''آپ سے دست بستہ گزارش ہے کہ سب اپنی مٹھیاں کھول دیں۔''

سب نے بند مٹھیاں کھول دیں، پھر صدر دروازہ کھلا، بوڑھا باغ میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹھکا، پلٹ کر نوروز کی طرف آیا اور بولا۔''ممکن ہے میں باغ کی نگہبانی میں کامیاب ہو جاؤں۔ممکن ہے باغ پھر سے سرسبز ہو جائے۔ممکن ہے اس گلستاں کا دامن بہت وسیع ہو جائے مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ باغ پھر نہیں اجڑے گا۔'' نوروز یہ سوال سن کر بوڑھے کے قدموں میں گر گیا۔بوڑھے نے جھک کر اسے اٹھایا اور جھولی میں ہاتھ ڈال دیا۔سب تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ اب جھولی سے کیا نکلتا ہے۔اس نے جھولی سے سیاہ دستے اور تیز دھار والی کوئی شئے نکال کر نوروز کے ہاتھ میں تھما دی۔

''شاید چاقو ہے! لیکن مرچوں کی شیشی؟'' نوروز سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے پھر جھولی میں ہاتھ ڈال دیا اور ایک شیشی نکال کر نوروز کو دی اور کہا۔''اگر تو اس کا صحیح استعمال کرے

گا تو یہ باغ قیامت تک شاداب و سرسبز رہے گا۔ لیکن ...." اس نے 'لیکن' سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر پھر 'لیکن' کے سوا کچھ نہ کہہ سکا اور مجمع کی طرف دیکھ کر مایوس ہو گیا۔

نوروز نے دونوں چیزوں کو دیکھا۔ ان میں نہ کوئی چاقو تھا اور نہ مرچوں کی شیشی۔ اس نے پھر غور سے دیکھا اور سیاہ مگر روشن رقیق سے لبریز شیشی کے ڈھکن کو کھولا اور تیز دھار والی چیز کے ایک سرے کو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں کی پوروں کے درمیان دبا کر شیشی میں ڈبو دیا۔ ایسا کرتے ہی اس کے چہرے سے دانش وری کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور باغ کی فصیل پر ایک تحریر ابھر آئی۔ نوروز کے ذہن کے تار جھنجھنانے لگے۔ آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک پریوں کی شہزادی، ماتھے پر نقرئی تاج، ہاتھ میں قدیم ساز، ہنس پر سوار، باغ کے دروازے کے بہت قریب سے گزر رہی ہے۔

یہ ماجرا نوروز اور بوڑھے کے سوا سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا اور پھر یوں ہوا کہ جس نے بوڑھے کو دیکھا وہ نوروز کو نہیں دیکھ سکا اور جو نوروز کو دیکھ رہا تھا اس کی نظروں سے بوڑھا غائب تھا۔

OO

کڑوا تیل

غضنفر

"اس گھانی کے بعد آپ کی باری آئے گی۔ تب تک انتظار کرنا پڑے گا۔" شاہ جی نے میرے ہاتھ سے تلہن کا تھیلا لے کر کولھو کے پاس رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں دروازے کے پاس پڑے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

کولھو کسی پائدار لکڑی کا بنا تھا اور کمرے کے بیچوں بیچ کچے فرش میں بڑی کاری گری اور مضبوطی کے ساتھ گڑا ہوا تھا۔ کولھو کی پکی ہوئی پائدار لکڑی تیل پی کر اور بھی پک گئی تھی اور کسی سیاہی آمیز سرخ پتھر کی طرح دمک رہی تھی۔

اس کا منہ اوکھلی کی طرح کھلا ہوا تھا۔ منہ کے اندر سے اوپر کی جانب موسل کی مانند ایک گول مٹول ڈنڈا نکلا ہوا تھا جس کے اوپری سرے سے جوئے کا ایک سرا جڑا تھا۔ جوئے کا دوسرا سرا بیل کے کندھے سے بندھا تھا جسے بیل کھینچتا ہوا ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔

بیل جس دائرے میں گھوم رہا تھا اس دائرے کا فرش دبا ہوا تھا۔ کمرے کے باقی فرش کے مقابلے میں اس حصے کی زمین کی سطح نیچی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کوئی بڑا سا پہیہ رکھ کر زور سے دبا دیا گیا ہو۔

کولھو کے منہ میں اوپر تک سرسوں کے دانے بھرے تھے۔ دونوں کے بیچ موسل نما ڈنڈا مسلسل گھوم رہا تھا اور اس عمل میں اس کا دباؤ چاروں طرف کے دانوں پر پڑ رہا تھا۔

دانے ڈنڈے کے دباؤ سے دب کر چپٹے ہوتے جا رہے تھے۔

دبے اور کچلے ہوئے دانوں کا تیل اندر ہی اندر نیچے جا کر کولھو کے نچلے سرے میں
بنے ایک باریک سوراخ کے ذریعے بوند بوند ٹپک کر ایک مٹ میلے برتن میں جمع ہو رہا تھا۔
برتن میں جمع تازہ تیل ایسا لگتا تھا جیسے بیل کی پگھلی ہوئی چربی ہو یا جیسے سونا پگھلا کر
ڈال دیا گیا ہو۔

تیل کی چمک دیکھ کر میری آنکھوں میں چمکتے ہوئے چہرے، مالش شدہ اعضا، گٹھے
ہوئے جسم، کسے ہوئے پٹھے، چکنی جلدیں، دمکتی ہوئی لاٹھیاں اور زنگ سے محفوظ مشینوں کے
پرزے جھلملانے لگے۔ مضبوط اور چمکدار جسموں کے ساتھ صحت مند دماغ اور ان دماغوں کے
تاب دار کارنامے بھی اس تیل میں تیرنے لگے۔

تیل کے برتن سے نگاہیں نکلیں تو کولھو میں جتے بیل کی جانب مبذول ہو گئیں۔

بیل اوپر سے نیچے اور آگے سے پیچھے تک نچا ہوا تھا، پٹھا پچک گیا تھا۔ پیٹ دونوں
طرف سے دھنس گیا تھا۔ پیٹھ بیٹھ گئی تھی۔ گوشت سوکھ گیا تھا۔ ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ قدم بھنچا
ہوا تھا۔ گردن سے لے کر پٹھے تک پورا جسم چابک کے نشان سے اٹا پڑا تھا۔ جگہ جگہ سے کھال
ادھڑ گئی تھی۔ بال نچے ہوئے تھے۔ گردن کی جلد رگڑ کھا کر چھل گئی تھی۔ دونوں سینگوں کی نوکیں
ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کانوں کے اندر اور باہر جلد خور کیڑے جلد سے چمٹے پڑے تھے۔ پچھلا حصہ
پیروں تک گوبر میں سنا ہوا تھا۔ دُم بھی میل میں لپٹی پڑی تھی۔ دُم کے بال بیل کے چھیرے میں
لت پت ہو کر لٹ بن گئے تھے۔ پچھلے ایک پاؤں سے خون بھی رس رہا تھا۔

بیل کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ ناک میں نکیل پڑی تھی۔ منہ پر جاب چڑھا ہوا
تھا۔ بیل ایک مخصوص رفتار سے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ پاؤں رکھنے میں کافی احتیاط برت رہا
تھا۔ گھیرے کی دبی ہوئی زمین پر اس کے پیر اس طرح پڑ رہے تھے جیسے ایک ایک قدم کی جگہ
مقرر ہو۔ نہایت ناپ تول اور سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھنے کے باوجود کبھی کبھار وہ لڑکھڑا پڑتا اور
اس کی رفتار میں کمی آجاتی تو شاہ جی کے ہاتھ کا سونٹا لہرا کر اس کی پیٹھ پر جا پڑتا اور وہ اپنی
تلملاہٹ اور لڑکھڑاہٹ دونوں پر تیزی سے قابو پا کر اپنی راہ پکڑ لیتا۔

سونٹا اس زور سے پڑتا کہ سڑاک کی آواز دیر تک کمرے میں گونجتی رہتی۔ کبھی کبھی تو
میری پیٹھ بھی سہم جاتی۔

بیل کو ایک مرکز پر لگاتار گھومتے ہوئے دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا

اور میری نگاہ رسٹ واچ پر مرکوز ہو گئی۔

ایک چکر میں تیس سیکنڈ ـــــــ

میں نے گھڑی کی سوئیوں کے حساب سے چکروں کو گننا شروع کر دیا۔ ایک ـــــــ دو ـــــ تین ـــــ چار ـــــ پانچ ـــــ چھ ـــــ سات ـــــ آٹھ ـــــ نو ـــــ دس ـــــ

دس چکر پانچ منٹ چار سیکنڈ میں ـــــــ

گویا اوسطاً فی چکر ـــــــ تیس سیکنڈ

''شاہ جی یہ بیل کتنے گھنٹے کولھو کھینچتا ہو گا؟''

''یہی کوئی بارہ تیرہ گھنٹے، کیوں؟''

''یوں ہی پوچھ لیا۔'' مختصر سا جواب دے کر میں بارہ گھنٹوں میں پورے کیے گئے چکروں کا حساب لگانے لگا۔

پانچ منٹ میں دس چکر تو ایک گھنٹے میں؟

ایک گھنٹے میں ایک سو بیس چکر

اور بارہ گھنٹے میں؟

ایک سو بیس ضرب بارہ برابر چودہ سو چالیس چکر ـــــــ

اچانک میری نگاہیں اس گھیرے کو گھورنے لگیں جس میں بیل گھوم رہا تھا۔

دس، دس، بیس، دس، تیس، دس چالیس ـــــــ میرے آگے دائرے کی لمبائی کھنچ گئی۔

بیل ایک چکر میں تقریباً چالیس فٹ کی دوری طے کرتا ہے۔

چالیس ضرب چودہ سو چالیس برابر ستاون ہزار چھ سو فٹ ـــــ

ستاون ہزار چھ سو فٹ مطلب سوا سترہ کلومیٹر

گویا ایک دن میں سوا سترہ کلومیٹر کی دوری

اگر بیل کمرے سے باہر نکلے تو روزانہ ـــــــ

کمرہ پھیل کر میدان میں تبدیل ہو گیا۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے میدان میں کھلی فضائیں جلوہ دکھانے لگیں۔ سورج کی شعاعیں چمچمانے لگیں۔ تمام سمتیں نظر آنے لگیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں ـــــــ چاروں طرف سبزہ زار اُگ آئے۔ کھیت ہرے ہو گئے۔ سبزے لہلہانے لگے۔ پودے لہرانے لگے۔ شاخیں ہلنے لگیں۔ سبزہ زاروں کے بیچ پانی کے سوتے،

ندی، نالے، تالاب اور چشمے جھلملانے لگے۔

یکا یک بیل کے کندھے سے جُوا اتر گیا۔ اس کی آنکھوں سے پٹیاں کھل گئیں۔ منہ سے جاب ہٹ گیا۔ بیل کھلی اور روشن فضا میں ہری ہری دھرتی کے اوپر بے فکری اور آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا۔ سبزوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہریالی بھر گئی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ مختلف سمتوں میں بے روک ٹوک گھومتا، من پسند سبز، تازہ، نرم ملائم پودوں، پتوں اور مخملی گھاس کو چرتا، چباتا، جگالی کرتا، ندی، نالوں اور چشموں سے پانی پیتا، تمام سمتوں کی جانب دیکھتا، میدان کی وسعتوں کو آنکھوں میں بھرتا جھومتا ہوا کافی دور نکل گیا۔

سڑاک

سونٹے کے چوٹ پر ذہن جھنجھنا اٹھا۔ پھیلی ہوئی سرسبز دھرتی میری آنکھوں سے نکل گئی۔

بیل کولھو کھینچنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی پٹیاں لہرانے لگیں۔

لہراتی ہوئی پٹیاں میری آنکھوں پر بندھ گئیں۔

بیل کے کندھے پر بندھا ہُوا، اس کی ناک میں پڑی نکیل، گھومتا ہوا کولھو، کچلتے ہوئے سرسوں کے دانے، دانتوں سے بنا کھل، برتن میں جمع تیل، تیل کے پاس کھڑا شاہ جی سب کچھ میری آنکھوں سے چھپ گیا۔ سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

اندھیرا میرے اندر تک گھلتا چلا گیا۔

مجھے ہول اٹھنے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ بے چین ہو کر میں نے اپنی آنکھوں سے پٹیاں جھٹک دیں۔

''شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے''۔

''بیل کی آنکھوں پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟''

''اس لیے کہ کھلی آنکھوں سے ایک جگہ پر لگاتار گھومتے رہنے سے اُسے چکر آ سکتا ہے اور ——''

یک لخت میں اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔ جہاں ہم کبھی کھلی اور کبھی بند آنکھوں سے کھلیان کے وسط میں گڑے کھمبے کے چاروں طرف چکر لگانے کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اور کھلی آنکھوں سے گھومتے وقت اکثر چکر کھا کر گر پڑتے تھے۔

شاہ جی ویسا نہیں ہے جیسا کہ میرے ذہن نے اس کی تصویر بنالی ہے۔ شاہ جی کو کم سے کم بیل کی تکلیف کا احساس ضرور ہے۔ تصویر قدرے صاف ہوگئی۔

''اور اُسے چکر آنے کا مطلب ہے میرا گھن چکر''

''مطلب؟'' دوسرا جملہ سن کر میں چونک پڑا۔

''مطلب یہ ہے کہ میں گھن چکر میں پڑ جاؤں گا۔ یہ بار بار چکر کھا کر گرے گا تو کام کم ہوگا اور کم کام ہوگا تو ہمارا نقصان ہوگا۔''

شاہ جی کی تصویر سے جو سیاہ پرت اُتری تھی، دوبارہ چڑھ گئی۔

مجھے ان کے گھن چکر میں کچھ اور بھی چکر محسوس ہونے لگا۔ کئی اور باتیں میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگیں۔

کوھو کے منہ میں پڑے سرسوں کے دانے میرے قریب آگئے۔

آنکھوں پر پٹی باندھنے کی وجہ یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ کہیں بیل ان دانوں میں منہ نہ مارلے۔ اور شاہ جی کو اپنے پاس سے ہرجانہ بھرنا پڑ جائے۔

کوھو کا دائرہ بھی میرے نزدیک سرک آیا۔

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کہیں بیل کو یہ احساس نہ ہو جائے کہ وہ برسوں سے ایک ہی جگہ پر صبح سے شام تک گھومتا رہتا ہے اور اس احساس کے ساتھ ساتھ ہی وہ بغاوت پر اُتر آئے، جوا توڑ کر بھاگ نکلے۔

اور یہ بھی کہ اسے کھل اور تیل نہ دکھ جائے۔

سرسوں کے زیادہ تر دانے کچل کر کھل میں تبدیل ہو چکے تھے۔ برتن میں کافی سارا تیل جمع ہوگیا تھا۔

بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''شاہ جی! یہ کھل تو اسے ہی کھلاتے ہوں گے؟''

''نہیں، اسے کیوں کھلائیں گے۔ یہ کوئی گاڑی تو رے کھینچتا ہے۔ کھلی تو اُسے دیتے ہیں جو گاڑی کھینچتا ہے۔ یا ہل جوتتا ہے۔''

میری نظر ایک بار پھر بیل کے اوپر مرکوز ہوگئی۔

دھنسی ہوئی کوکھ۔ پچکا ہوا پٹھا، دبی ہوئی پیٹھ اور اُبھری ہوئی ہڈیاں میری آنکھوں میں

پُنچھنے لگیں۔

''شاہ جی! یہ بیل تو کافی کمزور اور بوڑھا دِکھتا ہے۔ اسے ریٹائر کیوں نہیں کر دیتے۔''

''نہیں بابو صاحب! اس کی بُوڑھی ہڈیوں میں بہت جان ہے۔ ابھی تو یہ برسوں کھینچ سکتا ہے۔ پھر یہ سدھا ہوا ہے۔ اپنے کام سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس کی جگہ جوان بیل جوتنے میں کافی دقت ہوگی۔ جوان بیل کھینچے گا کم بدکے گا زیادہ۔ اس لیے فی الحال یہی ٹھیک ہے۔''

میری نگاہیں بیل کی رفتار کی طرف مبذول ہو گئیں۔

بوڑھا بیل واقعی سدھا ہوا تھا۔ ایک متوازن رفتار سے کولھو کھینچ رہا تھا۔ اس کے پاؤں نپے تلے پڑ رہے تھے۔ قدم گھیرے سے باہر شاید ہی کبھی نکلتا تھا۔ لگتا تھا اس کی بند آنکھیں شاہ جی کے سونٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

''ویسے ایک بچھڑے کو تیار کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی اسے جوتتا ہوں۔ مگر پٹھا ابھی پُٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتا۔ کندھے پر جُوا رکھتے وقت بڑا اُدھم مچاتا ہے۔ آنکھ پر آسانی سے پٹی بھی باندھنے نہیں دیتا۔ سر جھٹکتا ہے مگر دھیرے دھیرے قابو میں آ ہی جائے گا۔''

میری آنکھوں میں بچھڑا آ کر کھڑا ہو گیا۔

لمبا چوڑا ڈیل ڈول، بھرا بھرا چھریرا بدن، اُٹھا ہوا پُٹھا، اونچا قد، تنی ہوئی چکنی کھال، چمکتے ہوئے صاف ستھرے بال، پھرتیلے پاؤں۔

بچھڑے کا کسا ہوا پُرکشش جسم مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میری نگاہیں اس کے ایک ایک انگ پر ٹھہرنے لگیں۔ اچانک بچھڑے کا ڈیل ڈول بگڑ گیا۔ قد دب گیا۔ پیٹ دھنس گیا۔ پُٹھا پچک گیا۔ پیٹھ بیٹھ گئی۔ ہڈیاں نکل آئیں۔ کھال داغ دار ہو گئی۔ پیروں کی چمڑی چھل گئی۔ بالوں کی چمک کھو گئی۔ بدن گوبر میں سن گیا۔

میری جی میں آیا کہ میں کمرے سے باہر جاؤں اور بچھڑے کی رسّی کھول لوں۔ یہ بھی جی میں آیا کہ اور نہیں تو آگے بڑھ کر بیل کی آنکھوں کی پٹی ہی نوچ دوں مگر میں اپنی گھانی کا تیل نکلنے کے انتظار میں اپنی جگہ پر چُپ چاپ بیٹھا کبھی بیل، کبھی کولھو کے سوراخ سے نکلتے ہوئے تیل کو دیکھتا رہا۔

اور بیچ بیچ میں سڑاک سڑاک کی گونج سنتا رہا۔

OO

دامِ وحشت

مبین مرزا

مردانہ آواز آ رہی تھی۔

لیکن سامنے عورتیں تھیں .... جوان، خوب صورت اور دلکش عورتیں۔ ہلکے بھاری رنگوں میں ملبوس۔ نئے پرانے فیشن کے جھلملاتے لباس، جن میں جسمانی خطوط زیادہ نمایاں اور توجہ طلب ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ ان کی طرف نگاہیں بار بار پلٹتی ہیں۔ حالانکہ مختلف کچھ نہیں ہوتا، جسم تو سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، سر سے پاؤں تک۔ ماتھا، آنکھیں، ناک، ٹھوڑی، سینہ، ٹانگیں .... سب کے پاس ایک ہی جیسا سب کچھ ہوتا ہے، اس نے سوچا، لیکن کہیں کسی میں جیسے کوئی جادوئی بلاوا، کوئی طلسماتی پکار ہوتی ہے جو آدمی کے اندر .... لیکن آواز تو مردانہ تھی جو آ کر کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کبھی اونچی کبھی نیچی لہروں پر سفر کرتی ہوئی بھاری مردانہ آواز۔ شیخ سخاوت علی نے آنکھوں میں پھرتے منظر کانوں میں پڑتی آواز کو جوڑ کر دیکھنے اور ان کے آپس کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ آواز الگ تھی اور منظر الگ۔ دو زانو بیٹھے ہوئے شیخ سخاوت علی نے گھٹنوں اور پیروں کے جوڑوں میں دُکھن محسوس کی، پنڈلیاں بھی سنسنا رہی تھیں۔ گھٹنے اٹھا کر بیٹھتے ہوئے سوچا، ڈاکٹر ٹھیک کہتا ہے وزن کم نہ کیا تو آگے چل کر بڑے مسئلے مسائل ہو جائیں گے۔ پر یہ وزن کیسے کم ہو؟ یہی تو مشکل ہے۔ سارا دن دکان پر بیٹھے رہنا، رات کو کھانا کھا کر ٹی وی دیکھنا اور سو جانا اور دن میں سفر سارا کا سارا گاڑی میں۔ نام کو بھی چلت پھرت نہیں، ذرا سی جسمانی مشقت نہیں پھر وزن بڑھے گا

نہیں تو کیا کام ہوگا۔

ساری گڑبڑ ابا کے ہارٹ اٹیک سے شروع ہوئی تھی۔ شوگر تو انھیں پہلے سے تھی لیکن پھر بھی وہ دکان پر باقاعدگی سے آتے اور سارا لین دین سنبھالتے تھے۔ مارکیٹ میں نکل کر آرڈر لینے اور اگاہی کا کام شیخ سخاوت علی نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ صدر، فریئر روڈ، اردو بازار، جامع کلاتھ، جوڑیا بازار اس سے آگے بولٹن مارکیٹ اور ٹاور تک کا سارا علاقہ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے شہر کراچی کا اس قدر گنجان آباد حصہ تھا کہ یہاں گاڑی میں نہیں گھوما جا سکتا تھا۔ لہذا جس علاقے میں کام ہوتا، وہاں ایک جگہ گاڑی پارک کرکے وہ گلی گلی کوچہ کوچہ پیدل گھومتا اور کام نپٹاتا چلا جاتا۔ اچھی خاصی مشقت ہوجاتی تھی۔ وزن قابو میں تھا۔ لیکن جب سے ابا نے دوکان پر آنا چھوڑا تھا، وہ سارا دن ان کی جگہ گدی پر بیٹھ کر گزارتا، اسی وجہ سے وزن بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس مردانہ آواز کو شیخ سخاوت علی نے ایک بار پھر آنکھوں میں پھرتی عورتوں سے جوڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ تب اسے خود تعجب ہوا۔ وہاں تو عورتیں تھیں ہی نہیں۔ مرد ہی مرد تھے۔ جوان، ادھیڑ اور بوڑھے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف۔ اب شیخ سخاوت علی کو اس منظر اور آواز کو جوڑنے اور سمجھنے میں ذرا مشکل نہ ہوئی۔ یہ مسجد کے امام صاحب کی آواز تھی، ''اللہ آپ کو، مجھے اور سب مسلمانوں کو صحیح دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین!'' آواز، الفاظ، لہجہ سب ہی کچھ تو جانا پہچانا اور مانوس تھا۔ شیخ سخاوت علی نے دائیں بائیں گردن گھمائی۔ اب بالکل دوسرا ہی منظر آنکھوں میں ابھر گیا۔ لوگ جمعے کے خطبے سے پہلے کی سنتوں کے لیے اٹھ رہے تھے۔ اُس نے امام صاحب کے مصلے کی محراب کے عین اوپر لگے ہوئے گھڑیال میں وقت دیکھا۔ پچھلے سولہ سترہ سالوں سے وہ اسی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اپنے ذہن کی آوارگی پر اسے خود سے ندامت ہوئی۔ لاحول ولا قوۃ، یعنی میں مسجد میں ہوں اور ذہن آوارگی پر نکلا ہوا ہے۔ اس نے دونوں کانوں کی لویں چھوئیں اور باآواز بلند استغفراللہ کہا۔ لیکن اس سلسلے میں وہ کتنا قصوروار ہے؟ اس کے اندر کسی نے دریافت کیا۔

لگ بھگ ڈیڑھ سال ہو رہا تھا، بیوی گھر نہیں تھی، امریکا اپنے بھائی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ تیسرے بچے کی ولادت سے چار مہینے پہلے گئی تھی اور اب تک وہیں تھی۔ امریکہ میں گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ ٹاور کے واقعے کے بعد جس طرح دنیا کے حالات تبدیل ہوئے تھے، ان کو

دیکھتے اور سمجھتے ہوئے اس نے بھی فیصلہ کیا کہ اب گرین کارڈ لے ہی لینا چاہیے۔ دو سالے اور تین سالیاں بہت برسوں سے امریکہ میں تھے۔ انھوں نے پہلے بھی کئی بار کہا تھا لیکن اس وقت شیخ سخاوت علی نے ان سب کی باتوں پر زیادہ کان نہیں دھرے تھے۔ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

بیوی تو شادی سے پہلے بھی کئی دفعہ امریکہ گھوم آئی تھی لیکن شادی کے بعد سے تو وہ بھی تین بار ہو کر آچکا تھا۔ سو اس کے لیے امریکا جا کر زندگی نئے سرے سے شروع کرنے میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں۔ ماں باپ، بہن بھائی دوست یار سب تو یہیں تھے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہاں کراچی میں والد کا جما جمایا کاروبار تھا۔ لاکھوں روپے ماہانہ کی آرام سے آمدنی تھی۔ ضرورت کا تو خیر سوال ہی کیا، خواہش کی ہوئی کون سی چیز تھی جو اسے حاصل نہ تھی۔ تو پھر بھلا امریکہ کے ایسا کیا سرخاب کا پر لگا تھا جو اسے اپنی طرف کھینچتا۔ لیکن گیارہ ستمبر کے بعد واقعی دنیا بدلی تھی، گرچہ کہیں کم کہیں زیادہ۔ شیخ سخاوت علی کے اطراف میں دنیا بہت زیادہ تو نہیں بدلی تھی لیکن دوسروں کو تبدیلی کے طوفان سے گزرتے دیکھ کر اس نے بہت کچھ سوچا اور سمجھا تھا۔ آگے چل کر حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حالات بدل رہے تھے، بدلتے چلے جا رہے تھے، تب اس نے ایک دن ٹھنڈے دل سے سوچا۔ وہ باتیں جن کے سالے سالیوں کے اپنی بہن سے جذباتی لگاؤ کے سوا شیخ سخاوت علی کے نزدیک اور کوئی معنی نہیں تھے، اب وہ سب باتیں اسے بہت معنی خیز لگنے لگیں۔ اس نے سوچا اور اپنی سابقہ رائے کے برخلاف فیصلہ کیا۔ مہینے بھر کی تیاری کے بعد بیوی دونوں بچوں کے ساتھ امریکہ روانہ ہو گئی۔ تیسرے بچے کی ولادت جیسا کہ طے کیا گیا تھا، وہیں ہوئی۔ اس کے بعد کا عرصہ امریکہ میں مستقل قیام کی قانونی کارروائیوں اور کاغذی تیاریوں میں صرف ہو رہا تھا۔

جوان اور صحت مند شیخ سخاوت علی نے بیوی کے جانے کے بعد چند مہینے تو خاموشی اور صبر سے گزار لیے لیکن پھر عورت کی ضرورت پریشان کرنے لگی۔ وہ بہت متقی پرہیز گار آدمی تو نہیں تھا لیکن اب سے پہلے اسے اوباشی کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ دوستوں کے ذریعے سبیل بن گئی اور پھر عورتیں اس کی زندگی میں داخل ہونے لگیں۔ اس شہر میں کسی چیز کا حصول ناممکن نہیں تھا۔ سب کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا بس جیب میں روپے ہونے ضروری تھے اور ان بدلتے ہوئے حالات میں بھی اس کی جیب میں اتنے روپے تو ہر

وقت ہی رہتے تھے کہ......... لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک گڑ بڑ ہو رہی تھی۔ کسی بھی وقت اور کہیں بھی بیٹھے بٹھائے اس کے اردگرد کا منظر بدل جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں کا ہجوم اطراف میں اکٹھا ہو جاتا۔ جوان، خوب صورت اور دل کش عورتوں کا ہجوم......... ملکے بھاری رنگوں میں ملبوس، نئے پرانے فیشن کے جھلملاتے لباس، جن میں جسمانی خطوط زیادہ نمایاں اور دل کش ہو جاتے۔ اتنی عورتوں سے ملنے کے بعد وہ سوچنے لگا تھا، مختلف تو کچھ نہیں ہوتا۔ ہر بار ایک ہی تجربہ، ایک ہی طرح کا نتیجہ۔ یکسانیت کا احساس لذت کم کرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ لذت کم ہو رہی تھی اور خواہش بڑھ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وقت بے وقت آس پاس عورتوں کا ہجوم نظر آنا بڑھتی ہوئی خواہش ہی کا نتیجہ تو تھا۔ لیکن اب اسے اس صورتِ حال سے وحشت ہونے لگی تھی اور کبھی کبھی اس وحشت میں ندامت بھی شامل ہو جاتی، جیسے اس وقت ہو رہی تھی۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے لوگ جمعے سے پہلے کی چار سنتیں پڑھ رہے تھے۔ ایسی جگہ بھی دماغ کی وہی خرافات، لاحول ولا قوۃ۔ اس نے کوفت اور ندامت کے ملے جلے احساس کے ساتھ سوچا اور سنتیں پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

امام صاحب جمعے کا خطبہ پڑھ رہے تھے جب شیخ سخاوت علی کی نظر اس آدمی پر پڑی۔ جھرجھری سی آ گئی اسے۔ سوچا اٹھے اور جا کر اسے پکڑ لے اور لوگوں کو بتائے کہ یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے، مشکوک ہے۔ لیکن یوں اضطرابی انداز میں اٹھنا اسے عجیب لگا۔ لیکن خوف اس کی رگ رگ میں اتر چکا تھا اور ٹھنڈی لہریں مسلسل ریڑھ کی ہڈی میں سرسرا رہی تھیں۔ اس نے سوچا وہ دائیں یا بائیں برابر میں بیٹھے ہوئے آدمی کو معاملے کی سنگینی کے بارے میں بتائے لیکن اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کس طرح اور کن لفظوں میں بات کا آغاز کرے۔ امام صاحب کا خطبہ جاری تھا۔ شیخ سخاوت علی نے ایک لمحے کو سوچا کہ یہ کہیں اس کا وہم تو نہیں۔ اس نے ایک بار پھر اس آدمی کی طرف دیکھا، وہ واقعی مشکوک لگ رہا تھا۔ اس کا لمبا سفید چوغہ، سر پہ سیاہ رنگ کا عمامہ، گھنی داڑھی، سرخ و سپید چہرہ اور چہرے پر پوری طرح سجا ہوا گہرا اطمینان......ایک ایک چیز، سب کچھ مشکوک لگ رہا تھا۔ یہ آدمی ضرور اپنے جسم سے بم باندھے بیٹھا ہوگا اور جب جماعت کھڑی ہوگی تو پہلی رکعت میں یا دوسری رکعت میں یہ خود بھی پھٹ جائے گا اور اس کے ساتھ......شیخ سخاوت علی کی نگاہوں میں وہ سارے منظر پھر گئے جو مسجدوں اور امام بارگاہوں میں بم دھماکوں، خودکش حملوں کے حوالے سے ٹی وی پر اب تک دکھائے گئے تھے۔ کٹے پھٹے

جسم، ٹکڑے ٹکڑے بکھرے انسانی اعضاء، گاڑھا خون........اوہ خدایا اس نے دونوں کانوں کی لویں چھوئیں۔ وہ کیا کرے، کیا واقعی اٹھ کھڑا ہو اور اس آدمی کو پکڑ لے۔ لیکن اگر اس کے پاس سے کچھ نہ نکلا تو کیسی ذلت ہوگی، کتنا تماشا بنے گا اور کب تک لوگ اس واقعے کا تذکرہ کر کے اسے شرمسار کرتے رہیں گے۔ ویسے اگر اس آدمی کے پاس واقعی ایسی کوئی چیز ہوتی تو مسجد میں داخل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ مسجد کے دونوں دروازوں پر کئی گارڈ اور بم ڈسپوزل اسکواڈ کے لوگ تعینات تھے جو جمعے کی نماز کے لیے آنے والے ہر شخص کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود بھی ایسے واقعات کہیں نہ کہیں تو ہو ہی جاتے تھے اور اب ایک کراچی ہی کیا، سیالکوٹ، ملتان، لاہور کہاں کہاں ایسی وارداتیں نہیں ہو چکی تھیں۔ کوئی شہر محفوظ نہیں تھا، کہیں اماں نہ تھی۔

جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ تکبیر پڑھی جا رہی تھی۔ شیخ سخاوت علی چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سینے میں دھڑکتے دل کی کیفیت بدل گئی، اسے لگا پل بھر میں وہ سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا یا پھر جتنی شدت سے دھڑک رہا ہے، پل کی پل میں تھک کر بالکل ساکت ہو جائے گا۔ اس کی نگاہیں بے اختیاری میں اسی مشکوک آدمی کی طرف اٹھیں اور پھر اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ وہ آدمی اپنی جگہ سے غائب تھا۔ یا خدا! یہ کیا ہوا؟ شیخ سخاوت علی نے خوف زدہ ہو کر سوچا لیکن اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا، کہیں یہ صرف میرا وہم تو نہیں تھا، فریب نظر تو نہیں تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے لگا جیسے سینے پر دھرا منوں وزن کسی نے ہٹا دیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور خود کو پورا اطمینان دلانے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ آدمی کہیں نہیں تھا، کہیں بھی نہیں۔ امام صاحب نے نیت باندھی۔ شیخ سخاوت علی نے نہایت سکون اور خشوع وخضوع کے ساتھ جمعے کی نماز کی نیت کی اور دونوں ہاتھ کانوں کی لوؤں تک اٹھائے۔ بس اسی لمحے نگاہ پھر اس مشکوک شخص پر پڑی، اب وہ دو صفیں آگے کھڑا تھا۔ شیخ سخاوت علی کے ہاتھ جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ اس کے جی میں آئی وہ صفوں کو چیرتا ہوا مسجد سے باہر نکل بھاگے۔ لیکن اس کے پاؤں تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے، کیا کروں......کیا کروں......کیا کروں؟ کوئی اس کے اندر پکار رہا تھا۔ امام صاحب قرأت شروع کر چکے تھے۔ شیخ سخاوت علی کو پتا بھی نہ چلا، کب اس نے نیت باندھی اور نماز میں شامل ہو گیا۔ وہ سر جھکائے امام صاحب کی قرأت سن رہا تھا لیکن کانوں میں قرأت کی آواز نہیں بلکہ زخمیوں کی چیخ و پکار

بجری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دھماکے کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک پل صدی برابر طویل ہو گیا تھا، گزر ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن کسی بھی پل ہونے والے دھماکے اور اس کے ساتھ ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جانے کا اسے پورا یقین تھا۔ غلطی ہو گئی، بہت بڑی غلطی ہو گئی اس سے، اس نے سوچا، پکڑ لینا چاہیے تھا اس مشکوک آدمی کو۔ پر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہیں مگر یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صف توڑتا ہوا آگے بڑھ کر اس آدمی کو دبوچ لے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس لمحے وہ اس تک پہنچے عین اسی لمحے دھماکا ہو اور اس کے جسم کے چیتھڑے اُڑ جائیں۔ شیخ سخاوت علی نے خود کو ریزہ ریزہ بکھرتے محسوس کیا۔ اس نے سوچا وہ نماز توڑ کر مسجد سے بھاگ جائے۔ نہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا، وہ موقع گنوا چکا ہے۔ کسی نے اس کے اندر جھنجھلا کر کہا۔

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' امام صاحب کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ اس نے بھی یہی الفاظ دہراتے ہوئے دائیں بائیں گردن گھمائی۔ نماز مکمل ہو چکی تھی۔ شیخ سخاوت علی نے اضطراری انداز میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ آدمی اپنی جگہ موجود تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، خود اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ وہ سر سے پاؤں تک ویسے کا ویسا زندہ سلامت تھا۔ کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔ بم نہیں پھٹا تھا، دھماکا نہیں ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ امام صاحب دعا شروع کر چکے تھے۔ شیخ سخاوت علی نے دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر پیالہ بنایا اور منہ اس میں ڈال کر دعا میں شامل ہو گیا۔ اسے لگا، خواب اب بھی جاری ہے۔ اس نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ کر پہلے زور سے آنکھیں دبائیں اور پھر رگڑیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ بھیگی ہوئی ہتھیلیاں پھر دعا کے لیے جڑ گئیں۔ ''اے اللہ! ہمارے ملک کی حفاظت فرما، مالک اپنے بندوں کی حفاظت فرما۔ پروردگارِ عالم! اپنے ماننے والوں کی حفاظت فرما!'' امام صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اطراف سے بلند ہوتی ''آمین، ثم آمین'' کی صدائیں بھی۔ شیخ سخاوت علی کے رُندھے ہوئے گلے کی آواز بھی ان صداؤں میں شامل ہو گئی۔

OO

مجسّمہ

ترنم ریاض

عظمیٰ چیخ سن کر پلٹی تو دیکھا کہ اس کی سات سالہ بیٹی کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ بہت عرصے بعد آج صبح ہی اس نے نوٹ کیا تھا کہ عناب کے رخسار پہلی بار گہرے گلابی نظر آنے لگے تھے۔

''کیا ہوا بٹیا؟'' عظمیٰ مختصر سے پتھریلے زینے پر ٹھہر گئی اور پلٹ کر عناب کی طرف دیکھا تو عناب بھاگ کر اس کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

''وہ.........وہ.........مجسمہ چلنے لگا ہے امی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے.........وہ ....وہ۔'' عناب پر کپکپی طاری تھی۔

''نہیں بیٹے.........آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' عظمیٰ نے جھک کر اس کے آنسو پونچھے۔ اس کے ماتھے پر آرہے بالوں کو ایک ہاتھ سے سنوارا اور دوسرے ہاتھ سے اسے لپٹائے رکھا۔ مگر اس کا ہاتھ اس کے رخسار کے قریب ہی ٹھہر گیا اور وہ خود کسی پتھر کے بُت کی طرح اس منظر کو دیکھتی رہ گئی، جسے اس کی عقل کسی صورت بھی قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

☆

اس دن بچے جھیل کی سیر کے بعد بے حد اداس تھے۔ عظمیٰ انھیں۔ کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتی تھی جہاں ان کا جی بھی بہل جاتا اور ان کے تجسس کی تسکین بھی ہو جاتی۔ عظمیٰ خود

کو ان کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ مگر اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔

''وہاں کی جھیلیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔''عظمٰی نے انھیں سفر کرنے سے کئی دن پہلے سے جھیلوں اور وادیوں کی بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

''بشکل لیک جیسی......؟'' عناب نے پوچھا تھا۔

''نہیں بیٹے......یہ تو مصنوعی ہے......سیاحوں کو attract کرنے کے لیے سرکار نے بنوائی ہے۔''

''تو کیا وہاں کی ساری جھیلیں Natural ہی ہیں۔'' عظمٰی کا دس سالہ بیٹا راحیل بولا۔

''ہاں بیٹے۔ جھیلیں تو قدرت کی ہی بنائی ہوتی ہیں۔ اب چونکہ انسان جھیلیں خود بھی بنا سکتا ہے اس لیے اب بہت سی مصنوعی جھیلیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر ہمارے وہاں کی جھیلیں دنیا کی حسین ترین جھیلوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا پانی اتنا شفاف ہوتا ہے جیسے......جیسے......''

''جیسے منرل واٹر؟'' دو میں سے کسی نے کہا تھا۔

''ہاں بیٹا......ایسا شفاف کہ بس......کوئی دس سال پہلے آپ کے ابو کے ساتھ گئی تھی میں وہاں......جھیل کی سیر کو......شکارے میں بیٹھ کر۔ پانی اتنا صاف تھا کہ جھیل کی تہہ میں اُگی آبی گھاس صاف نظر آئی تھی۔ لمبی لمبی پانی کی سطح تک آتی ہوئی۔ ذرا سا جھانکو تو ہری ہری گھاس میں روپہلی مچھلیاں ادھر ادھر پھرتی نظر آتیں۔ چھوٹی، بڑی بے شمار۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ جھیل کے کناروں کے قریب جہاں پانی کی نسبت مٹی زیادہ ہوتی ہے وہاں گلابی رنگ کے نیلوفر یعنی......کنول کے بڑے بڑے پھول کھلا کرتے ہیں......اگست کے مہینے میں۔ ان کے پتے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ عناب کے چھوٹے سے سر کا چھاتا بن سکتے ہیں۔'' عظمٰی نے عناب کا سر ہاتھ میں تھام کر ہولے سے ہلا دیا۔ دونوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پھر ان مچھلیوں کے شکاری بھی نظر آتے ہیں۔ جانتے ہو کون؟''

''کون؟''

''نیل کنٹھ......اور کون نیلے، سرخ، نارنجی پروں والے۔ لمبی لمبی چونچوں والے۔ پانی کے بالکل قریب اُڑتے ہوئے اچانک گردن تک پانی میں ڈبکی مار کر جھٹ سے کسی مچھلی کو دبوچ کر پھر سے اُڑ جاتے۔''

''بیچاری.....مچھلی......''عناب نے اداس سا ہو کر کہا۔

''یہ تو Food Chain ہے........کوئی نہ کوئی Living Being کسی نہ کسی دوسرے Living Being کو کھاتا رہتا ہے۔''راحیل نے عناب کو دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

عظمیٰ کی مسکراہٹ میں محبت جھلکنے لگی۔

''یہ تو ہم شہر کی جھیل کی بات کر رہے تھے۔ وہاں کے قصبوں میں اور بھی بہت سی مشہور جھیلیں ہیں جن کے حسن کا جواب ہی نہیں........ایک تو دنیا کی شفاف ترین جھیلوں میں دوسرے نمبر پر آتی ہے۔''

پہلی صاف جھیل Supreme Lake ہے نا امی؟''راحیل نے سر ہلا کر کہا تھا۔

''ہاں بیٹا۔''

بچوں ہی کی طرح عظمیٰ خود بھی بے قرار تھی۔

☆

کوئی دس برس ہو گئے تھے........اس نے ان گلیوں کو نہیں دیکھا تھا جہاں وہ کھیلی تھی۔ وہ خوابوں میں خود کو ان راستوں پر ٹہلتا دیکھتی جہاں سے گزر کر وہ سکول، کالج، یونیورسٹی گئی تھی۔ اسے اس ہوا کی خوشبو یاد آیا کرتی جس کی ٹھنڈک اس کے جسم و جاں کو تر و تازہ رکھتی تھی۔''

کیا دن تھے وہ........

وہ ہاتھوں کی محراب سی بنا کہ منھ پر رکھ لیتی اور اپنے کمرے کی درمیانی کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی منھ سے کُک کُک کُک........کُک کُک کُک آوازیں نکالتی........جانے کس درخت کی کون سی ٹہنی پر ننھے ننھے کیڑوں کو کھوجتا کوئی ہُد ہُد اس کی آواز میں آواز ملا دیتا۔ کبھی وہ بولتی، کبھی ہُد ہُد بولتا۔

کھڑکی کے قریب ایک پُرانا پیڑ بھی تھا۔ جس پر سیاہی مائل سرخ شہتوت اُگا کرتے تھے۔ اس کی شاخوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ ان کی چہکار سے ہی اکثر وہ بیدار ہوا کرتی تھی۔

ایک دفع جب کرم کشی والوں نے ہر سال کی طرح، ریشم کے کیڑوں کے چارے

کے لیے شہتوت کے درخت کی پتوں سے لدی ساری شاخیں اتار لی تو چڑیا کا ایک گھونسلہ جانے کیسے دو ٹہنیوں کے درمیان ٹکا رہا تھا۔ مسہری پر کھڑے ہو کر عظمیٰ کو سارا منظر صاف دکھائی دیا کرتا تھا۔ چڑیا اپنے بچوں کے حلق میں چونچ ڈال کر اور سر جھٹک جھٹک کر دانہ انڈیلتی۔ اور بچے پنکھ پھڑپھڑاتے للچائی للچائی سی چہکار چھیڑے رکھتے۔ عظمیٰ پہروں انھیں سنا کرتی، گھنٹوں دیکھا کرتی، چڑیا نے کیسے اڑنا سکھایا تھا اپنے بچوں کو......قدم بہ قدم......جیسے عظمیٰ نے راحیل اور عناب کو چلنا سکھایا تھا۔ جس طرح اس کی ماں نے اسے سکھایا ہوگا۔

چڑیا ایک بار پھدک کر بچے کو دیکھتی تو وہ بھی ویسی ہی کوشش کرتا۔ مگر کبھی ایک پنکھ کھولنا بھول جاتا کبھی عدم توازن کی وجہ سے گر پڑتا۔ یا پھر بس۔ چڑیا کی طرف چونچ کیے رہ جاتا۔

چڑیا کے بچوں نے جب پہلی انفرادی اڑان بھری تھی تو اس کے کمرے کے درمیان میں لٹک رہے چھوٹے سے فانوس پر آ بیٹھے تھے۔ وہاں کمروں میں سیلنگ فین کم ہی ہوا کرتے تھے بلکہ ہوا ہی نہیں کرتے تھے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

وہ چوکھٹ پر دانہ بکھیر دیا کرتی تھی۔ بچے شاید اس کی موجودگی سے کبھی خائف نہ تھے۔

فانوس کی تار کے ارد گرد سوکھی ہوئی چکنی مٹی سے دو ابابیلوں نے سیلنگ سے لگا کر ایک گھونسلہ بھی بنا رکھا تھا۔ خدا جانے یہ مخصوص مٹی کس مخصوص ندی کے کنارے سے لاتی تھیں یہ ابابیلیں۔ ایک گھونسلے کے لیے ان گنت بار مٹی ڈھونا پڑتی اور مٹی بھی ایسی جیسے اس میں گوند ملا دیا گیا ہو۔ بھری ہوئی چونچ کی ساری مٹی گھونسلے سے چپک جاتی اور ایک ذرہ بھی نیچے نہ گرتا۔ کبھی اتوار کو عظمیٰ جب دیر سے بیدار ہوتی تو سیلنگ کے قریب سے یاقوت جیسی چار آنکھیں چمکا کرتیں۔ چپ چاپ دیکھتی ہوئی۔ ابابیلوں نے کبھی اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر جب وہ اٹھ بیٹھتی اور کھڑکی کا پردہ سرکاتی تو وہ لطیف سی چہکار چھیڑ دیتیں۔ جیسے ایک ایک ماترا پر گایا جانے والا کوئی غیر یقینی نغمہ......جن دنوں عظمیٰ اپنے اس کمرے میں اکیلی سونے لگی تھی تو ابابیلوں کی موجودگی نے اکیلے ہونے کا احساس تک اس کے پاس نہ آنے دیا۔

سفید سینوں اور کالے کالے لمبے پنکھوں والی ابابیلیں۔ جیسے خمیدہ کمر والی ضعیفاؤں نے سفید لباس پر بڑے بڑے سیاہ اوور کوٹ پہن رکھے ہوں۔

کتنی یادیں کتنے سکھ وابستہ تھے اس جگہ کے ساتھ۔ دکھ بھی وابستہ ہوں شاید......

مگر اسے یاد نہ تھے۔

''مگر ہم جائیں گے کب امی...... '' عناب نے مچل کر کہا تھا تو راحیل کی آنکھوں میں سوالیہ سی چمک جگمگائی تھی۔

''آج آپ کے ابو ٹکٹ لے آئیں گے...... بس آپ اپنی اپنی پیکنگ مکمل رکھیے۔ کل یا پرسوں ہی نکلنا ہوگا...... گھنٹے بھر کی اڑان...... اور ہم اپنے شہر میں...... ''

☆

جب وہ شہر پہنچے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایرپورٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو سفیدے کے لمبے چھریرے درخت دیکھ کر عظمٰی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''یہ سفیدے کے درخت ہیں بیٹا۔''

گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے دائیں بائیں بیٹھے بچوں سے اس نے کہا۔

''اور وہ بید کے...... یعنی Willow۔''

فیروز نے ہاتھ سے سڑک کے کناروں سے ذرا دور باغوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی ایک قسم Weeping Willows کہلاتی ہے جو زیادہ نمی والی زمین میں اچھی طرح پنپتی ہے۔

''Weeping کیوں ابو......''

''وہ بیٹا اس لیے کہ ان کی ساری شاخوں کا جھکاؤ زمین کی جانب ہوتا ہے۔ جیسے کسی پہاڑی سے کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ ان کو بید مجنوں بھی کہتے ہیں۔''

''برگد کی طرح؟ جس کی جڑیں اوپر سے نیچے لٹکتی رہتی ہیں۔'' راحیل نے کہا۔

''ہاں۔ کچھ کچھ۔''

''لوگ کتنے گورے ہیں...... وہ دیکھئے امی۔'' راحیل نے سڑک کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں بس اسٹاپ پر کچھ طلبا بس کے منتظر تھے۔

''اور Red، Red بھی۔'' عناب نے کہا۔

''آپ یہاں رہیں گے تو آپ بھی ایسے ہی سرخ و سفید ہو جائیں گے۔ یہاں کی ہوا تازہ جو ہے...... پہاڑوں پر ایسی ہی تازگی نظر آیا کرتی ہے...... جب ہم یہاں سے گئے

تھے تو راحیل کے رخسار ایسے سرخ تھے۔" عظمیٰ نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔

"اور میرے امی........"

"آپ تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔Metro Polis اور گرم آب وہوا میں رہ کر ہم سب ہی سانولے سلونے ہو گئے......." عظمیٰ ہنس دی۔

چھٹیاں مہینے بھر کی تھیں۔ ہفتہ بھر رشتہ داروں سے ملاقاتوں میں گزر گیا۔

دوسرے ہفتے کوئی چھ روز ہڑتال رہی کہ کسی دکاندار کو کسی سرکاری محافظ نے محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد شہر میں ادھر ادھر بم دھماکے ہونے لگے۔ ضروری کاموں کے لیے لوگ قدرت کے بھروسے نکل جاتے مگر گھومنے پھرنے کے خیال سے کہیں جانا.......؟ بات کچھ بنتی نہ تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ان کی رہائش ہی کے باہر بارودی سرنگ میں دھماکہ ہوا......دھماکے والے بھاگ گئے۔ راہ گیروں کو پکڑا گیا۔ گھروں کی تلاشیاں ہوتی رہیں۔

تین دن پہیہ جام رہا.......اور آخیر ہفتہ بس سوچوں میں گزر گیا۔

واپسی میں دو دن رہ گئے۔ اب تو کہیں جانے کا پروگرام بنانا ہی تھا۔ بچے جھیل کی سیر کے لیے بیقرار تھے اور ان سے زیادہ عظمیٰ اور فیروز۔

جھیل تک کا راستہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا۔ ان دنوں اس راستے میں پانچ چھ سرکاری پارک ہوا کرتے تھے۔ اب صرف ایک بچا تھا۔ باقیوں میں قطار در قطار نئے نئے کتبے کھڑے تھے۔ اکثر پر درج عمریں ۱۵ اور ۳۰ برس کے درمیان تھیں۔

وہ لوگ جب جھیل کے قریب پہنچے تو موسم نہایت خوشگوار تھا۔

جھیل کا باندھ کئی جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ کناروں کے پانی میں چھلے ہوئے بھٹے اور Wafers کے خول تیر رہے تھے۔ پانی گدلا تھا۔

"یہ تو گندی ہے امی........" عناب نے ماں کی طرف دیکھ کر بے یقینی کے سے تاثرات لیے کہا۔

"یہ کنارہ ہے نا.......آگے آگے بالکل شفاف ملے گی جھیل۔" عظمیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ فیروز شکارے والے سے بات کر رہا تھا۔

"ہم شکارے میں بیٹھ کر وہاں تک جائیں گے......وہ......وہ دور جو چھوٹا سا جزیرہ

ہے نا.......... جس میں چنار کے چار درخت ہیں...... وہ وہاں....... وہاں جاتے ہوئے ہمیں راستے میں بے شمار ننھی ننھی مچھلیاں، ہری ہری آبی گھاس....... نیل کنٹھ اور سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔'' عظمیٰ نے ہاتھ سے دور اشارہ کرکے بچوں سے کہا۔

ہری بیلوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے پردوں اور نرم ربر کی کشادہ سیٹوں والا ایک شکارہ کنارے کے زینے سے لگا ان کا منتظر تھا...... شکارے کا نام لیک برڈ (Lake Bird) تھا۔

بچے گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ عظمیٰ اور فیروز آگے والی نشست پر بیٹھے اپنے اطراف دیکھ رہے تھے...... کوئی دو ایک شکارے دور دور نظر آ رہے تھے۔

''رونق کتنی کم ہو گئی ہے''۔ عظمیٰ نے رونق کے غائب ہونے کی جگہ رونق کم کہا تو فیروز کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کشتی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عظمیٰ کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔

کتنی یادیں وابستہ تھیں اس جھیل کے ساتھ...... وہ اپنے ابو امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک بڑی سی گھر نما کشتی میں، عمدہ پوشاک پہنے، سامان خورد نوش سے لیس جھیل کی سیر کو نکلی ہے۔ کناروں پر مغل باغات کی سیر بھی کی جائے گی...... ابو کتنی مصروفیت کے باوجود چھٹی کے روز سب کو سیر پر لے جاتے تھے۔

اب ابو بھی نہیں رہے...... میلے کا سا سماں ہوا کرتا تھا۔ مقامی لوگوں سے لدی کشتیاں، ملکی اور غیر ملکی سیاح....... کوئی موٹر بوٹ پر جھیل کے پانی میں زور و شور سے لہریں پیدا کرتا ہوا جا رہا ہے، کوئی Water Skeeing کر رہا ہے۔ ہنی مون پر آئے جوڑے شکارون کے پردے برابر کیے عہد و پیمان میں مصروف ہیں، کہیں پیرا کی ہو رہی ہے، کہیں کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے........... کسی پھولوں سے لدی کشتی کو کوئی گل رخ حسینہ کھیتی ہوئی پھول بیچ رہی ہے۔ ان پھولوں میں گلِ نیلوفر اپنے حسن و جسامت کی بنا پر سب پھولوں کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے....... اس کے ساتھ گلاب، نرگس، گیندا، موگرا، چمیلی اور جانے کون کون سی قسم کے پھول ماحول کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ کسی کشتی پر پھلوں اور سبزیوں کی بہار ہے۔ جھیل میں تیرتے باغیچوں میں اُگی سبزیاں اور ایک سبزی جو پانی میں اُگا کرتی ہے۔ نیلوفر کے پھول کا موسم ختم ہو جانے پر اس کے درمیان کا حصہ جہاں ننھی ننھی پتیاں اُگی ہوتی ہیں، رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے اور کمل ڈوڈہ کہلاتا ہے۔ جس میں نرم و نازک لذیذ گریاں ہوتی ہیں اور اسی نیلوفر کی ڈنڈی

بڑی ہو کر، کمل گگڑی، بھیں یا ندور کہلاتی ہے۔ جو ایک مرغوب سبزی ہے۔ جھیل کے کناروں پر ہی ایک مخصوص قسم کی گھاس بھی اُگتی ہے جس کی شاخیں نہیں ہوتیں۔ اس کی چٹائیاں بُنی جاتی ہیں۔ ان چٹائیوں پر مٹی بچھا کر اسے قابلِ کاشت بنایا جاتا ہے۔ ان تیرتے ہوئے باغیچوں میں اُگی سبزیاں حیاتین سے پُر ہوتی ہیں۔ عظمیٰ نے سنا تھا کہ اس طرح کے تیرتے ہوئے باغ وادی کے علاوہ دنیا میں صرف جنوبی امریکہ میں 'پیرو کی ٹٹیکا' جھیل میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ قدرت کے بنائے ہوئے جزیروں پر انسان نے لگائے ہیں، جانے کیسے تیرتے ہوں گے وہ جزیرے۔ ان پر بھی سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ مگر وادی کی جھیلوں، ڈل، ڈلر وغیرہ پر تیرنے والے باغیچے انسان کے ہاتھوں کا کرشمہ ہیں —— آج پھلوں پھولوں والی کوئی کشتی نظر سے نہیں گزری ابھی تک۔

عظمیٰ سوچتی........

یہ ملاح کتنی سست رفتاری سے نیا کھے رہا ہے۔ جیسے اداس ہو۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں، پُر جوش ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھنا ایک الگ ہی لطف دیتا تھا۔

کہیں کیوں نظر نہیں آ رہی تھیں آج یہ سب چیزیں؟.......کیوں......؟ ہاں وہ جانتی تھی کیوں۔ مگر سمجھنے سے قاصر تھی۔ دور کنارے پر کہیں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

عظمیٰ حیرت سے دیکھنے لگی۔

یہ تو اگست میں کھلا کرتے تھے۔ جون میں ہی کیسے...... ہاں کرۂ ارض کی حرارت بڑھ جو گئی ہے......اسی لیے.........اس دفع دوپہریں کچھ گرم بھی تھیں...... عظمیٰ کو کئی بار خیال آیا تھا کہ یہاں بھی گرمی سے نپٹنے کا کوئی انتظام کیا جانا چاہیے۔ نئے مکانوں میں اسی لیے اب سیلنگ میں پنکھے لگائے جا رہے ہیں......بھٹے، اخروٹ وغیرہ جو اکتوبر میں پکا کرتے تھے........ فروخت ہو رہے ہیں......ساری دنیا ہی بدل رہی ہے.......... عظمیٰ آسمان کو دیکھنے لگی۔

مگر جھیل تو نہیں بدلی......اسے یکلخت خیال آیا تو وہ جھک کر پانی کو دیکھنے لگی۔ کشتی کنارے سے خاصی دور آ گئی تھی........ مگر پانی.........

عظمیٰ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا اور ریزہ ریزہ بکھر گیا۔ وہ پانی کو دیکھتی چلی گئی۔ پانی مسلسل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا کناروں کے قریب تھا صرف اس میں اس وقت اسے چھلے ہوئے بھٹے اور ویفرس کی خالی تھیلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جھیل کا پانی پہلے سے اتنا مختلف تھا کہ اسے محسوس ہوا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے....کوئی ڈراونا خواب جو ختم ہونے میں نہیں آرہا۔اس کے چاروں طرف میلا گدلا پانی تھا......دور دور تک پھیلا ہوا......جیسے پانی میں سیاہی جیسی کوئی چیز گھل گئی ہو۔گلی سڑی گھاس کے تنکے پانی میں تیر رہے تھے۔پانی کسی کم گاڑھے دلدل کی طرح معلوم ہوتا تھا۔محض انچ بھر گہرائی کے بعد، پانی کے اندر کچھ واضح نہ تھا کہ کنارے پر بنے ہوٹلوں اور آبی گھروں کی آلودگی کا نکاس جھیل میں ہی ہوتا اور صفائی کا انتظام نہ کے برابر۔کہیں کوئی مچھلی نہیں تھی......نہ ہی کوئی نیل کنٹھ۔بچے اس سے جانے کیا کیا سوال کررہے تھے۔فیروز انھیں تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کررہا تھا۔اور وہ شاید اپنے اندر کوئی بکھراؤ سا محسوس کررہی تھی کہ خود کو سمیٹ کر کسی سے بات کرنا اس کے لیے مشکل ہورہا تھا۔

کیا صدیوں پہلے کی طرح آج کوئی حکیم سُویہ نہیں پیدا ہوسکتا۔کیا پھر سے کوئی معرکہ سرنہیں ہوسکتا۔کتنا مشہور ہے کشمیر کی تاریخ میں سُویہ کا کارنامہ۔صدیوں پہلے کا کارنامہ۔نویں صدی کے ایک راجہ اونتی ورمن کے راج میں ایک دانا درباری حکیم سُویہ ہوا کرتا تھا۔جہلم جو ان دنوں وِتستا کہلاتا تھا، گرمی کے موسم میں اکثر و بیشتر طغیانی پر ہوتا کہ دھوپ کی تمازت سے پہاڑوں کی برف پگھل کر وادیوں کی طرف بہہ نکلتی تھی۔اور کناروں پر بسے گاؤں،شہر سیلاب کی زد میں آجاتے تھے۔خطے کے شمالی علاقوں میں ایک حصہ ہر برس جب سیلاب کا شکار ہونے لگا تو سُویہ نے رعایا سے محبت کرنے والے راجہ اونتی ورمن کے خزانے سے اشرفیاں لے کر دریا میں پھینکی جنھیں پانے کی خواہش میں لوگوں نے دریا کی تہہ سے مٹی نکال کر دریا کو گہرا اور کناروں کو اونچا کردیا جس سے سیلاب کا خطرہ جاتا رہا......لوگ سُویہ کے اس کارنامے کی وجہ سے اسے حکیم سُویہ پکارنے لگے کہ اس کی حکمت سے وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئے تھے۔اس مقام کا نام سُویہ پور رکھا گیا جو رفتہ رفتہ سوپور ہوگیا......عظمیٰ افسردگی سے سوچتی رہی......کیا آج کوئی ایسا حکیم......کوئی حاکم......کوئی ہمدرد......کوئی......

کشتی کو ہلکا سا جھٹکا لگا تو اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔کشتی کنارے سے لگ چکی تھی۔بچے بجھے بجھے سے تھے۔فیروز خاموش......اور وہ بے حد اداس۔فیروز کو کہیں جانا تھا۔

عظمیٰ کی نظر بچوں کے چہروں کی طرف اٹھ گئی۔

''عجائب گھر دیکھیں......؟ Museum......؟''

پتہ نہیں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسی کوئی شے کہاں سے آچپکی۔

''ایک دم پرانے زمانے کی چیزیں......جو آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوں گی.....'' اس نے تاثرات میں اشتیاق پیدا کیا۔

''جی امی......'' راحیل نے آہستہ سے کہا۔

''ہم بھی دیکھیں گے......'' عناب ہلکے سے مسکرائی۔

میوزیم جہلم کے کنارے ایک روح پرور باغ سے لگا ہوا نہایت پرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب ریت کے تھیلوں میں محفوظ پہرے دار نے ان کی شناختی پرچیوں کا معائنہ کیا......میوزیم میں داخل ہوتے ہی بچے ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔

احاطے سے اندر داخل ہوئے تو ایک پرانے وقتوں کی توپ نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ نظر آیا۔ داہنی طرف چھوٹا سا زینہ اتر کر باغیچے کے کنارے سے لگا ہوا ایک بہت بڑا پتھر تھا جو کوئی کتبہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف بغیر سر کی ایک مورتی تھی جس کا جسم نہایت خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔

عمارت کے اندر جانے کا راستہ مختصر تھا اور پتھر کی پتلی لمبی سلوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر بنایا گیا تھا.....سلوں کے درمیان جابجا ہری ہری گھاس اُگ آئی تھی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر سرسوتی کے ایک پرشکوہ مجسمے پر پڑی،'' جس کے قدموں کے پاس لکھی عبارت پر دوسری صدی کی کوئی تاریخ درج تھی۔ سرسوتی کا مجسمہ آنکھیں بند کیے پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شیشے کے ایک بڑے شوکیس میں ایک اور مورتی تھی......یہ مورتی درگا کی تھی جو ایک بہت بڑے دروازے میں جڑی ہوئی تھی۔ غالباً کسی مندر کا حصہ رہی ہوگی اور کھدائی میں دریافت ہوئی تھی۔ اس کے گرد لگے دائرے میں ماتا درگا کے مختلف روپ لیے کئی چھوٹے چھوٹے مجسمے تھے......اور یہ سب ایک ہی پتھر کو تراش کر کسی عظیم فن کار نے نہایت مہارت سے بنایا تھا۔

''یہ چھٹی صدی میں رائج تھا.....تانبے کا ہے۔'' بجھے بجھے سے گائڈ نے عجائب خانے کی سیر کو آئے اکلوتے سیاح کنبے کو بتایا۔ یہ سکہ مجسمے کے بالکل سامنے شیشے کی چھوٹی سی صندوقچی میں لگا تھا۔

دوسری طرف بھگوان مہاویر کا بہت بڑا مجسمہ جیسے کہ صدیوں سے مراقبے میں بیٹھا تھا۔ کونے میں کالی کی پرجلال مورتی تھی۔ اس کا ترشول اس کے پیروں کے پاس پڑے کسی ظالم کے سینے میں پیوست تھا۔

ہال کا آخری سرا ایک مستطیل کمرے کے ساتھ جوڑا گیا تھا...... جس میں چھوٹے سے دروازے سے گزر کر ہی داخل ہوا جاتا۔

اس کمرے میں مختلف اوزار اور ہتھیار تھے۔ شیشے کی الماریوں میں بند۔ جن کے کونوں پر سن، حاکم کا نام وغیرہ درج تھا۔

راحیل اور عناب انھیں نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

چھ چھ فٹ لمبی بندوقیں..... ذرہ بکتر۔ کچھ ہاتھی دانت کے دستے والی تلواریں تھیں۔ مخصوص امراء وزراء کی۔ کچھ پر دھات میں چھلائی سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

قافلہ دوسرے ہال میں داخل ہوا...... وہاں کی اشیاء بالکل مختلف تھیں۔ مغلوں کے زمانے کے غالیچے، پشمینے کے قالین...... شاہ توس کی ایک بڑی سی چادر پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت کے شہر کا ایک نقشہ۔ مکمل تفصیل سے بنا ہوا۔ جس میں جھیلیں، بستیاں، کوہ، دریا سب مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگوں سے کاڑھے گئے تھے۔

مغلیہ، شاہی پوشاکیں، رومال وغیرہ۔ پیر ماشی اور اخروٹ کی لکڑی سے بنی دستکاریاں مختلف دھاتوں کے برتن۔ ہاتھ دھلوانے والا تانبے کا قلعی کیا ہوا بہت بڑا منقش کوزہ اور آفتابہ۔

''اسے کیسے استعمال کرتے ہوں گے امی؟'' راحیل نے پوچھا۔

''کئی کئی لوگ اٹھاتے تھے دونوں کو..... بیک وقت کم سے کم چھ چھ آدمی۔'' گائڈ نے اسے بتایا۔

شیشے کے ڈھکن والی لمبی سی میز کے اندر مختلف دھاتوں کے ہاتھ سے بنے زیورات تھے۔ ان میں کچھ اب بھی رائج ہیں۔ عظمیٰ نے سوچا۔ جیسے کانوں کے بڑے بڑے بالے۔ اتنے بھاری جھمکے کہ ایک دوسرے سے ایک زنجیر کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ وہ زنجیر سر کے اوپر آنچل کے اندر رہتی اور کانوں پر بوجھ نہ پڑتا۔

دھات اور پتھروں سے بنی پازیبیں، مالائیں...... کچھ برتن۔ کچھ قدیم کتب کے قلمی نسخے..... مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن پاک۔ کچھ قدیم ریاستی معاہدے......

اتنی دلچسپ اور اہم اشیاء کو دیکھ کر عظمیٰ اور بچے کچھ کھلے سے مطمئن سے نظر آ رہے تھے۔ اور پُر اشتیاق ہر شے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

اس کے بعد کے ہال کو ایک راہداری کے ذریعے دوسری طرف کے ہال کے ساتھ

جوڑا گیا تھا۔ بچے اگلے ہال کی طرف جا چکے تھے۔

عظمیٰ جب وہاں پہنچی تو بچے نہایت انہماک سے وہاں نصب مجسموں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ مجسمے ریاست کے تینوں خطوں میں رہنے والے لوگوں کے مختلف ملبوسات میں ایستادہ ڈمی کی طرح بنائے گئے تھے۔ مگر قدیم لباس میں۔ بغیر زیورات کے۔ سادہ۔ سادہ سے۔

اپنے بچپن میں بھی عظمیٰ نے انھیں اسی جگہ پر ایسے ہی نصب دیکھا تھا۔ اس کے کپڑے اب بوسیدہ ہو چکے تھے۔ گو کہ نلکیوں کے ذریعے تمام الماریوں تک پرزرویٹو گیس (Preservative Gas) پہنچائی جاتی تھی مگر یہ مجسمے الماریوں میں نہیں رکھے گئے تھے۔

سامنے کا دروازہ ایک بڑے ہال میں وا ہوتا تھا۔ اس میں عنقا اور موجود، دونوں قسم کے بہت سے پرندوں اور جانوروں کی کھالیں حنوط کر کے اس مہارت سے اصلی شکل میں منتقل کی گئی تھیں کہ نقل کا گماں تک نہ ہوتا تھا۔

شیر۔ چیتا۔ تیندوا۔ مارخور بکرا جس کے سینگ خم دار ہوتے ہیں اور جو بڑے شوق سے سانپ کھاتا ہے۔ اود بلاؤ۔ نیولا۔ بھالو وغیرہ۔ اور اس کے علاوہ وادی میں پائے جانے والے پرندے، چیل۔ کوا۔ گدھ۔ کبوتر۔ ن چڑ جو مور سے مشابہ ہوتا ہے کہ اس کے سر پر تاج تو ہوتا ہے مگر دم نہایت مختصر۔ مختلف قسم کی بطخیں، راج ہنس، بگلے، طوطے، مینا، کستوری، کئی طرح کی بلبلیں اور دیگر اقسام کی چڑیاں۔

اسی ہال میں دوسری طرف اکبر بادشاہ کا چھوٹا سا آدھے دھڑ کا مجسمہ تھا۔ عظمیٰ کو یاد آیا کہ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تو اس کے چچا نے بنایا تھا۔ چچا بہت لگن سے مجسمے بناتے تھے۔ انھوں نے اکبر کے تاج پر سونے کے گھول سے نقاشی کی تھی۔ پھر بازو کی تکلیف کی وجہ سے انھوں نے اپنا یہ مشغلہ چھوڑ دیا تھا۔ چچا نے اپنی ایک چہیتی بیوی کا مجسمہ بھی بنایا تھا۔ وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ وہ مجسمہ اب بھی ان کی آبائی حویلی کے کسی گوشے میں محفوظ ہے۔

یہاں کئی مجسمے چچا کے ہاتھوں کے بنے تھے۔ اونی پھرن اور ٹوپی پہنے حقہ پیتا ہوا آدمی۔ سماوار سے پیالی میں چائے انڈیل رہی تلّے کی کڑائی والے گریبان کا پھرن پہنے خاتون۔ ہل چلاتا ہوا کسان۔ دودھ بلوتی ہوئی گرہستن وغیرہ، کانچ لگی الماریوں میں محفوظ تھے اور اب بھی ان کی چمک جوں کی توں قائم تھی۔ ویسے ہی جیسے عظمیٰ نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی۔

مگر ٹوٹے کانچ کی الماریوں کے اندر کی چیزوں میں کوئی جاذبیت باقی نہ تھی۔ یعنی

حال کی طرح ماضی بھی اُجڑ سکتا ہے کہ یہاں کی بھی دیکھ بھال ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہی تھی۔
عظمیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

گائیڈ دوسرے ہال تک ساتھ آ کر لوٹ گیا تھا۔

وہ اداس اداس سی آگے بڑھتی رہی.........ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی ہوئی جانے کیا کیا سوچتی ہوئی۔

ہال کے آخری سرے پر جہاں سے برآمدہ نظر آتا تھا، ایک قدِ آدم مجسمہ ایک پرانی چھوٹی سی میز پر ٹکا ہوا تھا۔ جیسے کسی ایسی بیمار لڑکی کی مورت، جو کھڑی رہنے سے تھک کر ذرا سا میز پر بیٹھ گئی ہو۔ سوکھی لکڑی سے ہاتھ پاؤں......گڑھوں میں دھنسی آنکھیں......عظمیٰ نے یہ مجسمہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عظمیٰ سوچنے لگی۔ کس قدر عظیم فن پارہ......کسی بلند درجہ فن کار کا بنایا ہوا مجسمہ......وہاں کی ادھیڑ عمر کنواریوں کا ہو بہو عکاس۔ عظمیٰ اس شاہکار کو انگشت بدنداں دیکھتی رہ گئی۔

واہ.......

جانے مجسمے کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ دل میں درد سا بھر جاتا......اس کی نظریں باہر برآمدے والے راستے پر گڑھی تھیں جیسے وہ کسی کی راہ تک رہا ہو۔

عظمیٰ عش عش کر اُٹھی۔ اور بچوں کو بلاتی ہوئی عمارت سے باہر نکل آئی۔ راحیل اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

عناب نے پکار کر کہا کہ آ رہی ہے.........

عجائب خانے کے کراہتے ہوئے سکوت میں اس کی آواز گونج اُٹھی.........اونگھتے ہوئے محافظ نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔

عظمیٰ آگے بڑھ گئی۔ ابھی اس نے پہلی ہی زینے پر قدم رکھا تھا کہ اسے عناب کی چیخ سنائی دی۔ عناب کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

☆

ادھیڑ عمر کنواری لڑکی کا لاغر مجسمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا انہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔
عظمیٰ دم بخود اسے دیکھتی رہ گئی

OO

طبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس ایک نظر میں

اقبالیات

یت اقبال اردو	(صدی ایڈیشن)	125/-
اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	300/-
ودانش فرنگ	عبدالرحیم قدوائی	81/-
ور اقبال	پروفیسر آل احمد سرور	150/-
ال فن اور فلسفہ	پروفیسر نورالحسن نقوی	50/-
شاعر و مفکر	پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
جواب شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	20/-
ب درا (عکسی)	علامہ اقبال	45/-
جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	35/-
پ کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	30/-
ان حجاز (عکسی)	علامہ اقبال	20/-

غالبیات

ن غالب	مقدمہ پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
ب شاعر اور مکتوب نگار	پروفیسر نورالحسن نقوی	60/-
ب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	75/-

سرسید

ید احمد خاں اور ان کا عہد	پروفیسر ثریا حسین	300/-
ید اور ہندوستانی مسلمان	پروفیسر نورالحسن نقوی	100/-
لعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	80/-
ید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	90/-
ب مضامین سرسید	آل احمد سرور	50/-
ید کا سفرنامہ: مسافران لندن	پروفیسر اصغر عباس	250/-
لمات سرسید احمد خاں	ڈاکٹر طارق سعید	50/-
ید اور ان کے کارنامے	پروفیسر نورالحسن نقوی	25/-
ید ایک تعارف	خلیق احمد نظامی	20/-

لسانیات

صر تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	120/-
تنقید کے لسانی مضمرات	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	200/-
زبان کی تاریخ	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
کی لسانی تشکیل	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
ستانی لسانیات	سید محی الدین قادری زور	75/-
لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	75/-

ادب و تنقید

نظم: نظریہ و عمل	پروفیسر عقیل احمد صدیقی	350/-
یاتی تنقید: مسائل و مباحث	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	100/-
ف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد	125/-
ان اردو	بشارت حسین بشارت	250/-

غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	80/-
سورج کو نکلتا دیکھوں (کلیات شہریار)	شہریار	500/-
سیف و سبو (مجموعہ کلام)	جوش ملیح آبادی	95/-
کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	100/-
مرزا رسوا کی ناولیں: تنقید و تجزیہ	پروفیسر خورشید الاسلام	150/-
باقیات خورشید الاسلام	پروفیسر خورشید الاسلام	200/-
داستان کا فن	ڈاکٹر اطہر پرویز	200/-
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
نثری داستانوں کا سفر	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	محمد یٰسین	250/-
ریڈیو نشریات	زبیر شاداب	250/-
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	150/-
ترجمہ کا فن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	200/-
خواب باقی ہیں (خودنوشت)	آل احمد سرور	200/-
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	180/-
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	150/-
افکار کے دیے	آل احمد سرور	200/-
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	150/-
مجنوں گورکھپوری: حیات و ادبی خدمات	ڈاکٹر شاہین فردوس	250/-
مسلم یونیورسٹی کی کہانی	افتخار عالم	200/-
اردو ادب میں خاکہ نگاری	صابرہ سعید	250/-
ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی	80/-
نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ	اشفاق محمد خاں	80/-
فن تنقید اور تنقید نگاری	پروفیسر نورالحسن نقوی	60/-
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	75/-
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	90/-
جدید غزل	رشید احمد صدیقی	50/-
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	80/-
تفہیم ادب	شائستہ نوشین	125/-
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	50/-
غزل کی سرگزشت	اختر انصاری	40/-
اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	100/-
تاریخ ادب اردو	پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	60/-
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	90/-
اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	100/-
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	150/-
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	45/-
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	75/-
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	90/-

کتاب	مصنف	قیمت
ناول کیا ہے	محمد حسن فاروقی	50/-
ناول کا فن	مترجم ابوالکلام قاسمی	50/-
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	50/-
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	100/-
جدید شاعری	عبادت بریلوی	200/-
غزل اور مطالعۂ غزل	عبادت بریلوی	200/-
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	75/-
نیا افسانہ	وقار عظیم	75/-
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	80/-
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	50/-
انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	100/-
مقدمہ کلام آتش	خلیل الرحمٰن اعظمی	40/-
آج کا اردو ادب	ابواللیث صدیقی	70/-
اصناف ادب اردو	قمر رئیس	60/-
مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	25/-
باغ و بہار	مقدمہ: ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	50/-
سب رس	مقدمہ: ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	80/-
موازنۂ انیس و دبیر	مقدمہ: ڈاکٹر فضل امام	65/-
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی	70/-
امراؤ جان ادا	مقدمہ: تمکین کاظمی	70/-
مجموعہ نظم حالی	مقدمہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	50/-
مثنوی سحر البیان	مقدمہ: ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	50/-
مثنوی گلزار نسیم	مقدمہ: ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	35/-
انار کلی	مقدمہ: ڈاکٹر محمد حسن	50/-
ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	100/-
افکار و انشاء	وارث کرمانی	80/-
فکر و آگہی	انجمن آرا	60/-

سیاسیات

کتاب	مصنف	قیمت
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم قدوائی	100/-
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹکس)	محمد ہاشم قدوائی	100/-
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	محمد ہاشم قدوائی	90/-
مبادی سیاسیات (ایلمنٹس آف پالیٹکس)	محمد ہاشم قدوائی	90/-

متفرق

کتاب	مصنف	قیمت
تعلیمی نفسیات کے پہلو	آفاق ندیم/سید معاذ حسین	150/-
اصول تعلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	60/-
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	60/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	70/-
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول	محمد شریف خاں، آفاق احمد عرفانی	40/-
اصول تدریس	محمد قاسم صدیقی	50/-
ثانوی تعلیم اور اس کے مسائل	محمد قاسم صدیقی	40/-

کتاب	مصنف
تعلیم اور اس کے اصول	محمد شریف خاں
فلسفۂ تعلیم	محمد شریف خاں
ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کے مسائل و رجحانات	
جدید تعلیمی نفسیات	محمد شریف خاں
عربی کیسے پڑھائیں	محمد شریف خاں
اردو کیسے پڑھائیں	سلیم عبداللہ
آیئے اردو سیکھیں	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
سائنس کی تدریس	وزارت حسین، اوودو الحق
عام معلومات	ضیاء الدین علوی
ایجادات کی کہانی	ضیاء الدین علوی
سائنس کی دنیا	وزارت حسین
جدید علم سائنس	وزارت حسین
رہبر صحت	مسرت زمانی
رہبر تندرستی	مسرت زمانی
علم خانہ داری	مسرت زمانی
بچوں کی تربیت	مسرت زمانی
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی (اول)	ڈاکٹر محمد عارف خاں
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی (دوم)	ڈاکٹر محمد عارف خاں
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی
اردو صرف	ڈاکٹر محمد انصاراللہ
اردو نحو	ڈاکٹر محمد انصاراللہ
اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے)	
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے۔ شہید

ناول اور افسانے

کتاب	مصنف
آخر شب کے ہمسفر (ناول)	قرۃ العین حیدر
چار ناولٹ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر
روشنی کی رفتار (افسانے)	قرۃ العین حیدر
واردات (افسانے)	پریم چند
ضدی (ناولٹ)	عصمت چغتائی
آنگن (ناول)	خدیجہ مستور
خواتین کے نمائندہ افسانے	مرتبہ محمد قاسم صدیقی
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
کرشن چندر اور ان کے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
اردو کے تیرہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
منٹو کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس
نمائندہ مختصر افسانے	مرتبہ محمد ظاہر فاروقی
باغ کا دروازہ (افسانے)	طارق چھتاری
نیلم (افسانے)	حمیدہ سلطان
سارے دن کا تھکا ہوا پرش (ناول)	صلاح الدین پرویز

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس ایک نظر میں

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
کلیات اقبال اردو	(صدی ایڈیشن)	125/-
فکر اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	300/
جلوۂ دانش فرنگ	عبدالرحیم قدوائی	81/-
دانشور اقبال	پروفیسر آل احمد سرور	150/-
اقبال فن اور فلسفہ	پروفیسر نورالحسن نقوی	50/-
اقبال شاعر و مفکر	پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
شکوہ جواب شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	20/-
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	45/-
بال جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	35/-
ضرب کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	45/-

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
دیوان غالب	مقدمہ پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
غالب: شاعر اور مکتوب نگار	پروفیسر نورالحسن نقوی	60/-
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	75/-

سرسید

کتاب	مصنف	قیمت
سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	پروفیسر ثریا حسین	300/-
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	پروفیسر نورالحسن نقوی	100/-
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	80/-
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	90/-
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	60/-
سرسید کا سفرنامہ: مسافران لندن	پروفیسر اصغر عباس	250/-
مطالعات سرسید احمد خاں	ڈاکٹر طارق سعید	50/-
سرسید اور ان کے کارنامے	پروفیسر نورالحسن نقوی	25/-

لسانیات

کتاب	مصنف	قیمت
مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	120/-
ادبی تنقید کے لسانی مضمرات	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	200/-
اردو زبان کی تاریخ	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
اردو کی لسانی تشکیل	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
ہندوستانی لسانیات	سید محی الدین قادری زور	50/-
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	75/-

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
جدید نظم: نظریہ و عمل	پروفیسر عقیل احمد صدیقی	350/-
نظریاتی تنقید: مسائل و مباحث	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	100/-
اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد	125/-
غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	80/-
جدید غزل	رشید احمد صدیقی	50/-
سورج کو نکلتا دیکھوں (کلیات شہریار)	شہریار	500/-
سیف و سبو (مجموعہ کلام)	جوش ملیح آبادی	95/-
کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	90/-
مرزا رسوا کی ناولیں: تنقید و تجزیہ	پروفیسر خورشید الاسلام	150/-

کتاب	مصنف	قیمت
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
نثری داستانوں کا سفر	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	محمد یٰسین	250/-
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	150/-
ترجمہ کا فن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	200/-
خواب باقی ہیں (خودنوشت)	آل احمد سرور	200/-
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	150/-
اردو ادب میں خاکہ نگاری	صابرہ سعید	250/-
ہماری شاعری	سید مسعود حسین رضوی	80/-
نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ	اشفاق محمد خاں	80/-
فن تنقید اور تنقید نگاری	پروفیسر نورالحسن نقوی	60/-
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	75/-
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	90/-
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	80/-
تفہیم ادب	شائستہ نوشین	150/-
اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	100/-
تاریخ ادب اردو	پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	75/-
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	90/-
اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	100/-
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	150/-
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	45/-
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	75/-
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	60/-
ناول کیا ہے	محمد احسن فاروقی	50/-
ناول کا فن	مترجم ابوالکلام قاسمی	50/-
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	50/-
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	100/-
جدید شاعری	عبادت بریلوی	200/-
غزل اور مطالعہ غزل	عبادت بریلوی	200/-
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	75/-
نیا افسانہ	وقار عظیم	75/-
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	80/-
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	50/-
انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	100/-
آج کا اردو ادب	ابواللیث صدیقی	70/-
اصناف ادب اردو	قمر رئیس	60/-
باغ و بہار	مقدمہ: قمر الہدیٰ فریدی	50/-
سب رس	مقدمہ: قمر الہدیٰ فریدی	100/-
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی	70/-
امراؤ جان ادا	مقدمہ: تمکین کاظمی	75/-
انارکلی	مقدمہ: ڈاکٹر محمد حسن	50/-

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ